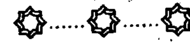
رشتوں کے ریشم



ایک قطعہ!

ستارہ خوبصورت ہے ذرّہ خوبصورت ہے
ابھی یہ فیصلہ ہونے کو ہے، کیا خوبصورت ہے
یہ مانا کہ عشق کی تقدیر میں اُجرت نہیں کوئی
مگر یہ بھی تو دیکھو کام کتنا خوبصورت ہے



فہرست

نمبر شمار		صفحہ
1-	سنہرا پانی	11
2-	اے بسا آرزو	44
3-	جوگن	54
4-	حسب، نسب، کسب	69
5-	مجھے جیت لو	76
6-	رشتوں کے ریشم	105
7-	کاسۂ دل	126
8-	اِک حرف ملامت بھی نہیں	141
9-	تا یا گزر اوقات	160
10-	اک حرفِ تسلی تو	168

11- پھوپھی جان 181

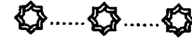
12- تیرے لہجے کی تھکن یاد آئی 191

13- خط جو پوسٹ نہ ہو سکے 228

14- صدف 240

15- یہ صراحی میں پھول نرگس کا 254

16- شناختی علامت 264



پیش لفظ

ماں کی گود میں سنی ہوئی پہلی کہانی

ایک تھی چڑیا ایک تھا چڑا۔ چڑیا لائی چاول کا دانہ چڑا لایا دال کا دانہ دونوں نے مل کر کھچڑی پکائی......

جو ماں اپنے بچے کو پہلی کہانی اتفاق کی سناتی ہے گویا وہ اس کے لاشعور کی تہوں میں اصلی ''اسلام'' بٹھا دیتی ہے...... امن کی چادر اوڑھا دیتی ہے۔

مگر ''اتفاق'' کی کہانی سن کر جو بچہ شعور کی منزل پر قدم رکھتا ہے...... تو خود کو بڑا اکیلا پاتا ہے...... اس کے چہار سو معرکے ہیں...... بڑا شور، بڑی آوازیں۔

ارے...... دیکھو یہ بانٹ کر کھا رہا ہے...... یہ تو بڑا بے وقوف ہے...... بہت سے موقع پرست اس کی جانب بڑھتے ہیں...... ''پہلے آیئے پہلے چھینئے'' کی بنیاد پر...... اپنے حساب سے وہ اسے لوٹ لیتے ہیں خالی کر دیتے ہیں...... مگر نیک نیت ہونے کے باعث فطرت پھر اس کا دامن بھر دیتی ہے......

لٹیرے آتے ہیں...... پھر چھین لیتے ہیں......

دال چاول کی کھچڑی پکتی رہے گی...... چھین کر کھانے والے آتے رہیں گے......

کسی کو لوٹنے سے سرور مل رہا ہے کسی کو لٹنے سے......

لٹنے والے سمندر ہو رہے ہیں لوٹنے والے بنجر......

اے چڑیا اور چڑے کی پہلی کہانی سننے والی معصوم روح......

حوصلہ رکھنا...... تیری پشت پر خدا کا ہاتھ ہے۔ تیری جھولی ہمیشہ بھری رہے گی...... مگر معرکہ تو تجھے کرنا ہوگا...... سمجھوتہ نہیں کرے گا تو۔ بھیڑیے کو بھیڑیا کہے گا اور بلی کو بلی...... جس دن باطل سے خوف کھا گیا...... اپنے اصل سے ہٹ گیا......

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ''غزوے'' کیے...... آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چاہتے تو حجرۂ مبارک میں فرشتے آ کر دشمنوں کے نیست و نابود ہونے کی خبریں

سناتے...... اتنی نیک فطرت ازواجِ مطہراتؓ کے ہوتے ہوئے خود کوزے میں پانی بھر کر پیا۔ اپنے کپڑے دھوئے، اپنے جوتے گانٹھے...... بکری کا دودھ دوہیا...... وہ جس کی انگلی سے معجزے چھوٹتے تھے...... جس کو فرشتے درود و سلام پیش کرنے حاضر ہوتے تھے...... غزوات میں اس کے دندانِ مبارک بھی شہید ہوئے ہیں...... جسم مبارک پر زخم بھی آئے ہیں...... وہ جسے علم کُل دیا گیا جسے ''حقیقت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' کہا گیا۔ جس کو عرش سے سلام پہنچیں...... اس نے ظلم کا مقابلہ کر کے ہمیں کیا سبق دیا کہ میں پیغمبر ہوں آدم کی سب اولاد تو پیغمبر نہیں...... ہاں میں انسان ہوں سب کی طرح آدم کا بیٹا بھی ہوں...... بانٹ کر کھاؤ...... لیکن لٹیرے کا ہاتھ روکو......

''ایک مسلمان کا خون اور مال دوسرے مسلمان پر حرام ہے۔''

جو کسی پر ظلم کرتا ہے وہ ظالم ہے۔

جو ظالم کے سامنے خوفزدہ ہو کر حق بات دل میں رکھتا ہے بولتا نہیں۔

احتجاج نہیں کرتا وہ بھی ظالم ہے اور مشرک بھی کہ اللہ سے زیادہ دوسرے سے ڈر رہا ہے۔

اَللہ لا یحب الظلمین٥

(اللہ ظالموں سے محبت نہیں کرتا)

نیکی کبھی پسپا نہیں ہو سکتی اگر درحقیقت نیکی ہے

ظلم کبھی پھل پھول ہی نہیں سکتا اگر واقعی ظلم ہے

جَاءَ الحَقُّ وَذَهَقَ البَاطِلَ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ ذَهُوقًا٥

(حق آ گیا جھوٹ مٹ گیا بے شک جھوٹ مٹنے ہی کے لیے ہے)

کتاب المبین کی اِکویشنز کبھی اَن بیلنس نہیں ہو سکتی۔ فارمولے تبدیل نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا چڑیا اور چڑے کی کہانی سے اتفاق کا سبق لینے والی معصوم سی روح...... بانٹ کر کھانا مگر چھیننے والے کو ''عقل کُل'' ہونے کا غرور مت بخشنا...... تیری پشت پر وہ ہاتھ ہے۔ جس ہاتھ میں ساری قوت وقدرت ہے......

صرف دعاؤں کے لیے

انتہائی حریص

رفعت سراج

سنہرا پانی

''اماں! شاید میرے عقل داڑھ نکل رہی ہے۔'' اس نے داہنے رخسار پر ہتھیلی جما کر کہا۔

''اے ہاں اب اس لوٹھا کو عقل آئے گی۔'' اماں کے بجائے دادی جان نے جزدان میں کھونپ بھرتے ہوئے ناگواری سے بڑبڑا کر کہا۔

''جس کو باقاعدہ ٹریننگ سے عقل نہ آئی اسے ''داڑھوں'' سے عقل آئے گی؟'' غسل خانے سے نکلتے بھائی میاں نے تولیے سے سر رگڑتے ہوئے تمسخرانہ کہا۔

تب اس کے صبیح ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔

''کسی کے دکھ تکلیف کا احساس ہی نہیں۔ جھاڑیں مارنے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں سب۔ ٹھیک ہے میں کم عقل ہوں۔ اس گھر میں جن کے پاس ''عقلیں'' ہیں وہ کیا ملکہ الزبتھ کے دسترخوان پر کھانا کھاتے ہیں۔ کوئی سپروائزر، کوئی کلرک۔ ہونہہ!''

''اُوئی۔'' اس کی سسکی نکل گئی۔ ہونہہ کہہ کر سر جھٹکا تو تکلیف بڑھ گئی۔

''ڈاکٹر کے پاس چلی جانا۔'' اماں کو ذرا احساس ہوا۔

''رخسانہ کے ساتھ چلی جانا۔'' انھوں نے پھر کہا اور پوچھا۔ ''کیا تکلیف زیادہ ہو رہی ہے؟''

''نہیں، بن رہی ہوں۔ وہ دھپ دھپ کرتی...... اندر چلی گئی۔ آج تکلیف کی وجہ سے اس کی خوش مزاجی بھی غائب تھی۔ وگرنہ بڑی سے بڑی بات پر ہنستی رہتی تھی۔

''اے دلہن! سر پر چڑھنے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ اس سے چھوٹی دو بچوں کی ماں ہے۔ نامراد کو کون پوچھے گا؟ مجھے تو ہول آتا ہے سوچ سوچ کر۔ کسی چیز میں تو طریقہ سلیقہ ہو۔''

''کیا کروں پھر اماں؟ اور بچیوں کو کون سا میں نے مار مار کر سکھایا ہے مگر کتنی سگھڑ ہیں۔ اسے تو خود ہی کوئی شوق نہیں۔'' اماں نے بے چارگی سے جواب دیا۔

''بس کَھی کَھی آتی ہے یا کھانا اور سونا اور دودھ ضرور ملے نواب زادی کو...... اب دیکھو

چوبیس کا سن لگ گیا۔ اس خالی کے چاند میں۔ مجھے تو اچھی طرح یاد ہے۔ سورج سوا نیزے پر تھا۔ پتے سوکھ رہے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کا کوئی منتقم بدلہ لینے کی خاطر دشمن پر بمباری کر رہا تھا۔"

"البتہ بھینسیں دودھ خوب دے رہی تھیں۔" چھوٹے بھائی صاحب یونیورسٹی سے وارد ہو کر دادی جان کی بات میں مخل ہوئے۔

تو بھائی میاں نے بلند قہقہہ لگایا۔ وہ اندر کمرے میں سُلگ کر رہ گئی۔

"ہونہہ! ابھی تو ابا جی کما رہے ہیں۔ دودھ۔ دودھ جیسے انھوں میرے لیے بھینسیں پال رکھی ہیں۔ طعنے ایسے دیتے ہیں۔ جیسے ان کا کھا رہی ہوں۔ جسے دیکھو میرے کھانے پینے پر نظریں لگائے بیٹھا ہے۔ ہزار بار پیوں گی دودھ۔ جلنے والے جلا کریں۔" اس نے خود کو دلاسہ دیا۔



رخسانہ باجی میکے آئی ہوئی تھیں۔ شام کو وہ خوبصورت چادر پہن کر کھڑی ہو گئی۔

"چلو رخسانہ باجی! ڈاکٹر کے پاس۔"

"کیوں بھئی۔ تمھیں کیا ہوا؟ انھوں نے حیرت سے اس کے صحت مند گلابی چہرے کو دیکھا۔

"درد ہو رہا ہے داڑھ میں۔"

"اچھا، میں منّو کو دودھ پلا آؤں۔ سو جائے گا۔" وہ باہر نکل گئیں۔

"اچھا تو ہمارے بھی دن پھرنے والے ہیں۔" چھوٹے بھائی نے اندر داخل ہو کر پوچھا۔ "سنا ہے تمھارے اپر چیمبر میں عقل نامی مہمان آ رہے ہیں؟"

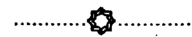
"آپ سے مطلب؟" وہ چڑ کر بولی۔

"ہاں بھئی، ہم سے کیوں مطلب نہیں۔"

"دیکھیں چھوٹے بھائی! یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔ میں ویسے ہی مر رہی ہوں۔"

"ارے، اتنی خوفزدہ مت ہو۔ بڑی اعلیٰ چیز ہوتی ہیں عقل محترمہ۔ مایوسی کی باتیں مت کرو۔ نیک فال ہے تمھارے حق میں۔" وہ اس کے بستر پر لیٹ گئے۔

"سارا گھر دشمن ہے میرا۔" وہ باہر چلی گئی۔



رخسانہ باجی تو معہ سگھڑاپے کے عرصہ ہوا سسرال سدھار چکی تھیں۔ اس سے چھوٹی

نغمانہ بچپن ہی سے ماموں زاد سے منسوب تھی۔ اٹھارویں برس میں لگی ہی تھی کہ شادی کے تقاضے شروع ہو گئے۔

ابا جی پہلے آشیانہ کا بیاہ کرنا چاہتے تھے مگر بقول اماں کسی ڈھنگ کے آدمی نے اس کے لیے سوال ہی نہیں کیا تھا آج تک۔ وہ بھی بڑا عرصہ بھائی کو ٹالتی رہیں مگر کب تک؟

خاندان کی خواتین زیادہ ہی "سگھڑاپا پسند" تھیں اور ابا جی کے خاندان کے افراد ان کے گھر کے ذرا ذرا سے حال سے واقف تھے۔ ایک تو اس کا لاابالی پن، اس پر مستزاد اس کا منہ پھاڑ کر جواب دینا۔ شکل وصورت میں خاندان کی سب ہی لڑکیاں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھیں۔ اس پر اس کے اپنے دماغ بہت اونچے تھے۔ آج تک اسے کوئی بھایا ہی نہیں تھا۔ اپنے قابل ہی نہ لگا تھا۔

انٹر کے بعد پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ مگر چند سال بعد سخت بوریت ہوئی تو بے اندازہ ضد کر کے مقامی کالج میں داخلہ لے لیا۔ اماں اور دادی جان سخت خلاف تھیں اس کے دوبارہ کالج جانے کے، ان کے خیال میں اب اسے گھریلو امور میں طاق ہو جانا چاہیے تھا۔

"ہونہہ، جو طاق ہیں وہ کیا کر رہی ہیں۔" وہ اسی لاابالی پن کا مظاہرہ کرتی۔ "بچے سُلا رہی ہیں بچے کھلا رہی ہیں۔ نہ اپنی نیند سونا نہ اپنی نیند جاگنا۔"

"بس اس نامراد کو تو اس کی نیند لے ڈوبے گی۔" دادی جان کُڑھ کر کہتیں۔ "کالج جانے سے آدھ گھنٹہ پہلے اٹھتی ہے۔ کالج سے آ کر کھانا کھا کر پھر سو جاتی ہے دیکھو تو ذرا، کوئی ذرا سی بچی ہو تو کہا جائے۔ اس کا اُٹھان دیکھو، اس کی حرکتیں دیکھو۔"

تب وہ کھلکھلا اٹھتی۔ "جو چاہے دیکھو بغیر ٹکٹ دیکھو۔" وہ ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر گنگناتی۔

چل ہٹ پرے۔ تو تو اماں باوا کا نام ہی ڈبو کر رہے گی۔" وہ مسکراہٹ دبائے مصنوعی برہمی سے بولتیں۔

نغمی شام کو گھر آئی تو بتایا کہ وہ خصوصی طور سے آئی ہے کل کوئی لڑکے والے اسے دیکھنے آ رہے ہیں۔

"کرتا کیا ہے وہ؟" اس نے بغیر شرمائے پوچھا۔

"یہ تو کل ہی پتہ چلے گا کیونکہ ان لوگوں سے ابھی کھل کر بات نہیں ہوئی۔"

''اچھا تو یہ آدھی باتیں مجھ سے نہ کرو۔ کوئی بات بتایا کرو تو پوری معلومات سے۔'' وہ بولی۔

''ہاں، آپا! اب آپ کی شادی ہو جانی چاہیے۔ خدا کرے کوئی بات بن جائے۔''

''اے نغمی! تو تو اس گھر سے چلی گئی ہے۔ تجھے کیوں بری لگتی ہوں میں؟'' اس نے رسالے پر سے نظریں اٹھائے بغیر سوال کیا۔

''توبہ آپا! اس میں برا لگنے کی کیا بات ہے۔ ساری دنیا کی لڑکیوں کی شادیاں ہوتی ہیں۔ سب مجھ سے پوچھتے ہیں۔ تم بڑی بہن کی شادی کیوں نہیں کرتے؟ کیا عیب ہے؟ کیوں بیٹھی ہے؟''

''تو کیا سب کھڑے ہوئے ہیں جو میرے بیٹھنے پر اعتراض ہے۔'' وہ کھلکھلائی حسب عادت۔

نغمی چپ ہو کر رہ گئی۔



''بس کہہ دیا کوئی ضرورت نہیں سوچ بچار کی صاف ''نہیں'' کہہ دیں۔''

''کیا کمی ہے مجھ میں؟'' وہ تن کر کھڑی ہو گئی۔ رنگت سے ملتا گلابی شلوار سوٹ گلے میں پڑا کالا دوپٹہ بجلی کی طرح کوندتا قامت۔ ڈھیلی ڈھالی چوٹی۔ غصے سے پھڑکتی حسین و مغرور ناک۔

''ہونہہ! اتنی کم تنخواہ۔ اسے کیا اپنی اوقات کی لڑکیاں نہیں ملیں جو وہ لوگ اس دیدہ دلیری سے میرے لیے چلے آئے ہیں۔ ان سے یہ تو کہہ دیتیں شکل دیکھی ہے۔''

''اے تو کیا کوہِ قاف کا شہزادہ بیاہنے کا وعدہ کر گیا ہے؟'' اماں اس کی بات سن چکی تھیں اتنے صفاچٹ انکار پر بڑی طرح کھول رہی تھیں۔

''ویسے اماں! کوہ قاف کے ''دیو'' زیادہ مشہور ہیں اگر وہاں کے شہزادے کے بارے میں سنا ہے تو وہ یہ کہ پتھر کا ہوتا ہے۔'' رخسانہ نے اسے شرارت سے دیکھ کر کہا۔

بھائی میاں! چھوٹے بھائی اور ابا جی کوئی بھی اس رشتے پر راضی نہیں تھا کیونکہ وہ لوگ ذہنی طور پر انتہائی پسماندہ نظر آتے تھے۔ مگر اماں اور دادی زمانے کی باتوں سے کچھ زیادہ ہی خوفزدہ نظر آتی تھیں اور کچھ رضامندی سی تھیں مگر اس کا واضح انکار انھیں مجبور کر گیا۔

رشتے آتے رہے۔ وہ ہر مرتبہ جھنجھلا اٹھتی۔ ''یا اللہ! یہ معمولی قسم کے ملازمین میرے لیے ہی رہ گئے ہیں۔''

''اگر میرے ملک میں ان سب کو حکومت کی طرف سے کار کوٹھیاں دی جاتیں تو ان میں سے کوئی بھی مجھے منظور ہوتا۔''

''تو گویا پیارا سا ایک بنگلہ ہو۔ بنگلے میں گاڑی ہو۔ گاڑی میں میرے سنگ سیاں اناڑی ہو۔'' نغمی ہنسی۔

''ارے چھوڑو، نغمی! دونوں ہی اناڑی ہو گئے۔ تو۔ خدا ہی حافظ ہو گا ان کے گھر کا۔'' چھوٹے بھائی نے چھیڑا۔

''ہم تو ایسے ہی رہیں گے۔ کم عقل، اناڑی، بدھو، بس۔''

وہ صرف اسی مذاق پر چڑتی تھی جب اس کے ذہنی معیار و صلاحیت کو نشانہ بنایا جاتا۔ درحقیقت وہ تھی بھی سادہ و سطحی، خود میں گم، مگن، بے پروا۔



''ابا جی! اتنی ساری لڑکیاں ہیں۔ میں کوئی اکیلی ہوں۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے جانے کی۔ خدا جانے کہاں ماری ماری پھریں گی۔'' اماں نے قطعیت سے کہا۔ بھائی میاں نے اور چھوٹے بھائی نے اعتراض نہیں کیا۔

''ابا جی! رات نہیں ہو گی۔ ہم سورج چھپنے سے پہلے آ جائیں گے۔'' اس نے لجاجت سے کہا۔

''جانے دیں ابا جی! سب لڑکیاں جاتی ہیں۔'' چھوٹے بھائی نے سفارش کی۔

''اے ہاں۔ اور ڈبو دو۔'' دادی جان بڑبڑائیں۔

آخر کار اجازت مل گئی۔

اس نے میرون سادہ بڑا فِٹ سا سوٹ پہنا۔ لپ اسٹک لگائی، کاجل ڈالا۔ بے حد خوشی سے اس نے اہتمام کیا۔ بی۔ اے فائنل کی تمام اسٹوڈنٹ اس پکنک میں شامل تھیں۔

سارا دن انھوں نے سمندر کے کنارے ہنستے کھیلتے گزارا۔ تب اس نے جانے سے آدھ گھنٹے پیشتر ساحرہ کا ہاتھ تھاما اور ننگے پاؤں دُور تک نکل گئی۔ کبھی کبھار وہ لہرا کر آنے والی لہر سے پیشتر پانی میں جا کھڑی ہوتی، لہریں اسے چھو کر واپس پلٹ جاتیں۔ تب وہ مسرت انگیز ہنسی ہنستی۔ ساحرہ کو پانی سے بہت خوف آتا تھا۔ تب جھاگ جھاگ پاگلوں کی طرح ٹکراتی لہر...... اس کے پیروں سے چھو کر گئی تو اس نے ساحرہ کو پکارا۔

"ساحرہ! آؤ ناں...... بڑا مزا......" اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ وہ ساحرہ کی آنکھوں سے اُوجھل تھی۔ ساحرہ کے حلق سے کئی خوف زدہ چیخیں اُبل پڑیں۔ وہ پاگلوں کی طرح پانی کی سمت دوڑی۔ پانی سے ازحد خوف زدہ ہونے والی لڑکی۔ سہیلی کی خاطر پاگلوں کے انداز میں پانی میں اترنے لگی۔ تب کسی نے اسے بازو سے پکڑ کر خشکی کی جانب دھکا دیا۔ اور ساحرہ کے کانوں میں کسی وزنی چیز کے پانی میں گرنے کی آواز آئی۔ وہ بری طرح چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ دوسرے لوگ ان سے بہت دور تھے۔ وہ دونوں تو خود اساتذہ کی آنکھ بچا کر نسبتاً خاموش گوشے میں آئی تھیں۔

تب ساحرہ نے آنسوؤں کی دُھند میں دیکھا۔ انتہائی خوبصورت جسم کا ایک شخص آشیانہ کو بازوؤں میں اٹھائے باہر آیا۔ وہ سرتاپا شرابور تھا۔ وہ دیوانہ وار آشیانہ کی جانب لپکی جس کے چہرے پر موت کا سا سکوت تھا۔

"شانو......! شانو......! اوہ میرے خدا!......" دوسرے لمحے وہ خود بھی بے ہوش تھی۔

تب اس شخص نے انتہائی بے چارگی سے دو بیہوش خواتین کو دیکھا۔ پھر ادھر دیکھنے لگا۔ سامنے سے طالبات اساتذہ کے ہمراہ ان کی تلاش میں آ رہی تھیں۔ انھیں اس طرح ریت پر پڑا دیکھ کر تمام اساتذہ اور لڑکیوں کے چہرے فق ہو گئے۔

تب اس اجنبی نے تمام تفصیل سے مطلع کیا۔ میڈم اس کی گاڑی میں آشیانہ اور ساحرہ کو لے کر قریبی کلینک میں چلی گئیں۔ باقی گروپ بھی بجھا بجھا سا واپس ہو لیا۔



"اس لیے ہی منع کر رہی تھی۔ موت کے منہ سے واپس آئی ہے۔ جو بچے ہٹ دھرمی دکھاتے ہیں، یہی ہوتا ہے ان کے ساتھ۔" اماں اس کی حالت دیکھ کر تڑپ رہی تھیں مگر بظاہر پند و نصائح کے دفتر کھولے بیٹھی تھیں۔

"خدا جانے کون فرشتہ خصلت آدمی تھا۔ خدا سلامت رکھے اسے بھی۔" دادی جان نے دعا دی۔

"تیرنا آتا ہوگا کود گیا۔ اس میں فرشتہ خصلت ہونے کی کیا بات ہے؟" اس نے کراہ کراہ کر احسان فراموش کی قبر پر لات ماری۔

"تجھے تو اس کا احسان مند ہونا چاہیے۔ اس حالت میں بھی دماغ میں اسی طرح

کلف لگا ہوا ہے۔ نہ کودتا وہ تجھے بچانے کو۔" اماں کچھ زیادہ ہی احسان مند ہو رہی تھیں۔

"مر جاتی تو آپ لوگوں کا بوجھ ہلکا ہو جاتا۔" اس نے کراہ کر کروٹ بدلی۔

اماں اس کی ہائے پر تڑپ کر رہ گئیں۔ اس لیے کچھ بولیں نہیں۔

"دیکھو...... بالکل جھٹک کر رہ گئی ہو۔ آج سے دودھ کے دو گلاس پینا۔" بھائی میاں نے کہا تو وہ مسکرا دی۔



ساحرہ اور وہ تو عرصہ تک سوچ سوچ کر کانپتی رہیں۔

"بڑا بہادر آدمی تھا۔"

"آدمی بھی بہادر نہ ہو تو گدھے بہادر ہوں گے۔ اس کو تیرنا آتا ہوگا لہٰذا جان بچانا اس کا فرض تھا۔"

"تو تو دو دن بعد ہوش میں آئی تھی۔ میں نے تو اس کا بہت بہت شکریہ ادا کیا تھا۔"

"ماشاء اللہ تیرا تو اُٹھان بھی غضب کا ہے۔ کسی دُبلے پتلے آدمی کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ تو پہلوانوں کو بھی مات دے گیا ہے۔ بے ہوش آدمی کا وزن تو ویسے بھی بڑھ جاتا ہے۔" ساحرہ نے مزید مدح سرائی کی۔

"مگر کچھ مغرور سا تھا۔ ہم نے اس کا اتنا شکریہ ادا کیا اور اس نے جاتے ہوئے صرف ایک بات کی وہ بھی ڈاکٹر سے۔"

"ہوش جلد آ جائے گا نا؟" یوں ہی کہہ دیتا یہ میرا فرض تھا۔ کوئی بات نہیں بابا۔ کچھ نہیں بولا۔" ساحرہ نے ازحد حیرانی سے بتایا۔

"ویسے بھئی، غرور آ ہی جاتا ہے۔ شکل بھی خوبصورت، باکسروں کی طرح جسم، اتنی عالی شان گاڑی، کوئی لینڈ لارڈ ہی لگتا تھا۔"

"اچھا بابا، بس کرو۔ بہت ہو گئیں تعریفیں۔" اس نے منہ بنا کر ٹوکا۔



"اماں! گرمیاں آ گئی ہیں۔ میں ایک دو جوڑے لاؤں گی لان کے۔"

"کس کے ساتھ جاؤ گی؟"

"ساحرہ اور میں۔"

تب اماں نے کچھ رقم اسے دے دی۔ جب سے یہ حادثہ ہوا تھا۔ اماں تو بہت ہی سہم گئی تھیں۔ انھیں یہ احساس ہوتا کہ وہ اسے ہر وقت بددعا دیتی رہتی ہیں۔ اب اللہ ایک ہی کو سب کچھ نہیں دے دیتا۔ سب لڑکیوں میں حسن اور قابل رشک صحت دے کر اسے ممتاز بنا دیا تھا۔ کچھ اس نے اپنی جمع پونجی نکالی اور دونوں بازار چلی گئیں۔ کپڑا، لپ اسٹک کے نئے شیڈز، رومال اور خوبصورت آویزے۔ وہ بہت مگن رہی۔ شام بھی کافی در آئی تھی۔

دونوں اسٹاپ پر آ گئیں۔ ساحرہ کی مطلوبہ بس آ گئی۔ وہ چلی گئی۔ وہ دو قدم آگے بڑھی تو اس کی چپل ٹوٹ گئی۔ ''اوہ میرے خدا! یہاں تو کوئی موچی بھی نظر نہیں آ رہا۔ عام سی سادہ چپل تھی جو وہ گھر میں بھی استعمال کرتی رہی تھی اور پھر شرمندگی بھی بہت ہو رہی تھی۔ وہ بے بسی سے آتے جاتے ٹریفک پر نظر ڈالنے لگی۔ اکیلے رکشا میں جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

تب اس نے سفید نئے ماڈل کی گاڑی کو دیکھا جسے ایک بہت پُروقار خاتون ڈرائیو کر رہی تھیں۔ اس نے ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا۔

''سنیں، میری چپل ٹوٹ گئی ہے۔ چلتے ہوئے بڑی شرمندگی ہو رہی ہے۔ آپ کی بہت نوازش ہوگی اگر آپ۔''

''آؤ!'' انھوں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ پیکٹوں سمیت جلدی سے اندر بیٹھ گئی اور گھر کا پتہ بتا دیا۔

''آپ کو گاڑی چلاتے ہوئے ڈر نہیں لگتا؟'' اس نے سادگی سے پوچھا۔

''نہیں بھئی، تم سے بھی چھوٹی تھی تب سے چلا رہی ہوں۔ اب کیسا ڈر؟'' وہ مسکرائیں۔

''اچھا جب گاڑی سیدھی جا رہی ہوتی ہے تو اسٹیئرنگ کو دائیں بائیں حرکت کیوں دیتے رہتے ہیں؟''

''اس لیے کہ گاڑی بیلنس میں رہے۔'' انھوں نے اس کے چہرے پر نگاہ ڈال کر کہا۔

''اچھا!'' اس نے بڑے مگن سے انداز میں کہا۔ سفید کالج کے یونیفارم میں سفید انتہائی شفاف دوپٹے میں اس کا گلابی چہرہ بے حد سادہ تھا جس پر بھولپن کی چھاپ بھی گہری تھی۔ وہ بہت سنجیدہ سی تھی۔ تب اس خاتون نے پوچھا۔

''تم اسی طرح سنجیدہ رہتی ہو یا ہنستی بھی ہو؟''

''بہت ہنستی ہوں میں تو۔ گھر میں بہت ڈانٹ پڑتی ہے۔'' وہ کھوئی کھوئی سی ہنس پڑی۔

وہ انھیں دروازے تک لے آئی تھی۔

''آپ کا بے حد شکریہ۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کا قیمتی وقت ضائع کیا۔'' وہ انتہائی سلیقے سے کہہ رہی تھی۔ ''اگر آپ مناسب سمجھیں تو اندر آ جائیں، میں آپ کو اپنے گھر کی دو 'جلالی' خواتین سے ملواؤں۔'' وہ شگفتگی سے ہنسی تو وہ خاتون...... بے ساختہ گاڑی سے باہر آ گئیں۔

چاول پھٹکتی اماں حیران ہو گئیں۔ جب اس کے ہمراہ ایک انتہائی معزز خاتون کو آتے دیکھا۔

''اماں! یہ میری ان محسن سے بڑی محسن ہیں جنھوں نے مجھے سمندر سے نکالا تھا۔ دیکھیں نا، اگر وہ نہ بچاتے تو میں مر جاتی۔ کہانی ہی ختم ہو جاتی۔ مگر ایک پاؤں میں چپل نہ ہونے سے...... سارے راستے شرمندگی کی موت سے کئی بار مرتی۔ یعنی تمام راستے مرگ و جنم کا سلسلہ چلتا رہتا۔''

''ایک دم باؤلی ہے۔ یہ کوئی کسی سے ملوانے کا طریقہ ہے۔ آئیں آپ یہاں بیٹھیں۔'' اس نے چھوٹے بھائی کی رائیٹنگ ٹیبل کی چیئر انھیں پیش کی۔ اماں کی ڈانٹ ادھوری رہ گئی۔

دادی جان بھی آ گئیں۔ پوری صورتِ حال سے واقف ہو کر اماں بے زاری سے بولیں۔

''آندھی، طوفان کی طرح ہے اس کا چلنا پھرنا، انسان گھر سے دیکھ کر جائے اپنی چیزیں۔''

''یہ تو بہن ہے ہی بے عقل۔'' اماں نے بے چارگی سے بتایا۔

وہ خاتون جو بڑی دلچسپی سے مسکرا رہی تھیں ہنس پڑیں۔ ''ارے نہیں، بڑی پیاری بیٹی ہے آپ کی۔ اور بھی بچیاں ہیں؟''

''ایک اس سے بڑی ہے اور ایک اس سے چھوٹی...... دونوں ہی بیاہی ہوئی ہیں۔ اپنے اپنے گھر خوش ہیں۔ دو لڑکے ہیں۔ دونوں لڑکیوں سے بڑے ہیں۔ ایک کو تو پڑھنے کا ہی بہت شوق ہے۔ ڈبل ایم۔ اے کر رہا ہے۔ کہتا ہے اپنا اخبار نکالوں گا۔ بڑا بھی نیا نیا ملازم ہوا ہے۔'' اماں نے تفصیلی تعارف کرایا۔

''اس کی شادی کیوں نہیں کی پہلے؟ چھوٹی کی شادی۔''

''اصل میں اُسے میرے بھائی نے بچپن میں مانگ لیا تھا۔ ان کی چیز تھی، اب لیتے کہ تب لیتے۔''

ان خاتون کو یہ کھلا ڈھلا بے ریا ماحول بے حد بھایا۔ جب وہ جانے لگیں تو وہ بے انتہا محبت سے ملی۔ اماں نے انھیں دوبارہ آنے کا کہا اور شکریہ ادا کیا۔

''اور بیٹی! ہنستی رہا کرو۔ اچھی لگتی ہو۔'' انھوں نے اس کا رخسار تھپتھپایا۔

''بھلی عورت ہے۔ کتنی امیر زادی ہے مگر ذرا غرور نہیں، ذرا نشہ نہیں دولت کا۔'' دادی جان نے تعریف کی۔ ''اپنے بچوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ خیر، کوئی بات نہیں۔''

اماں نے چاول میں دوبارہ ہاتھ مارنے شروع کیے۔ ''تھی کوئی بھلی مانس۔''



وہ تو حسب عادت بھول بھال گئی۔

آخری پیپر دے کر وہ گھر پہنچی تو پتہ چلا کہ وہی گاڑی والی خاتون آئی تھیں۔

''کیوں آئی تھیں؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔

''کیوں پابندی ہے کیا؟ محبت کی عورت ہے گزری ہوگی ادھر سے چلی آئی۔'' اماں نے سوال و وضاحت ساتھ ساتھ کی۔

''اچھا! انھیں یاد رہ گیا مجھے تو ذرا یاد نہیں۔'' اس نے لاپرواہی سے دوپٹہ سنبھال کر کہا۔

''کیوں تم کیا خاص پیمانہ ہو کہ ہر شخص کی پیائش تمھارے حساب سے ہوگی۔'' چھوٹے بھائی نے اسے چھیڑا۔

''تم تو دودھ کی دعا کیا کرو۔ بہت مشہور ہو رہا ہے آج کل کہ لوگ ''پانی میں دودھ'' ملا کر بیچ رہے ہیں۔'' وہ ہنسے۔

''دیکھ رہی ہیں اماں! میرے ایک گلاس دودھ کا اس گھر پر کتنا بوجھ ہے۔''

''اور کیا؟ چل تجھے بھی پتہ چل گیا کہ بیٹی ایک بوجھ ہوتی ہے۔'' دادی جان نے صرف بوجھ سن کر ہی گفتگو کا رخ حسب منشاء کر لیا۔

''اس کا تو کچھ زیادہ ہی بوجھ ہو رہا ہے۔ شکر کرتے ہیں ڈولیوں کے زمانے گئے۔ بے چارے کہار تو زمین بوس ہو جاتے جان بنانے سے زیادہ گھر کی فکر کرو۔''

''اماں بہت ہیں فکر کرنے کو۔'' وہ ہنسی، گویا اماں کو چھیڑا۔

''اے دلہن۔ کچھ کرو بھاگ دوڑ۔ کون پوچھے گا عمر نکل گئی اگر؟'' دادی جان نے دیرینہ خدشہ ظاہر کیا۔

''اے اماں۔ اب تو خدا پر چھوڑ بیٹھی ہوں۔'' اماں نے ساس کو نہایت افسردگی سے جواب دیا۔

''بات تو ساری نصیبوں کی ہے۔ ایک سے ایک کم شکل مہارانیاں ہیں۔ اس موئی میں تو اللہ نے کوئی ظاہری نقص بھی نہیں دیا۔ دونوں سے اچھی ہے۔ خدا اچھا ہی کرے گا۔''

''سلیقہ ہوتا تو کب کی کوئی لے جاتا۔ تم نے بھی سختی نہیں کی۔'' ساس نے بہو کو جتایا۔

''ہاں، بس اماں پھانسی دینے کی کسر چھوڑ دی ہے۔'' انھوں نے ساس کی بات سے اکتا کر جواب دیا اور باہر پودوں میں پانی ڈالتی شانو کو آواز دینے لگیں۔



آج فراغت سے اُکتا کر وہ چھتیں صاف کرنے پر کمر باندھ بیٹھی تھی۔ پُرانا سا جوڑا پہن کر سر پر پرانا مفلر لپیٹ کر بڑے انہماک سے کام میں مشغول تھی۔ پورے گھر میں اسٹول گردش کر رہا تھا۔ لپک ادھر، جھپک ادھر۔ دادی جان نہال ہو رہی تھیں۔ کئی بار سروے کر چکی تھیں اور سروے رپورٹ باورچی خانے میں بیٹھی اس کی بے خبر ماں کو پیش کر چکی تھیں۔

''کیا آج کوئی خاص مہمان آ رہے ہیں؟'' چھوٹے بھائی نے حسب عادت مذاق کیا۔

''کیوں کیا گھر صرف مہمانوں کے لیے صاف کیے جاتے ہیں؟'' اس نے چھت پر ڈنڈے کو گردش دیتے ہوئے الٹا جواب دیا۔

''میں نے ''خاص'' کہا ہے۔''

''ایسی کوئی نیک اطلاع نہیں۔'' وہ شرارت سے ہنس پڑی۔

''اے۔ عثمان...... دیکھ تو سہی بچی نے سارا گھر ہی تو چمکا دیا۔'' دادی جان خوشی سے پوتے سے مخاطب ہوئیں۔

''لگتا ہے دادی جان۔ عقل داڑھ پوری نکل چکی ہے۔'' وہ شرارت سے بولے۔

''چھوٹے بھائی دیکھیں ہر وقت مذاق نہیں۔'' اب اسے تاؤ آ گیا۔

''اے چل چھوڑ۔ ویسے ہی تھک رہی ہے۔'' دادی جان کا مارے لاڈ کے بس نہیں چل رہا تھا۔ اسے گود میں لے کر پھرتیں۔

''آج اسے دودھ کے دو گلاس پلایئے گا۔'' بھائی بھی اسے اس طرح مصروف دیکھ کر خوش تھے مگر بظاہر چھیڑ رہے تھے۔

''چھوٹے بھائی! آپ جائیں یہاں سے۔'' وہ جھلا کر چیخی۔

وہ برآمدے کے ستونوں پر کپڑا مار رہی تھی کہ گھنٹی بجی۔ وہ اپنے ڈنڈے سمیت دروازے کی سمت لپکی۔

''اوہ!'' اس نے حیرانی سے آنکھیں پھیلائیں۔

''آپ؟ السلام علیکم۔''

''ہاں بیٹی! وعلیکم السلام۔'' انھوں نے شفقت سے جواب دے کر اس کے دلچسپ حلیے پر نظریں دوڑائیں۔ وہ خفت آمیز انداز میں مسکرادی اور انھیں لیے ہوئے اندر چلی آئی۔

''دیکھیں اماں! کون آیا ہے؟'' اماں باہر آئیں اور بڑی گرم جوشی سے ملیں۔

''کیسے تکلیف کی؟ آیئے اندر آجایئے۔'' وہ پُر تپاک انداز میں بولیں۔

''اب تو یہ آپ پر منحصر ہے کتنی تکلیف مزید دیں گی۔'' وہ مسکرائیں۔

اور پھر انھوں نے وہ بات کہی کہ کسی کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ رہا۔ دادی جان نے گلاس بھر پانی فوری پیا۔

''میرا سسرالی سلسلہ بے حد مختصر ہے۔ میکہ بھی چھوٹا ہے جو تقریباً پچھلے پندرہ سال سے امریکہ میں مقیم ہے۔ میں چھ ماہ پیشتر اپنے بڑے بیٹے کے پاس آئی تھی۔ سوچتی ہوں اس کا گھر بسا دوں۔ وہ دو سال پہلے پاکستان مستقل آچکا ہے۔ ہیرا تو نہیں کہوں گی۔ عام انسان ہے۔'' ان کی آواز دھیمی ہوگئی۔ میں خود ہی اپنے میکے اور سسرال میں بڑی ہوں۔ جب جواب لینے آؤں گی تو بہن اور بہنوئی کو بھی لاؤں گی۔ آپ اپنے شوہر سے مشورہ کیجیے۔ سوچ سمجھ کر جواب دیں میں جانتی ہوں میرے بیٹے کے لیے کیسی لڑکی موزوں رہے گی۔ اور آج بلا تکلف میں آپ کے دولت کدے پر حاضر ہوئی۔'' اس انکسار پر دونوں ساس بہو سو جان سے مرمٹیں۔

''آپ یہاں نہیں رہیں گی؟'' اماں نے جانے کیوں سوال کر دیا۔

''میرے دو بچے وہاں زیر تعلیم ہیں۔ ایک بیٹا وہاں پر کاروبار کرتا ہے۔ بچوں کی وجہ سے فی الحال وہیں ہوں۔ شوہر کا دو برس پہلے انتقال ہوگیا۔'' انھوں نے افسردگی سے بتایا۔

اپنے خاندان سے متعلق انھوں نے مستند معلومات بہم پہنچائیں۔ جاتے ہوئے مزید کہا کہ آپ اپنا خوب اطمینان کر لیجیے۔

اور اس رات وہ پہلی مرتبہ گم صم سی رہی۔ خدا جانے کون ہے؟ کیسا ہے؟ بالکل اجنبی

لوگ۔ اس کا دل لرز رہا تھا۔ سب تو خوش ہوں گے۔ ''ہاں'' میں جواب دیں گے سب سے بڑا بوجھ جو ہوں میں۔

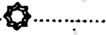
تمام کوائف اکٹھے کر کے غور وخوض کیا گیا۔ ابا اسے معہ بیٹوں اور بھائیوں کے دیکھ آئے تھے۔ چھوٹے بھائی نے اسے بتایا۔ ''تیس اکتیس برس کا لگتا ہے۔ بے حد سنجیدہ اور کم گو مگر بہت شاندار شخصیت کا مالک۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا یہ پیغام اس کے لیے آیا ہے۔'' انھوں نے کنکھیوں سے مسکرا کر اسے دیکھا۔ اس کا اپنا کاروں کا کاروبار تھا۔ وہ لوگ اس کے شوروم میں مل کر آئے تھے۔

ابا جی نے دبے دبے الفاظ میں اماں کو سمجھایا۔ ''سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو۔ بالکل جوڑ نہیں ان کا ہمارا۔''

''لوگوں کی بیٹیاں تو بادشاہوں کے ہاں بیاہ دی جاتی ہیں۔ یہ تو قسمت کے کھیل ہیں۔ اللہ جسے چاہے نواز دے۔ ترازو سے تل کر آسمان سے نوٹ تو نہیں آتے اس کے پاس۔ محنت کرتا ہے کماتا ہے۔'' یہ اماں کی دلیل تھی۔ پیسہ زیادہ نہیں تھا تو کیا ہوا پشتیں تو معزز تھیں۔ بڑی خود اعتماد تھیں وہ۔ اسے کہتے ہیں نیت صاف منزل آسان۔ اگلے دن رخسانہ آئیں تو کہنے لگیں۔

''اب تو چاہے روز گاڑی بدل لینا۔'' وہ مسکرائیں۔

''ارے نہیں، ایسا نہ کر دینا۔ دیکھنے والے کار ڈیلر کے بجائے موٹر مکینک کی بیوی سمجھنے لگیں گے۔'' بھائی میاں نے برجستہ کہا۔ تو سب بے تحاشا ہنسنے لگے۔ پل کی پل میں خوشیاں اتر آئی تھیں۔



کچھ زیادہ ہنگامہ نہیں ہوا جب وہ نکاح سے پہلے خاموش بیٹھی تھی۔ بارات آچکی تھی۔ تب اس کی ساس ایک خوبصورت سی لڑکی اور نکھرے نکھرے نوجوان کے ساتھ اس کے پاس چلی آئیں۔

''یہ ہیں بیٹا! تمہاری بھابی...... آشیانہ۔''

زرد سوٹ میں نہائی دھوئی کورے کاغذ کی طرح اُجلی اور صاف بھابی جو اپنی سادگی سمیت دونوں کو بے حد کیوٹ لگی تھی۔

''بھیا نے دیکھا ہے ماما؟'' لڑکی نے پوچھا۔

''ہوں۔تصویر دکھائی تھی۔'' انھوں نے جواب دیا۔

''یہ تمہاری نند ہے بیٹا! فرحت افزا اور یہ دیور...... میرا نمبر تین بیٹا عظیم۔تمہارا دوسرا دیور جو اِن دونوں سے بڑا ہے اعظم، وہ نہیں آسکا۔ اس نے تمھارے لیے بڑے پیارے پیارے تحفے بھجوائے ہیں۔'' وہ سر جھکائے ان کی باتیں سنتی رہی۔

بچے قطعی یورپین طرز کے نہیں تھے۔مشرقی تہذیب کی چھاپ ان پر نمایاں تھی۔ جو شاید ان کی ماں کا کمال تھا۔اس کی سہیلیاں آ گئی تھیں۔ساحرہ اس کی عزیز سہیلی کا بھی آج کے دن نکاح تھا۔اس کا شوہر باہر جا رہا تھا۔ایمرجنسی تقریب تھی آج اس کے ہاں بھی۔اسے بہت افسوس ہوا تھا اس کے نہ آنے کا۔

جب دلہن بنی آشیانہ کو فرحت افزا نے دیکھا تو مبہوت ہو کر رہ گئی۔سرخ لباس سرخ نگینے جڑا سیٹ۔صرف سرخ گلاب کے ہار اور گہنے۔رُوپ بھی کسی کسی کو پوچھتا ہے اور فرحت افزا نے کھڑے کھڑے اس کے پوز کیمرے میں محفوظ کر لیے۔

وہ آج بے تحاشا روئی تھی۔ایسے رونے کا کبھی تصور نہیں تھا۔خود بخود دل بھر آ رہا تھا اور آنکھیں برس رہی تھیں۔تڑپ تڑپ کر، پھوٹ پھوٹ کر رونے کو دل چاہ رہا تھا۔

اور پھر اُسے سہارا دے کر سیاہ ڈنر سوٹ میں ملبوس سرخ گلابوں میں چھپے ڈیسنٹ سے انسان کے پہلو میں بٹھا دیا گیا۔اس کے اپنے وجود سے اٹھتی خوشبوؤں پر اس شخص کی مہک حاوی ہو گئی۔دائیں طرف معظم (اس کا شوہر) اور بائیں جانب اس کی ساس اور فرحت تھیں۔

اسکا پہلو محسوس کر کے اس نے سمٹنا چاہا مگر یہ ممکن نہ تھا۔اس پہلو، اس شانے کی اس کے ماں باپ اور اسکے دل نے بڑی بھاری قیمت ادا کی تھی۔

سسرال میں عجب تماشا تھا۔گھنٹوں اس کا گھیراؤ رہا۔کوئی مووی بنا رہا تھا۔کوئی جامد تصویر۔کیمرے۔فلش۔ایک چکا چوند تھی۔اس کے ہمراہ رخسانہ باجی تھیں۔وہ بھی بوکھلا کر رہ گئیں۔جب رات دو بجے اس کے رشتے کی جٹھانی اسے کمرے میں لائیں تو بڑا الٹا حساب تھا۔

معظم بیڈ پر نیم دراز کسی کتاب میں مصروف تھے۔

''ارے بھئی، آپ پہلے سے موجود ہیں یہاں؟'' بھابی ہنسیں۔

''بہت شور تھا باہر، کچھ تھک بھی گیا ہوں۔''

من جھنجھوڑتی بھاری سی آواز تھی۔اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

معظم نے اسے دیکھا۔تصویر سے کہیں زیادہ حسین تھی۔ بھابی کی موجودگی کا احساس تھا۔اس لیے فوری نظروں کا رخ بدل دیا۔

وہ اسے بیڈ پر ٹکا کر واپس پلٹ گئیں۔

اس کی عجیب کیفیت تھی۔حرکت کرتے ہوئے ایک شرمگیں سا احساس دامن گیر تھا۔

''ایزی ڈارلنگ۔'' وہ پردے برابر کرتے ہوئے بولے۔

وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔

تب گھونگھٹ الٹ دیا گیا اور معظم ٹھٹک گئے۔ایک بھیگا وجود...... ان کے بازوؤں میں جھولنے لگا۔وہی...... بالکل وہی۔وہ پہچان چکے تھے۔اس قدر مناسب لڑکیاں بہت کم ہوتی ہیں جو حسین بھی ہوں اور ان کا سراپا بھی ان کی خوبصورتی کا ہمسر ہو۔

انھوں نے اسے ٹھیک سے بیٹھنے کو کہا۔مگر وہ اسی طرح ساکت رہی۔انھوں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔تو اس نے اپنے وجود کا ہر حصہ چرا لیا۔

انھوں نے اس سے زیادہ باتیں نہیں کیں۔پھر بھی جو کچھ کہا اسے اچھا لگا۔

اور پھر جب وہ دنیا کا مکروہ ترین مشروب پی کر آئے تو اس کا دم الٹنے لگا۔

اور انہی گھٹتی ہوئی سانسوں کے دوران اس پر حیرت ناک انکشاف ہوا کہ یہ وہی محسن ہے جو سمندر کی لہروں سے لڑ کر اسے جیت لایا تھا۔

پھر انھوں نے بہت کچھ کہا۔مگر وہ دم سادھے رہی ایک ٹک ساکت۔

اور جب وہ بے خبر سو گئے تو آہستگی سے اٹھی۔اپنا دوپٹہ تہہ کیا۔اس کا ذہن گہری سوچوں میں گم تھا پھر اس نے سنگھار میز کے مقابل کھڑے ہو کر اپنا ایک ایک زیور اتارا۔اس کے ناک اور کان سخت دکھ رہے تھے۔گلے پر نیکلس، مالا اور ہار کے نشان پڑ گئے تھے۔اس نے اپنے بکھرے بالوں کو سمیٹا۔اپنا چہرہ آئینے میں دیکھا۔عجب دیومالائی حسن تھا۔اس نے آنکھوں میں جھانکا تھکی تھکی سی آنکھیں، خوابیدہ آنکھیں۔آرزو شکستہ آنکھیں۔تب وہ ہتھیلی میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔کیوں؟ وہ خود بھی نہ جان سکی۔

.... ✡ ....

جب صبح اس کی آنکھ کھلی تو رات کی تھکی ماندی خواتین ہشاش بشاش تھیں۔کوئی پردے سرکا رہی تھی کوئی اس کا زیور ڈبوں میں لگا رہی تھی۔

"ارے بھئی۔ دلہن بیگم اتنی لاپرواہی اچھی نہیں ہوتی۔ بے حد قیمتی زیورات ہیں۔ یہ دیکھو اس لاکر میں رکھ رہی ہوں۔ اٹھا کر اپنی مرضی سے کہیں رکھ دینا۔"

"اگر اور نیند آرہی ہو تو ہم چلے جاتے ہیں۔" انھوں نے اسے بے خبر انداز میں بیٹھا دیکھ کر کہا۔

خوبصورت جوڑا کھل جانے پر اس کے ریشمی بال پاگلوں کی طرح ادھر ادھر دوڑ پڑے تھے۔ مٹے مٹے میک اپ کے نشان

ارے بھئی۔ تم نے لباس بھی تبدیل نہیں کیا تھا۔ باتھ روم میں تمہارا لباس موجود تھا۔" بھابی نے کہا۔

"اب پہن لوں گی۔" اس نے لب کشائی کی۔

ایک زوردار قہقہہ پڑا۔

"بھئی وہ شب خوابی کا لباس ہے۔ ویسے کا شاہانہ جوڑا نہیں۔ واقعی بہت نیند آرہی ہے۔ مگر یہ روزانہ کی مجبوری ہے۔ اب نیندیں تمہاری نہیں رانی! ساجن کی ہیں۔ چلو اٹھو۔ غسل سے فارغ ہو جاؤ۔ تیار ہو جاؤ اچھی طرح۔ ناشتے پر تمہارا انتظار ہے۔"

بے حد خوبصورت پیازی کلر شلوار سوٹ منتخب کر کے وہ اسے دے گئیں۔

ان کے جانے کے بعد کمرے میں سکوت سا چھا گیا۔

وہ نہا دھو کر بالوں کو برش کر رہی تھی، ہلکے سے میک اپ کا بھی نشان نہیں تھا۔ تب ہی اس کی ساس آگئیں۔ اس نے آداب کرنے سے پہلے انھیں بغور دیکھا۔ وہ سٹپٹا سی گئیں۔ تب اس نے بغیر کسی جذبے کے انھیں آداب کہا۔

"خوش رہو۔ چلو دلہن! تمہارا انتظار ہو رہا ہے ناشتہ پر۔" اسی وقت فرحت افزا بھی داخل ہوئی۔

"ماما! لے بھی آئیں بھابی جان کو۔ اوہ، پیاری بھابی لوگ میک اپ کر کے حسین لگتے ہیں۔ اور آپ بغیر میک اَپ کے۔" اس نے پرستائش نظروں سے اسے دیکھا۔

ڈرائنگ روم کی وسیع وعریض ٹیبل پر کافی لوگ تھے۔ سب ہی ان لوگوں کے قریبی رشتہ دار تھے۔ معظم نے اسے دیکھا اور مسکرائے۔

اس نے اپنی مسکراہٹ ہونٹوں میں جذب کر لی۔

ولیمہ شام کا تھا۔ دوپہر گیارہ بجے وہ گھر چلی آئی۔ فرحت اس کے ہمراہ تھی۔ باقی لوگ واپس چلے گئے تھے۔ اسے چھوڑ کر تب ہی ساحرہ آگئی۔ کیوٹ سی فرحت افزا اسے بے حد پسند آئی۔ فرحت افزاء کی موجودگی کے سبب وہ سکھی ہے۔ بے تکلفانہ گفتگو تو نہ کر سکی، پھر بھی کوڈ ورڈز میں باتیں کر ہی گئی۔ اس نے جان بوجھ کر رات کا انکشاف نہیں دُہرایا کہ دیکھتے ہیں ساحرہ، معظم کو پہچانتی ہے یا نہیں۔

رخسانہ باجی اور نغمانہ بھی وہیں آگئیں۔

"آپا شانو! کوئی زیور تو پہن لینا تھا۔" نغمی نے ٹوکا۔

"زیور ہی زیور ہیں بھابی کے پاس۔ ویسے یہ بغیر زیور کے زیادہ پیاری لگتی ہیں۔" فرحت نے پیار سے کہا۔

"پتہ ہے بھابی! ساجد بھائی کی دلہن رات کیا کہہ رہی تھیں؟" سب نے سوالیہ انداز میں فرحت کو دیکھا۔

"کیا کہہ رہی تھیں بھیا سے کہ دلہن کا نام آشیانہ ہے۔ تم اپنا نام "آباد" رکھ لو۔ مسز آشیانہ آباد خوب سوٹ کرے گا۔" فرحت کی بات سن کر سب بے ساختہ ہنس دیے۔

رخسانہ نغمانہ کو اس کی قسمت پر رشک آرہا تھا۔ کتنا دولت مند گھرانہ تھا مگر غرور کسی میں نہ تھا اور پھر جب ساحرہ نے معظم کو دیکھا۔ تو بے ساختہ اُچھل پڑی۔

"ارے شانو! جو سامنے براؤن سوٹ میں ہے وہی معظم ہیں نا...... یہ تو وہی ہیں جنھوں نے تمھیں پانی سے نکالا تھا۔" دلہن بنی آشیانہ نے دھیرے سے نظریں اٹھا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"بھئی، اس وقت تو بڑے مغرور سے لگے تھے۔ فوراً ہی کلینک سے چلے گئے تھے۔ ویسے کیسے ہیں؟"

"ٹھیک ہیں۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

"ہونہہ! صرف ٹھیک ہیں۔ ارے شاندار۔ تجھے پتہ ہے یہ وہی حضرت ہیں جو......"

"مجھے پتہ ہے۔ انھوں نے بتا دیا تھا کل۔" اس نے بات کاٹی۔

"تو مجھے کیوں نہیں بتایا؟" وہ خفگی سے بولی۔

"کیا بہت ضروری تھا؟" وہ مسکرائی۔

"یہ بتاؤ۔ کیسی عادت ہے؟ پسند تو آئے نا تمھیں؟"

"ابھی سے عادتوں کا کیا پتہ؟" اس کی آواز دھیمی اور سنجیدہ ہوگئی۔

"ویسے کنٹرول رکھنا۔ بڑے آفت ہیں۔"

"میں جانتی ہوں کس قدر کنٹرول کے لائق ہیں۔" اس نے افسردگی سے سوچا۔

اور...... آج پھر جب وہ شغل کر رہے تھے۔ تو وہ ان کے پاس چلی آئی...... کراہت ہونے کے باوجود۔

"سنیں۔ کیا بہت ضروری چیز ہے یہ؟"

"دیکھو! آج سے ایک عہد کرو۔ تم میرے کسی معاملے میں نہیں بولو گی۔ ماما مجھے کہہ رہی تھیں تمھارے سامنے اس قسم کے مظاہرے نہ کروں۔ مگر بھئی، بیوی سے ڈرنے اور چھپانے کا میں قائل نہیں۔" انھوں نے گلاس ہلا کر برف گھلانے کا عمل کیا۔

"اس سے بہت بری بو آتی ہے۔" اس نے ناک سکوڑ کر کہا۔ "صحت الگ خراب ہوتی ہے۔"

"اب میں تمہاری خاطر اس میں پرفیوم چھڑکنے سے تو رہا۔" عجیب روکھائی سے جواب ملا۔

"مجھے اپنی لک پر ناز ہے۔ تمھیں ایک بات بتاؤں۔ میں شطرنج میں کبھی نہیں ہارا۔ ریس سے جب بھی واپس ہوتا ہوں، میرے بینک بیلنس میں لاکھوں روپے کا اضافہ ہوتا ہے۔ شرط کبھی نہیں ہاری۔ کسی بھی حسین عورت کے لیے مجھے کبھی کوئی جتن نہیں کرنا پڑے۔"

نشہ آہستہ آہستہ تیز ہو رہا تھا۔ اسے گھبراہٹ محسوس لگی۔

"ماما کے خیال میں، میں غلط چل رہا ہوں۔ وہ میرے لیے مڈل کلاس ایسٹرن گرل چاہتی تھیں۔ میں نہیں مانتا تھا، میں جانتا ہوں ان لڑکیوں کو۔ شیشہ سمجھتی ہیں خود کو، ان کی مٹی میں صرف گناہ ثواب ہوتے ہیں۔ مذہب اچھی چیز ہے۔ اور میں تمھیں کسی چیز کے لیے مجبور نہیں کروں گا۔"

اور وہ ایک سکتے کے عالم میں کھڑی تھی۔

معظم نے اپنا پورا بوجھ اس پر ڈال دیا۔ "تم میری قسمت میں تھیں شاید تبھی جیل

جانے کا بہانہ ہوا۔ دو سال شکاگو جیل میں رہا ہوں۔ ماما نے زبردستی مجھے پاکستان بھیجا۔ بہت خوف زدہ ہیں مجھ سے۔ تم نہ ڈرنا۔ جو ڈرتا ہے وہ مرتا ہے۔ پتہ ہے نا تمھیں؟"

وہ بمشکل انھیں بیڈ تک لائی۔ تکیے پر سر رکھ کر وہ بری طرح رو دی۔ "ماں! کونسی گھڑی ہنسنے پر بد دعا دی تھی؟ وہ کونسی گھڑی تھی جب تو نے ہنسنے پر کوسا تھا؟"

فرحت اور ماما تو فوراً ہی امریکہ چلی گئیں۔ وہ اتنے بڑے ڈھنڈار سے گھر میں بولائی سی پھرا کرتی۔ اماں کی طرف کم ہی جاتی تھی۔ جس دن جانا ہوتا صبح ہی معظم سے کہہ دیتی۔

"آج اماں کی طرف جاؤں گی۔ شام کو لیتے آئیے گا۔"

یہ سوچ کر وہ اور بھی کم میکے جاتی تھی کہ معظم کو اس کا جلد جانا ناگوار نہ گزرے۔ وہ لحاظ کی سرحد درمیان میں رکھ کر اپنے خوف کو کچھ کم کرنا چاہتی تھی۔

کبھی کبھار رخسانہ باجی کے ہاں اور نغمانہ کے ہاں چلی جاتی۔ جب بھی وہاں جاتی ڈھیروں پھل مٹھائیاں لے جاتی۔ وہ دونوں اسے بہت ٹوکتی تھیں کہ اتنا خرچ مت کیا کرو۔ میاں کے علم میں لا کر ہر کام کیا کرو۔

دولت نے آشیانہ میں کوئی چھچھورپن پیدا نہیں کیا تھا۔ اپنی پسند کے سادہ سادہ کپڑے پہنتی یا پھر ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں۔ نہ آئے دن شاپنگ سینٹر جاتی نہ سب میں بیٹھ کر اپنی امارت کے قصے چھیڑتی۔ اماں کے ہاں جاتی تو فوراً گھر کے کاموں میں لگ جاتی کہ انھیں میری امارت کا احساس نہ ہو۔ کوئی احساس کمتری نہ ہو۔ اس کے اپنے گھر میں ڈش واشر سے برتن دھلتے تھے۔ اماں کے ہاں آ کر راکھ سے پتیلیاں رگڑتی، ابا جی کے پرانے کپڑے رفو کرتی۔ اس کا کتنا جی چاہتا ابا جی کے لیے قیمتی شیروانیاں سلوائے، قیمتی لان کے کرتے بنوائے۔ انھیں قیمتی آرام دہ چپل لا کر دے۔ اپنی درجنوں سونے کی چوڑیوں میں سے چار ماں کے ہاتھ میں ڈال دے مگر وہ جانتی تھی اس کے گھر کا کوئی فرد اس سے چند سکے بھی لینا گوارا نہیں کرے گا اور وہ ان کی خودداری کو تازیانہ نہیں مارنا چاہتی تھی۔ البتہ اتنا ضرور کہہ دیا:

"اماں! اب تو بھائی میاں اچھی پوسٹ پر ہیں۔ گھر کے کاموں کے لیے ملازمہ رکھ لیں۔ تھک جاتی ہوں گی۔"

"ساری عمر کام کیا ہے۔ کیسا تھکنا؟ بہوئیں آ جائیں تو وہ کریں گی اب تو، چاہے خود

کریں یا نوکرانیاں رکھیں۔'' اماں نے اسے محبت سے دیکھ کر جواب دیا۔

''دیکھا اماں! میں نہ کہتی تھی شادی کے بعد سب عقلیں آ جاتی ہیں۔ دیکھو کتنا احساس کرتی ہے۔''

''مگر چپ چپ رہتی ہے۔ وہ شانو تو لگتی ہی نہیں۔'' اماں نے ساس سے کہا۔

''اے ہاں دُلہن! اب ذمہ دار ہوگئی ہے نا...... خدا نصیب اچھا رکھے۔'' انھوں نے بھی محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''کیا بات ہے شانو! بہت جھنک کر رہ گئی ہو دودھ نہیں ملتا؟'' چھوٹے بھائی نے مذاق کیا۔

''دودھ تو بہت ہے ہر جگہ۔ بس دل ہی نہیں چاہتا۔'' اس نے بجائے چڑنے کے بڑے گم صم انداز میں جواب دیا۔



''سنیں...... آپ کیوں پیتے ہیں؟'' آج اس نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

''ہونہہ...... کل کو کہو گی ریس کیوں کھیلتے ہیں؟ اتنی حسین گرل فرینڈز کیوں بناتے ہیں؟ اپنی اوقات میں رہو۔ آشیانہ بیگم! میں نے شادی اس لیے نہیں کی کہ میں تم پر عاشق ہو گیا تھا۔ اس لیے نہیں کی کہ مشرق پرست ہوں۔ صرف اور صرف اس لیے کہ میری عمر بھی ایسی تھی۔ میں اس اسٹینڈرڈ سوسائٹی میں بغیر مسز کا تھا۔ اس پر میری ماں کا اصرار۔ اچھا ہے گھر میں بیوی بھی ہو کیونکہ گرل فرینڈ اور بیوی میں بہرحال فرق ہوتا ہے۔ وہ اس قابل نہیں ہوتیں کہ انہیں مستقل گھر میں جگہ دی جائے اور تم مجھے ٹوکنے کی خطرناک غلطی نہ کرنا۔ یہ کام تو میری ماں نہ کر سکی۔ شاید تم جانتی ہو میرے والد نے مجھے عاق کر دیا تھا۔''

یہ نیا دھماکہ تھا۔

''اور انھوں نے میری شکل نہ دیکھنے کی قسم کھائی تھی۔ مگر ان کے انتقال کے بعد ماما نے مجھے اپنے پاس بلا لیا۔ مگر ایک اہم قانون شکنی کے بھگتان پر میں دو سال شکاگو جیل رہا۔ وہاں سے رہا ہوا تو ماما نے مجھے پاکستان بھجوا دیا۔ اور میں نے اپنا بزنس کر لیا یہاں۔ مجھے کہتی تھیں تمھیں کوئی حد درجہ مشرقی لڑکی لا کر دوں گی، بیوی کی شکل میں تاکہ وہ تمھیں سنوار دے۔''

وہ بڑی سچائی سے اسے تمام باتیں بتا چکا تھا۔ وہ جو ماما سے سخت بدظن ہوگئی تھی۔ ان

پر ترس آنے لگا۔

''تو ماما یہ بھایا تھا تمھیں قربانی کا جانور۔'' اس نے زہر خند انداز میں سر کو جھٹکا۔

''ہاں تو بھئی۔ کیا کیا سنوارو گی میرا؟''

اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ گولڈن نائٹ گاؤن اور چمکتے سیاہ بال دونوں بازوؤں کا تکیہ بنائے۔ وہ اسے بڑی طنزیہ مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر دیکھ رہے تھے۔

''کاش، تمھارے اعمال بھی تمھارے ظاہر کی طرح حسین ہوتے تو میں خود کو خوش قسمت ترین لڑکی سمجھتی۔ لعنت ہے اس عورت کی زندگی پر جسے اپنے شوہر کی وفائیں حاصل نہ ہوں۔ جو باہر چلا جائے تو دل وسوسوں میں گھر کر رہ جائے۔ جو رات کی تاریکی میں کھڑکی دروازوں سے لگ کر اندازوں سے کھیلے۔ اب آتا ہو گا تب آتا ہو گا۔''

وہ الماری کی جانب بڑھے تو جھٹکے دینے سے دروازہ نہ کھلا۔

''کیا یہ لاکڈ ہے؟'' وہ گھومے۔

''مجھے کیا پتہ؟ میرا تو اس الماری سے کوئی واسطہ نہیں۔'' اس نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

''مگر میں نے کبھی اسے لاک نہیں کیا۔'' اس بار ان کی آواز میں ترشی تھی۔

''تو پھر مجھے کیا پتہ؟ چابیاں اوپر ہیں، دیکھ لیں۔'' اندر ہی اندر اس کا کلیجہ کانپ رہا تھا۔ انھوں نے چابیاں لگائیں کوئی بھی فٹ نہیں تھی۔

''میں کہتا ہوں اسے بند کس نے کیا؟'' پل بھر میں وہ وحشی ہو گئے۔ بلوریں گلدان اٹھا کر سنگھار میز کے آئینے پر دے مارا۔ وہ لیٹی ہوئی اندر ہی اندر کانپ رہی تھی لیکن بظاہر بے نیاز تھی۔

انھوں نے اسے بازو سے پکڑ کر کھڑا کیا۔ آسمانی نائٹ ڈریس میں وہ خوف زدہ انداز میں ہونٹ چبا رہی تھی۔

''بتاتی ہو یا نہیں؟''

''میں کہہ رہی ہوں مجھے کوئی پتہ نہیں۔ صفائی فاطمہ نے کی تھی۔''

''بکواس بند کرو......

ہزار بار کہہ چکی ہو کہ میرے وجود سے اس کی بو آتی ہے۔ تو دفعان ہو جاؤ کسی اور

کمرے میں۔

بتا دو چابی کہاں ہے۔ ورنہ مجھے سلطان کے پاس اسی وقت جانا پڑے گا۔ اسی سے منگوالوں گا۔ جو تم کر رہی ہو اس میں ناکام رہو گی۔'' وہ جنونی لگ رہے تھے۔

''مجھے کچھ پتہ نہیں۔''

انھوں نے اس کے گاؤن کی فرل کو زور سے جھٹکا دیا۔ مگر وہ بھی کوئی سیخ سلائی نہیں تھی۔ ان کا ہاتھ اپنے گلے سے جھٹکے سے ہٹا کر بولی۔

''آپ اس قدر زیادتی نہیں کر سکتے۔ جس چیز کا مجھے کوئی علم نہیں۔ میں کیا کہہ سکتی ہوں؟ کیا بتا سکتی ہوں؟ ہٹیں میرے سامنے سے میں جا رہی ہوں اس کمرے سے۔ کیا میں اس گھر میں سو بھی نہیں سکتی آرام سے؟'' وہ کونسی کم تھی۔

''زیادہ ایکٹنگ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ نکالو چابی۔ کہاں ہے؟'' انھوں نے اس کا رخسار سرخ کر دیا۔

''جنگلی......'' وہ تڑپ کر رہ گئی۔

''شرم نہیں آتی تمھیں اتنے بے ہودہ طریقے سے جواب دیتے ہوئے۔'' وہ مزید بھڑک گئے اور ان کے تشدد سے ناک سے خون بہہ نکلا۔ وہ وہیں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

وہ تو عادی پینے والے تھے۔ ذرا سی رکاوٹ بھی برداشت نہیں ہوتی تھی۔

تب اس نے بیڈ کے نیچے سے چابی نکال کر ان کی سمت پھینکی۔ خود ناک پر ہاتھ رکھ کر باتھ روم میں چلی گئی۔

''بے وقوف۔ بدتمیز۔'' وہ چابی پا کر اسے اردو، انگریزی میں گالیاں دینے لگے۔

فرسٹ ایڈ بکس سے اس نے دوا لگائی اور گاؤن بدل کر ماما کے بیڈ روم میں چلی آئی۔

* * *

صبح وہ سو کر اٹھی تو جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ بہرحال، اٹھنا تو تھا، گھر بھی دیکھنا تھا۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر باہر آئی تو پتہ چلا صاحب جا چکے ہیں۔ اس نے ٹائم دیکھا نو بج رہے تھے۔

اس بات کی توقع فضول تھی کہ وہ معذرت کریں گے۔ خدا جانے اسے نباہنے کے ہنر کہاں سے آ گئے تھے۔ لڑ کر میکے جانے کا تو خیال بھی دل میں نہ لاتی۔

اس نے برائے نام ناشتہ کیا۔ گھر کی صفائی کروائی۔ دوپہر کے کھانے سے متعلق

مسئلہ حل کیا۔ کیونکہ دو چار آدمی دوپہر کو ان کے ہمراہ ہوتے تھے۔

اپنے کمرے میں آئی تو رات کا نقشہ نظروں میں گھوم گیا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

کہاں سے لاؤں وہ آغوش جس میں سر دے کر اپنا دکھ کہوں۔

دوپہر کو حسب توقع وہ کھانے پر آ گئے تھے۔ کسی انداز سے شرمندگی نہیں جھلکتی تھی۔ وہ ملازم کے ساتھ مل کر کھانا لگوانے لگی۔

''یہ ڈریسنگ ٹیبل وہیں کا وہیں ہے؟'' وہ اس کے سر پر کھڑے پوچھ رہے تھے۔

''پھر میں کیا کروں؟'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''نوکر سے کہہ کر اس کا آئینہ نہیں بدلوا سکتی تھیں؟''

''اچھا، بدلوا دوں گی۔'' سادگی سے جواب ملا۔

''کبھی خود سے بھی کچھ کر لیا کرو۔ ضروری ہے کہ ہر بات کے لیے کہا جائے۔''

وہ خاموش رہی، نیپکن میز پر رکھ کر وہ ان کی طرف دیکھے بغیر باہر آ گئی۔

خدا جانے یہ صبر و تقویٰ تھا کہ کیا تھا۔ اس نے کبھی بیرونی دنیا پر کچھ ظاہر نہیں کیا۔ ماں پوچھتیں۔ ''خوش تو ہو بیٹی؟''

''خوش نہ ہونے کی وجہ؟ اپنا گھر ہے، اپنی چھت ہے۔'' عجب بے نیازی سے جواب ملتا۔

بہنیں پوچھتیں۔ ''ایڈجسٹ ہو گئی ہو۔ کیسے رہتے ہیں تمھارے ساتھ؟''

''جیسے شوہر رہتے ہیں۔'' بڑے سپاٹ سے انداز میں جواب ملتا۔

''آتے کیوں نہیں؟''

''فرصت نہیں۔''

''پہلے کی طرح کیوں نہیں رہتیں خوش باش، کیا کمی ہے؟''

''خوش ہوں اور کس طرح رہوں؟ آپ لوگ کیا خوشی کے اظہار کے لیے ڈھول پیٹتے ہیں؟'' سرد مہری سے جواب ملتا۔ پرسان حال خاموش ہو جاتے۔ کیسا نہ سمجھ میں آنے والا رویّہ تھا۔

آج وہ ایک حسین و معصوم بیٹی کے ہمراہ گھر میں داخل ہوئی۔ تو گھر پہلے سے زیادہ اپنا لگا۔ پہلے سے زیادہ مضبوط۔

وہ اسے ہاسپٹل لینے آئے تھے۔ اس کا سامان گاڑی میں خود رکھا تھا اور اسے سہارا

دے کر گاڑی تک لائے تھے۔ بیٹی کا نام انھوں نے اپنی پسند سے گل رکھا تھا۔ ان کے اس انداز سے اسے بہت سکون محسوس ہوا تھا۔ مگر ان کے اپنے معمولات وہی تھے۔ وہ حقوق جو انھوں نے بیوی کے نام کرنے کا وعدہ خدا کو حاضر و ناظر جان کر کیا تھا۔ وہ آدھے سے بھی کم اسے ملتے تھے۔ محبتوں اور الفتوں کی بارشیں باہر ہوتی تھیں۔ اس کے حصے میں صرف چھینٹے آتے تھے۔

اور ایک روز وہ آکر انتہائی درشتگی سے اپنی ٹائی کھینچ کر اتار رہے تھے۔

اس نے مزاج آشنا وفادار بیوی کی طرح سوالیہ نظروں سے انھیں دیکھا۔

''لگتا ہے تمہاری بیٹی سخت منحوس ہے۔ تین سو چوبیس میرے لیے ہمیشہ لکی رہا ہے۔ آج ایک لاکھ روپے ہار کر آرہا ہوں۔ سُنا تم نے؟''

''میری ہی بیٹی نہیں۔ آپ کی بھی......'' اس نے تصحیح کی۔

''ہونہہ!'' انھوں نے کوٹ اُچھال کر ایک طرف پھینکا۔

''یہ تو ایک نیک فال ہے۔'' اس نے سوچا۔

''جو ہارتا چلا جائے تو کیا وہ جوئے، ریس سے کنارہ کش ہو جاتا ہے؟'' اس نے بے خوفی سے سوال کیا۔

''جی نہیں، سڑک کے کنارے کٹورہ لے کر بیٹھ جاتا ہے۔'' وہ بھڑک کر بولے۔

''ضروری ہے کٹورہ لیا جائے۔ ہاتھ پاؤں کی سلامتی کے ساتھ وہ سامان بھی ڈھو سکتا ہے۔''

''تمہاری تو نیت یہی ہے۔ تمہاری تو اوقات ہی یہی تھی۔''

''چلی جاؤ میرے سامنے سے۔ ورنہ کچھ کر بیٹھوں گا۔'' وہ دھاڑے۔



اس کے دیور اعظم کی شادی ان دنوں ہوئی تھی۔ جب وہ سفر کے قابل نہ تھی۔ ماما فون پر اس کا احوال پوچھتی رہتی تھیں اور ہر مرتبہ اس کے منہ سے سن کر کہ ''خوش ہوں'' ان کے دل سے بوجھ سا سرک جاتا۔ معظم شادی میں شرکت کے لیے دو دن کے لیے گئے تھے۔ ماما کی مرضی سے ہی اعظم کی شادی وہاں مقیم پاکستانی فیملی میں ہوئی تھی۔

گل۔ اب تین سال کی ہو گئی تھی۔ ماما اصرار کر کے اسے امریکہ بلاتی تھیں۔ اس مرتبہ ان کا پروگرام امریکی ریاستوں کی سیر کا تھا۔ وہ اسے شامل کرنا چاہتی تھیں۔

وہ گل کو کے جی کلاسز میں دے چکی تھی۔

تب اعظم اور عظیم کے بھی بے حد اصرار پر معظم نے اُسے جانے کو کہا۔

''ایک دو ہفتے کی بات ہے۔ گل کو یہیں رہنے دو۔ آیا ہے اس کے پاس۔ نانا نانی ہیں، میں ہوں۔''

تب وہ امریکہ چلی آئی۔ ائیر پورٹ پر سب انھیں ریسیو کرنے آئے ہوئے تھے۔ ماما نے اسے گلے لگایا۔ تو اس کا دل بھر آیا۔

''راستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟'' انھوں نے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ویسے میری تو کمر دکھ رہی ہے بہت لمبا سفر تھا۔'' اس نے تھکی تھکی آواز میں اسے بتایا۔

''اور بھئی، گل نہیں آئی؟'' فرحت نے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''انھوں نے آنے ہی نہیں دیا۔ کہہ رہے تھے چند دنوں کی بات ہے تم آرام سے تفریح کر آؤ۔ ڈسٹرب کرے گی تمھیں۔''

''اچھا!'' ماما کی خوشی میں تحیر تھا۔

''اور بھئی، اعظم کی دلہن سے تو تمہارا تعارف نہیں کرایا۔ یہ زہرہ ہے۔'' انھوں نے چھوٹی بہو کی طرف اشارہ کیا۔

اس نے زہرہ کو گلے لگا کر پیار کیا۔ نازک سی زہرہ بہت پیاری تھی۔ چہرے پر بکھری مسکراہٹ اسکی خوش اخلاقی کی مظہر تھی۔

''اوہ بھابی! گل کا تو اتنا انتظار تھا۔ رات بھیا کا فون آیا تھا۔ انھوں نے بھی نہیں بتایا۔ بس صرف اتنا کہا کہ آپ کو لینے پہلے پہنچ جائیں تاکہ آپ پریشان نہ ہوں۔'' عظیم نے بتایا۔

''ہاں، بھئی، مجھے بھی اس کا بے حد افسوس ہو رہا ہے۔ لے آتیں اسے بھی۔'' ماما نے کہا۔

''ویسے کیسی ہو رہی ہے؟'' انھوں نے محبت سے پوچھا۔

''بہت شرارتی ہے ماما۔ تنگ آجاتی ہوں۔'' اس نے ہنس کر بتایا۔

پھر وہ ان کے ہمراہ گھر چلی آئی۔ بہت خوبصورت لگا۔ مگر اس کے اپنے گھر سے کم تھا۔ وہ وسیع عریض گھر کہ بچہ اس میں کھو جائے تو بمشکل ملے۔ پانچ بیڈ روم نیچے، سات اُوپر۔ جب ہی وہاں ہو کا عالم تھا۔ اس چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں کس قدر خوشیاں تھیں۔ گل اسے

بہت یاد آئی۔ اور وہ یاد نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ بیڈ پر نیم دراز سوچوں میں گم ماما کے کردار کا تجزیہ کر رہی تھی۔ کیا ماما خودغرض ہیں؟ جنھوں نے اپنے ہر شرعی عیب سے پُر بیٹے کا ناتہ عمر بھر کے لیے مجھ سے جوڑا۔ ہماری کم مائیگی کا فائدہ اٹھایا۔

مجھے اتنی محبت سے بیاہ لائیں۔ ان کی محبت میں آج بھی کمی نہیں۔ وہ اپنے ظلم کا تاوان مسلسل ادا کر رہی ہیں۔ سوچتی ہوں نہ اٹھا کر پٹخا ہوتا ساحل پر۔ موجیں چند لمحے میرے جسم و رُوح سے کھیل کر اسے ہر احساس سے عاری کر دیتیں۔ یوں روز تو نہ جشنِ مرگ کا اہتمام ہوتا۔ احساس کی دولت ہے کہ روز افزوں بڑھتی جاتی ہے۔ کبھی محبت کرنے والے مل جاتے ہیں۔ تو پھر احساسات توانا ہو جاتے ہیں۔ دل ان سے بدگمان ہوتا ہے۔ تو کوئی احساس گل کے رُوپ میں جھولی میں آن گرتا ہے۔ احساس کی آگ سلگا سلگا کر مجھے جھلسایا جاتا ہے۔ اور تم کیا ہو ہر بات سے بے نیاز محبت کا کوئی بیکراں جذبہ تمہاری روح کو چھوتا تک نہیں۔ تو تم نے کیوں مجھے لہروں سے جیت لیا تھا۔ شاید تمھارے لیے موت بہت بڑا واقعہ ہے۔ تمھارے مشاغل بہت پھیل گئے ہیں۔ تمھیں ہر شغل سے لطف لینے کے لیے ایک عمرِ نوح چاہیے۔ سو بس تمہاری رُوح میں صرف دو احساس طاقت ور ہیں۔ موت اور زندگی۔ ماسوائے کچھ نہیں۔

اور ماما...... آپ کی محبتوں کا جال اب میرے لیے وبال ہو چکا ہے۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

وہ میرا گھر تھا، وہ میری پہچان تھا۔ وہی میری اصلیت تھی۔ وہ گھر جہاں میں دو بھائیوں، دو سایہ دار اشجار میں ہمہ وقت پھلتی پھولتی تھی۔ میں ان بد دعا دینے والی بزرگ عورتوں کو اپنی کسی خوشی، کسی غم کا بھید بھی نہیں دوں گی۔ میں بوجھ تھی۔ انھیں سکھ کی نیند آئی ہوگی۔

میرے اطراف جتنی عورتیں ہیں۔ آپ ماما، اماں، دادی جان...... سب سے میرا دل میلا ہے۔ تب ہی پردہ سرکا کر ماما...... دودھ کا گلاس لے آئیں۔"

"لو دلہن پی لو۔"

"میرا جی نہیں چاہتا ماما! بس نیند آ رہی ہے۔"

"تھوڑا سا ہی لے لو۔"

"پھر مجھے زبردستی پینے سے قے ہو جائے گی۔" یہ وہی دودھ تھا جو میکے میں چھیڑ چھاڑ کا عنوان رہا۔

بہت کچھ بدلا تھا۔ مگر سرکشی کا تھوڑا انداز اب بھی باقی تھا۔ وہ پہلے روز سے آج تک کسی امارت و شان سے مرعوب نہ تھی۔ جیسے یہ اسے یقین تھا کہ یہ سب اسے ملنا تھا۔

وہ آنکھوں پر بازو رکھے انھیں جواب دے رہی تھی۔

وہ سمجھی ماما چلی گئیں۔ اس نے ایک بازو ذرا سا ہٹایا۔ ماما ایک ٹک اس کی سمت دیکھ رہی تھیں۔

اس کی آنکھوں میں پانی تیر رہا تھا۔

ماما کی آنکھیں بھی دریا تھیں۔ انھوں نے دودھ کا گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔ وہ آنکھوں پر دوبارہ بازو رکھ چکی تھی۔ تب اسے اپنے پاؤں پر گرم قطروں کا احساس ہوا۔ وہ بے تحاشا چونک گئی۔

ماما اس کے پیروں میں جھکی ہوئی تھیں۔ اس کے لیے یہ سب ناقابل برداشت تھا۔

وہ رو رہی تھیں۔

"ماما!" وہ انھیں شانوں سے تھام کر بٹھاتے ہوئے بولی۔

انھوں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ ادھر بھی طغیانی آ گئی۔

"میں تم سے معافی مانگتی ہوں۔" وہ تڑپ تڑپ کر رونے لگیں۔

"اوہ! ماما!!" کتنی ہی دیر سمندر جوار بھاٹے کی طغیانی کے سامنے بے بس رہا۔

"مجھے معاف کر دینا۔"

"ماما! یوں نہ کہیں۔ کوئی بات نہیں۔ میں ٹھیک ہوں، خوش ہوں۔"

"اوہ میری بیٹی! ایسے نہ کہا کرو۔ مجھ سے کہو بیٹی! جو تمھارے جی پر بوجھ ہے۔ کہہ دو بیٹی! تم ہنستی کیوں نہیں؟ کہو بیٹی! جو گزری...... جو میں نے چاہا تھا وہ نظر نہیں آیا...... وہ وہیں ہے تو پھر تم سراسر گھاٹے میں ہو۔ تم......"

وہ ان کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ان کا خوشبوؤں بھرا وجود اسے سایہ دار درخت سا لگا۔ پھر کوئی لفظ، کوئی حرف بیچ میں نہ آیا۔ وہ ان کا دامن بھگویا کی اور وہ اس کا......"

...........✡...........

ان کا نیا گرافال دیکھنے کا پروگرام تھا۔ اور پھر وہیں سے ماما کا اپنے دیور کے پاس

ٹورنٹو جانے کا ارادہ تھا۔ وہ دونوں بہوؤں کو اپنے عزیزوں سے ملوانا چاہ رہی تھیں۔

ابھی وہ نیاگرافال دیکھنے سے جی بھر کر لطف بھی نہ لے پائے تھے کہ شکاگو سے عظیم کا فون آ گیا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ بڑی بھابی...... کو بلائیں۔ آشیانہ نے جب بات کی تو وہ کہہ رہا تھا۔

''بھابی! پاکستان سے بھیا کا فون آیا ہے ابھی...... وہ گل دوسری منزل سے گر گئی ہے اور اب ہاسپٹل میں ہے۔ انھوں نے کہا ہے جتنی جلد ہو سکے آ جائیں۔''

اس کی تو آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ سب تسلی دے رہے تھے۔ ساری تفریح غارت ہو گئی۔

شکاگو پہنچ کر وہ عظیم کے ہمراہ جلد ہی پاکستان پہنچ گئی۔ ماما نے کہا تھا وہ فرحت کے ہمراہ دو چار روز میں پہنچ رہی ہیں۔

وہ سیدھی گھر جانے کے بجائے ہاسپٹل پہنچی۔ عظیم نے سب کچھ معلوم کر لیا تھا، فون پر۔

اپنی بچی کو نیم مردہ حالت میں دیکھ کر وہ تو بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ پتہ چلا کہ تین دن سے ہوش نہیں آیا ہے۔ ویسے حالت خطرے سے باہر ہے۔ وہ ایک دم شکستہ حال گھر لوٹ آئی۔ معظم اپنے بیڈ پر لیٹے کوئی فون سن رہے تھے۔

''آپ سے جب اس کا دھیان نہیں رکھا گیا۔ آیا سے نہیں سنبھالا گیا تو کیوں رکھا تھا اُسے اپنے پاس؟'' اس نے فون جھپٹ کر ایک طرف رکھا۔ وہ بالکل جنونی لگ رہی تھی۔

''میری آپ سے کون سی دشمنیاں چل رہی تھیں کہ آپ ہر لمحہ مجھے تاک کر نشانہ لگاتے ہیں۔ جو سیدھا میرے دل میں لگتا ہے۔ اگر اسے کچھ ہو گیا...... اسے کچھ ہو گیا۔'' وہ بری طرح رو دی۔

''پاگل ہو رہی ہو تم۔ ٹھیک ہے وہ اب، ذرا ذرا سی بات پر پریشان ہو جاتی ہو۔ یہ کوئی طریقہ نہیں ہے۔ تمھیں تو بات کرنے کا بھی سلیقہ نہیں۔'' وہ جو اسے دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ اسے اس قدر جنوں میں دیکھ کر جھلا کر رہ گئے۔

اس کے صبح و شام کے چکر تھے۔ دادی جان، اماں رخسانہ باجی، نغمانہ، بھائی سب اس کا خیال رکھ رہے تھے۔ مگر وہ پر کٹی چڑیا کی طرح بے بس پھرا کرتی۔

بچی کے دماغ پر بُرا اثر پڑا تھا اور اس کی آنکھیں بھی متاثر ہوئی تھیں۔ دماغ کا معاملہ بہت نازک تھا...... آنکھوں سے متعلق ڈاکٹر پُر امید تھے۔

بچی گھر آ گئی۔ بڑی عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتی تھی۔ سارے گھر کے جوتے جمع کر کے ڈھیر لگا دیتی۔ نوکروں کے پاؤں سے بھی سلیپر کھینچ لاتی۔

جمعہ کی صبح وہ اپنے کمرے میں بیٹھی پردوں کے ہک نکال رہی تھی۔ لانڈری بھجوانا تھا اور نئے پردے دیکھ رہی تھی۔ کوئی اُدھڑا ہوا نہ ہو۔ معظم اخبار کا جمعہ ایڈیشن لیے بیٹھے تھے۔ بچی اس کے پاس بیٹھی کھیل رہی تھی۔ یکایک اپنی آنکھوں پر ہتھیلیاں رکھ کر مسلنے لگی۔ پھر چھوٹے چھوٹے خوبصورت قہقہے لگانے لگی۔ کلکاریاں مارتی ہنستی۔ پھر معظم کے بھاری جوتے اٹھا کر کمرے میں بھاگنے لگی۔ آشیانہ کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے معظم کو دیکھا۔ وہ بھی بڑی پریشانی سے بچی کو دیکھ رہے تھے۔

''کیا ہو گا اس کا؟'' وہ بھرائی آواز میں بولی۔

''ٹھیک ہو جائے گی۔ فکر نہ کرو۔'' وہ تسلی دے رہے تھے۔ مگر آواز میں تشویش تھی۔

تھوڑی دیر میں اماں اور ابا جان آ گئے تو اس کا ذہن اِدھر اُدھر ہو گیا۔



''میڈم۔ بے بی امارا سلیپر اِدھر اُدھر پھینک دیتا اے۔ ام بڑا ڈسٹرب اے۔ میرے کو تو چھٹی دیو۔ یہ ابنارمل بے بی کنٹرول نئیں ہوتا۔''

''اپنے صاحب کو اپنا دُکھڑا سنا دو، وہ بیٹھے ہیں۔'' اس نے بچی کو گود میں اٹھا کر تلخی سے کہا۔

اس نے جانے کیا کہا۔ انھوں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اس کی تنخواہ تھمائی اور چلتا کیا۔

وہ کسی کام سے کچن میں گئی اور گل نے حسب عادت جوتوں کا ڈھیر لگا دیا۔ تھوڑی دیر بعد جوتوں کو قرینے سے لگایا اور بستر بنا کر لیٹ گئی اور کھلکھلانے لگی۔ معظم نے آ کر دیکھا۔ وہ لمحے بھر کو دم بخود سے کھڑے رہے۔ بعض اوقات ٹھیک ٹھاک لگتی اور بعض اوقات اس قدر تکلیف دہ حرکتیں کرتی جو دونوں کے لیے ناقابل برداشت تھیں۔

وہ علاج کے لیے باہر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ اس لیے ماما نہیں آئی تھیں۔ عظیم چند دنوں بعد ہی واپس چلا گیا تھا۔

''امی! کہانی سنائیں۔'' ساڑھے تین سالہ گل نے بہت دنوں بعد نارمل انداز میں

بات کی۔ اس نے اسے خوشی سے لپٹا لیا...... ''کون سی کہانی؟''

''کون سی کہانی؟'' اس کو یہ الفاظ بازگشت کی طرح پھیلتے لگے۔

''ملکہ کی؟''

گل خاموش رہی۔ ''کونسی کہانی بیٹی؟''

''وہ کہانی جہاں ایک شہزادی دو بھائیوں کے ساتھ رہتی تھی۔ ایک دن ایک دیو...... دیو اٹھا کر لے گیا۔ وہ شہزادی آج تک قیدی ہے۔ سنائیں ناں۔''

اس نے اخبار میں سے کہانی شروع کر دی۔ ''نافرمان شہزادہ۔''

''ایک بادشاہ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ بادشاہ اس سے بے حد محبت کرتا تھا۔ مگر شہزادہ بہت ضدی اور سرکش تھا۔ وہ کسی کی بات نہیں مانتا تھا۔ ایک دن اسے پتہ چلا۔ کوہ قاف میں کسی دیو کے پاس ایک پھول ہے جس میں ساری دنیا نظر آتی ہے اور اگر وہ پھول کسی کے سامنے کر دیا جائے تو وہ اس پھول کے مالک کا غلام بن جاتا ہے۔ شہزادہ اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ اسے اللہ نے سب کچھ دیا تھا مگر اسے بہت ہوس تھی۔ وہ دنیا کے ہر ملک پر حکومت کرنے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ مگر جب وہ کوہ قاف پہنچا تو پتھر کا ہو گیا کیونکہ وہاں جو بھی آدم زاد آواز نکالتا پتھر کا ہو جاتا تھا۔ بیوقوف شہزادے نے دیو کو آواز دے دی تھی۔ شہزادے کے واپس نہ ہونے پر کچھ خیر خواہ اس کو ڈھونڈنے نکلے۔ انھیں راستے میں ایک بزرگ ملے۔ انھوں نے سنہرا پانی دیا کہ پتھر بنے آدمی پر چھڑکنا وہ زندہ ہو جائے گا۔'' وہ یہیں تک پہنچی تھی کہ معظم اندر داخل ہوئے۔

''تم کیا الٹی سیدھی کہانیاں سنا کر اسے اور زیادہ ذہنی طور پر بیمار کرو گی؟ کبھی عقل بھی استعمال کر لیا کرو۔'' انھوں نے جھاڑا۔

''میرا مقصد تو اسے سُلانا تھا۔'' اس نے سوئی ہوئی گل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

............✡............

وہ دوسرے آپریشن کے بعد ماما کے پاس جانے کی تیاریاں کرنے لگی کیونکہ آپریشن کے نتائج حوصلہ افزا نہیں تھے۔ معظم بھی اس کے ہمراہ جانے کو تیار ہو گئے۔

بچی کی معصوم صورت اور اس کی ابنارمل حرکتیں دونوں کے اعصاب چٹخا دیتی تھیں۔

ان کی رات کی فلائٹ تھی۔ وہ ضروری چیزیں یاد کر کے رکھ رہی تھیں۔ اماں صبح ہی نغمہ کے ہمراہ آ گئی تھیں۔ وہ اس کے ہاں بہت کم آتی تھیں۔ اس داماد کے اور ان کے درمیان

اولین تکلف آج بھی تھا۔ سادہ سی عورت داماد کی پیشانی دیکھ کر بات کرتی تھیں۔ انھیں تو کبھی یہ کہنے کی ہمت بھی نہ ہوئی کہ بیٹا تم ہمارے ہاں کیوں نہیں آتے؟

اس کے سادہ سے گھر والے اس بات پر متفق تھے کہ روپیہ محنت سے کمایا جاتا ہے اور ان کا داماد جتنا دولت مند ہے۔ ظاہر ہے کہ محنت بھی اسی قدر کرتا ہے۔ واقعی مصروف ہے۔

بھائی میاں تو شادی کے بعد بے حد مصروف تھے۔ چھوٹے بھائی ایک سیاسی ماہنامے کے چیف ایڈیٹر تھے۔ ان کی اپنی مصروف دنیا تھی۔ ان کے لیے یہ بات کم تھی کیا کہ ان کی بیٹی نے چار سالوں میں کبھی ان سے کوئی دکھ نہیں کہا جبکہ اس کی دوسری بہنیں سسرال کی دکھی داستانیں ماں کو سنا جاتی تھیں۔

اماں جب سے آئی تھیں نوافل میں مصروف تھیں۔ بچی کو سنبھالے ہوئے تھیں۔ اس پر پڑھ پڑھ کر دم کر رہی تھیں۔ اس نے بچی کا سوٹ کیس لاک کرتے ہوئے نظر اٹھا کر انھیں دیکھا۔ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے کھڑے بالوں پر اسپرے کر رہے تھے۔ سنجیدہ اور خاموش خاموش۔

اس نے اس دولت مند اور خوبصورت شوہر کو یاسیت سے دیکھا اور سوچا کتنا فکر مند ہے۔ آج یہ شخص اپنی اولاد کی وجہ سے اپنے سو مشاغل چھوڑ کر جا رہا ہے۔ کتنی خوش نصیب ہے میری بیٹی جسے باپ کی توجہ اور ہمدردی تو حاصل ہے۔

اس کو یاد تھا۔ نغمانہ کی شادی پر ابا جی نے اپنے ایک رشتے کے بھائی سے چند ہزار روپے قرض لیے تھے اور چچا نے انھیں دیتے ہوئے کہا تھا۔ بھائی صاحب! آپ تو بہت اہم سیٹ پر بیٹھے ہیں۔ ہر فائل آپ کے ہاتھوں سے گزر کر آگے جاتی ہے۔ آپ چاہیں تو۔''

''میں جانتا ہوں تمہارا مقصد میاں۔ مگر میں اپنی اولاد کے لیے کنوئیں کھودنا نہیں چاہتا۔ میاں جان لو۔ یہ بات صحیح اور مشاہدے میں آئی ہے۔ جس طرح اولاد ماں باپ کے خون اور جائداد میں حصہ دار ہوتی ہے۔ ان کے گناہ اور ثواب کے نتیجے...... بھی اولاد کے حصے میں آتے ہیں۔ پہلے مجھے ان کاموں سے خوفِ خدا نے روکے رکھا۔ اور اب۔ میاں بچے سکھی رہیں۔ اس سے بڑی دولت کیا ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ میں تمہاری رقم دو ماہ میں لوٹا دوں گا۔''

اس کا جی چاہا کہ معظم کو جھنجھوڑ کر ابا جی کی یہ بات سنائے۔ اور کہے۔ ''کیسے دوست ہو؟ کیسے دشمن ہو؟''

اسی دم اس کی بیٹی اندر آ گئی اور معظم کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ وہ اپنی آنکھوں کو عجیب سے انداز میں حرکت دے رہی تھی۔ حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکال رہی تھی۔ سجے سجائے معظم نے اسے گود میں اٹھالیا۔ مگر وہ مچل کر ان کی گود سے اتر گئی۔ اور کمرے میں بھاگتے ہوئے ٹھٹک گئی۔ اس نے معظم کی سمت دیکھا۔ وہ بھی ادھر ہی دیکھ رہے تھے۔ ایک لحظہ کو ان کی نظریں ٹکرائیں۔ ہر دو طرف...... بے چارگی تھی۔



وہاں جاتے ہوئے بچی کے کئی ٹیسٹ ہوئے۔ رپورٹیں خوش آئند تھیں۔ دماغ کی شدید چوٹ کی وجہ سے بچی کی آنکھوں پر بھی اثر تھا۔ اچانک اندھیرا چھا جانے کی وجہ سے وہ چیختی تھی اور اِدھر اُدھر بھاگتی تھی۔

اسے معظم پر اس وقت ٹوٹ کر پیار آ جاتا جب وہ انتہائی سنجیدگی اور تشویش سے ڈاکٹروں سے انتہائی شستہ انگریزی میں معلومات حاصل کر رہے ہوتے۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ وہی معظم ہے جس نے اس پر تشدد کر کے کبھی معذرت نہیں کی تھی۔

آج اس کی زندگی کا ایک کڑا امتحان تھا۔ ییا آر یا پار۔ بال برابر قوت برداشت کا پل صراط۔ بچی تو ہاسپٹل میں تھی۔ آج اس کا آپریشن تھا۔ وہ ماں اور معظم کے ہمراہ جا رہی تھی۔ اس کا دل دھڑ دھڑ بج رہا تھا۔ صبح کو وہ معظم کے گلے لگ کر بے ساختہ رو دی تھی۔ اور انھوں نے احمق...... بے وقوف کہہ کر ناگواری کا اظہار نہیں کیا بلکہ اس کی پشت تھپتھپا کر گویا تسلی دی تھی۔

شام چار بجے انھوں نے جانا تھا۔ وہ ظہر کی نماز کے لیے وضو کر کے کمرے میں آئی تو پردہ ہٹاتے ہی اس کے حواسوں پر گویا پھول برس پڑے۔

معظم خوبصورت مخملی جائے نماز پر رکوع کی حالت میں تھے۔

اور وہ دم سادھے انھیں دیکھتی رہ گئی۔ اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا۔

آج یہ شخص دنیا کا خوبصورت ترین انسان لگ رہا تھا۔ اسے بیٹی کو سنائی ہوئی کہانی ''نافرمان شہزادہ'' یاد آ گئی۔

اس نے سوچا۔ ''ایسا بھی ہوتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے۔ ناممکن کیا بات ہے یہاں؟

بعض اوقات اپنے نفس کا لاڈلا انسان ہوس مال و جاہ میں اتنا مدہوش ہو جاتا ہے کہ اس کی ہوس بند توڑتے سیلاب کو مات کر دیتی ہے اور وہ دنیا میں کسی اور تکبر میں مبتلا کر دینے

والے عیش کے پھول کی تلاش میں گناہوں کے کوہِ قاف میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔

اور ایسے میں مرشدوں کا والی...... بزرگوں کا بزرگ...... سارے جہاں کا بادشاہ۔ ایک دھچکے کا، ایک ٹھوکر کا، ایک رُوح کو جھنجھوڑنے والے حادثے کا سنہرا پانی عطا فرماتا ہے۔ جو اس کے تعمیر کے پتھر کو زندگی عطا کر دیتا ہے اور وہ حسب توفیق تائب ہو جاتا ہے اور اپنے ضمیر کے زندہ وجود کو سمیٹ کر اس گناہوں کے کوہِ قاف سے سرپٹ بھاگتا ہے۔ کیسے نصیب والے ہوتے ہیں جنھیں یہ سنہرا پانی دیا جاتا ہے۔

بڑی کڑی قیمت، بڑے کالے کوس کے فاصلے، بڑی مسافتیں، اس سنہرے پانی میں بہت ہے آقا...... کافی ہے مالک...... بھرپور ہے بادشاہ۔

خدا کرے کسی کی ایسی آزمائش نہ ہو کہ اس سنہرے پانی کی نوبت آئے۔

معظم آنکھیں بند کیے آیت کریمہ پڑھ رہے تھے۔

''اور کوئی نہیں سوائے اللہ کے۔ تو پاک ہے بے شک میں ہی اپنی جان پر ظلم کرنے والا ہوں۔''

اس نے چادر لپیٹی اور جائے نماز معظم کے ساتھ بچھالی۔

اماں کی کم عقل بیٹی جانے کتنے ادراک کے دروازوں سے گزر کر خدائے لازوال کے حضور سربسجود تھی۔



اے بسا آرزو

"امی میری بیلٹ کہاں ہے؟" ننھا یاسر بولا۔

"جہنم میں ہوگی۔ اتار کر چیزیں اس طرح پھینکتے ہو گویا دوبارہ استعمال ہی نہیں کرو گے۔ کتنی مرتبہ کہا ہے تمھارے کمرے میں ہر چیز کا ٹھکانا ہے، کیوں نہیں رکھتے ہر چیز اس کے مقام پر۔" وہ گویا بھری بیٹھی تھی۔ پھٹ ہی تو پڑی۔

یاسر جلدی سے کمرے میں واپس گھس گیا اور اپنی وارڈروب میں اُلٹ پلٹ کرنے لگا۔

اس نے ڈانٹ تو دیا تھا مگر کسی طرح قرار نہ آیا تو مجبوراً خود آ کر اس کی بیلٹ ڈھونڈی۔ "انہی حرکتوں پر کسی دن بری طرح پٹو گے۔" اس نے پھر گرمی کھائی اور اپنے الجھے بالوں کی چوٹی جھٹک کر کچن کی سمت آئی تو عثمان کو ٹائی کی ناٹ درست کرتے ہوئے کچن کے دروازے پر موجود پایا۔

"بھئی وہ چائے وائے ناشتے وغیرہ کا کوئی انتظام نہیں ابھی تک؟" عثمان نے کہا۔

"میں دنیا کی عورتوں سے مختلف ہوں لہٰذا کاہلی اور سُستی میں اپنا جواب نہ رکھنے والی عورت تو اسی ڈھب کی ہوتی ہے۔ چل کر بیٹھیے آ رہا ہے ناشتا۔" اس نے عثمان کو بھی گویا سالم نگلنا چاہا۔

"یار اتنی سی بات کا بتنگڑ بنا لیتی ہو تم تو، کمال ہے۔"

وہ ناشتا لگا رہی تھی کہ عثمان نے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے کچھ کہنا چاہا مگر وہ اس سے پہلے بول اٹھی۔ "میں نے کوئی وضاحت طلب نہیں کی اور یہ بھی ضروری نہیں کہ جو بات آپ کے لیے اتنی سی ہو وہ میرے لیے بھی اتنی سی ہو؟" وہ کام نمٹا کر پھر پلٹ گئی۔

عثمان خاموشی سے ناشتا کرنے لگے۔ انھوں نے خاموشی ہی میں پناہ ڈھونڈی تھی۔

وہ بھی مزید کچھ نہیں بولی تھی اور گڑیا کو تیار کرانے لگ گئی تھی۔



عثمان بہت اچھے شوہر ثابت ہوئے تھے۔ وہ گھر کی تمام ضروریات کا ذمہ داری سے خیال رکھتے تھے۔ اسے کسی چیز کی کمی نہ ہونے دیتے لیکن ان میں ایک خرابی تھی جو ان کی تمام خوبیوں پر بھاری تھی اور وہ تھی "اچھی صورتوں" کو بہ غور تکتے رہنے کی عادت۔ حالانکہ محض "تکنا" تو کوئی ایسی خامی نہیں تھی کہ تکنے سے "قلبی تبدیلی" کا سراغ نہیں ملتا!

لیکن ثوبیہ کے نزدیک یہ اس کی بہت بڑی توہین تھی۔ وہ لاکھوں میں نہ سہی ہزاروں میں ایک ضرور تھی۔

شروع شروع میں جب اس کی شادی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا، اسے عثمان کی یہ عادت بہت بھاتی تھی۔ جب وہ مسکراتی تو عثمان جذبوں سے پُر نظروں سے اسے بہ غور دیکھا کرتے لیکن رفتہ رفتہ پتا چلا کہ ان مسکراتی نظروں کا محور محض وہی "فردِ یکتا" نہیں بلکہ جہاں بھی اچھی صورت ہوتی ہے، وہ عثمان کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے۔

اکثر تقریبات میں اس وقت ثوبیہ کا حلق تک کڑوا ہو جاتا جب عثمان اسے "باسی روٹی" کی طرح نظرانداز کر کے کسی پُرکشش چہرے کو دلچسپی سے تکنے لگتے۔ کچھ ایسی اضطراری کیفیات ان کے چہرے سے مترشح ہونے لگتیں گویا وہ "مرکزِ نگاہ" چہرے کو نوالہ بنا کر اپنے معدے میں اتارنا چاہتے ہوں۔ ایسے میں وہ انھیں اپنی جانب زبردستی متوجہ کرنے کی کوشش کو اپنی توہین سمجھتی اور محض خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتی۔

واپسی کے دوران میں عثمان اس کے بگڑے موڈ کی وجہ بڑی سادگی سے دریافت کرتے تو اس کا جی چاہتا کہ گاڑی سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لے۔

نئی نئی شادی تھی۔ اپنے اخلاق و کردار کو جیون ساتھی کے سامنے بے مثل ظاہر کرنے کی لگن تھی۔ دل میں سو طرح کی تاویلیں ابھرتیں کہ مبادا میرا گمان ہو۔ ایسا نہ ہو کہ میں اپنے خیال کے اظہار کے بعد کوتاہ نظر کہلاؤں یا شکی عورت ہونے کا سرٹیفکیٹ مل جائے لہٰذا عثمان کے استفسار پر وہ اپنا موڈ بحال کرنے کی کوشش کرتی اور سردرد یا تھکن کا بہانہ بنا دیتی۔ پھر ایسا کئی مرتبہ ہوا تو اسے عثمان کے دل پھینک ہونے کا یقین ہو چلا۔

اس روز بڑی آپا کی بچی کی سالگرہ تھی۔ وہ اور عثمان بھی خصوصیت سے مدعو تھے۔ وہ بڑے اہتمام سے تیار ہوئی۔ بہترین کتان کی سبز ساری باندھی۔ بالوں کا اچھا سا اسٹائل بنایا۔ مناسب میک اَپ کیا اور موزوں زیورات سے آراستہ ہوئی۔ عثمان نے نظر ڈالی تو گویا شاعر ہی

ہو گئے۔ اس کی بے تحاشا تعریف کی۔ اس کے حسن کی اس کے سلیقے اور جامہ زیبی کی۔ وہ سُن سُن کر خوش ہوتی رہی بلکہ پھولے نہ سمائی۔

آپا کے ہاں بڑی چہل پہل تھی۔ اعلیٰ پیمانے پر تقریب ہو رہی تھی لہٰذا اسی مناسبت سے اہتمام تھا۔

وہ اپنی سہیلیوں میں گھل مل گئی۔ اس کی کزنز اسے گھیرے پھرتی رہیں۔ عثمان بھی مردوں سے باتیں کرنے میں مصروف ہو گئے۔ معاً اس کی نظر عثمان پر پڑی تو انھیں ایک جانب مستقل دیکھتے پایا۔ ان کی پُرکشش اور چمک دار آنکھیں مسلسل ایک سمت مرکوز تھیں۔ ثوبیہ نے ان کی نظروں کا تعاقب کیا تو دیکھا کہ وہ اس کی دوست حرا کو دیکھ رہے تھے۔ وہ ان کی نظروں سے نروس سی نظر آ رہی تھی۔ ہلکی ہلکی سرخی اس کے چہرے سے چھلکنے لگی تھی۔ ثوبیہ کے تو پیر سے لگی اور سر پر بجھی، ہونہہ! یہ بیچارے اپنی عادت سے مجبور ہیں تو اس کمینی کو تو اس طرح پوز نہیں دینا چاہیے، وہ کھولتی ہوئی حرا کے سر پر جا پہنچی۔

''حرا۔''

''حرا ایک دم چونک پڑی۔ جس ''باس'' کی نظروں سے وہ داد طلب کر رہی تھی، اس کی ''پرسنل سیکرٹری'' اس کے سر پر کھڑی تھی۔ حرا کھسیا سی گئی۔

''ہوں؟'' حرا صرف اتنا کہہ سکی۔

''بھئی اِدھر آؤ، ذرا انتظامات میں ہاتھ بٹاؤ۔ تم تو بالکل ہی پُرتکلف مہمان بن کر بیٹھ گئیں۔'' اس نے جذبات پر قابو پا کر اسے وہاں سے ٹالنا چاہا تو حرا بھی چور چوری فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی۔

واپسی کے دوران میں وہ قطعی خاموش تھی۔

''یقیناً سر درد ہو رہا ہوگا یا تھکن زیادہ ہو گئی ہوگی؟'' عثمان نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اس کی سمت دیکھا۔

''ضروری نہیں کہ بیماریاں بھی لگی بندھی ہوں اور کوئی وجہ بھی ہو سکتی ہے۔'' وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔

عثمان نے عجیب سی نظر اس پر ڈالی۔ ''اس وجہ کا بھی کوئی نام ہو سکتا ہے۔'' وہ بولے۔

''جانے کتنے نام ہوں گے۔ اب کس کس کا نام لوں؟'' ثوبیہ نے سوچا مگر خاموش رہی۔

''بعض عورتیں بہت خوبصورت ہوتی ہیں لیکن بدمزاج ہوتی ہیں۔'' وہ شرارت سے مسکرائے۔

''بعض کیا، آپ کو تو بہت زیادہ کا تجربہ ہوگا۔'' وہ جل بھُن کر خاک ہوتے ہوئے بولی۔

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟'' وہ ونڈ اسکرین پر نظر جما کر بولے۔

''چھوڑیں، میری زبان نہ کھلوائیں۔ میرا موڈ سخت خراب ہے۔'' وہ منہ موڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

''کیوں خراب ہے؟ کوئی وجہ بھی تو ہوگی۔''

''حرا آپ کی بچھڑی ہوئی کزن تھی جسے آپ غور سے پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے؟'' وہ آخر برداشت کی حدوں سے گزر گئی۔

''حرا!'' وہ حیران ہوئے۔ ''کون ہیں یہ محترمہ؟''

''وہی جنھیں مغرب سے عشاء تک آپ نے 'باوضو' دیکھا۔''

''باوضو!'' وہ مسکرائے۔

''لگتا تو ایسا ہی تھا گویا وضو کر کے نیت باندھ کے بیٹھے ہوں۔'' وہ جل کر بولی۔

''ہاہا...... ہاہاہا'' عثمان اپنے قہقہے پر قابو نہ پا سکے۔ ''ہوں۔ تو یہ وجہ ہے خراب موڈ کی۔'' وہ مسلسل مسکرا رہے تھے۔

؎ اچھی صورت پہ غضب ٹوٹ کے آنا دل کا
یاد آتا ہے ہمیں ہائے وہ ....

وہ گنگنائے تو ثوبیہ مزید سُلگ گئی۔ ''ہونہہ۔ ایک تو چوری اس پر سینہ زوری۔''

''ارے یار! اچھی صورت کو دیکھ لینے میں حرج ہی کیا ہے آخر؟'' انھوں نے چھیڑا۔

''لیکن کوئی اچھی صورت دل میں بہت زیادہ جگہ بھی بنا سکتی ہے۔'' وہ تلخی سے بولی۔

''وہ تو بنا چکی ہے۔'' عثمان نے وارفتہ نظر اس پر ڈالی۔

''مت بنایا کریں مجھے۔ میرا دل خوش نہیں ہوتا ان باتوں سے۔'' وہ مسلسل چولہے پر بیٹھی تھی گویا۔

''کیوں اتنی اتنی سی باتوں پر خون جلاتی ہو۔ ارے یار! ہم تو دل و جان سے تمھارے ہیں۔''

''ہاں اس وقت تک جب تک میرے علاوہ دوسری کوئی اچھی صورت نہ ہو۔''

''بدگمانی کے زہر کا کوئی تریاق نہیں۔'' وہ اس کی سمت بہ غور دیکھ کر بولے۔

ثوبیہ خاموش ہوگئی اور اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔



''دراصل ہم لوگ خوشگوار ازدواجی زندگی کے راز، پر اپنے اخبار کے لیے سروے کر رہے ہیں۔''

ان میں سے ایک نے وضاحت کی تو ثوبیہ کی سمجھ میں آیا کہ وہ کیوں آئی ہیں۔

ان دونوں نے اپنی آنکھوں پر سَن گلاسز لگائے ہوئے تھے۔ ثوبیہ انھیں ڈرائنگ روم میں لے آئی اور مشروبات سے ان کی تواضع کرنے لگی۔

''ہم نے یہ وقت اس لیے منتخب کیا ہے کہ اس وقت شوہر حضرات بھی اپنی ڈیوٹیز بھگتا کر آ چکے ہوتے ہیں۔ کیا آپ کے شوہر گھر پر موجود ہیں؟''

''جی بس آنے والے ہیں۔'' وہ بولی تو ایک دم ہی اطلاعی گھنٹی بج اٹھی۔ وہ معذرت کرتی ہوئی باہر آ گئی۔ واقعی عثمان آ گئے تھے۔ اس نے انھیں ''خواتین'' کی موجودگی سے مطلع کرتے ہوئے آمد کی وجہ بھی بتا دی۔

''کیا ہماری زندگی خوشگوار ہے؟'' انھوں نے بریف کیس اسے تھماتے اور مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ لوگ کہاں سے سراغ لگا کر یہاں آئی ہیں؟''

''تو، ناخوشگوار ازدواجی زندگی کے راز، ہی بتا دیجیے گا۔'' اس کا موڈ پھر خراب ہونے لگا۔

عثمان اس کے ہمراہ ڈرائنگ روم میں چلے آئے۔ دونوں خواتین اپنے گلاسز اتار کر میز پر رکھ چکی تھیں۔ ان میں سے ایک خاتون کی آنکھیں بے تحاشا خوبصورت تھیں۔ صحت مند جلد اور روشن و متکلم آنکھیں واقعی سحر انگیز تھیں۔ ثوبیہ نے ڈر کر عثمان کی طرف دیکھا۔ وہ اس سے کہیں زیادہ گہرائی سے خاتون کا مطالعہ کر رہے تھے۔ ساتھ ساتھ مسکراتے ہوئے پوچھ رہے تھے کہ ان کا تعلق کس اخبار سے ہے اور یہ سروے کس سلسلے میں کیا جا رہا ہے؟

جادو اثر آنکھوں والی کی بجائے دوسری خاتون جو گہری رنگت کی تھیں، جواب میں بولیں تو عثمان نے اس طرح دیکھا گویا جیسے انھیں ان خاتون کا ''ٹانگ اڑانا'' بالکل پسند نہ آیا

ہو۔ مخاطب خاتون کی خاموشی کے سبب انھوں نے ''اخلاق بالجبر'' کے طور پر ان گہری رنگت والی خاتون سے تفصیل سنی اور دوبارہ اس ''آہو چشم'' سے مخاطب ہوئے۔ ''آپ کب سے اس اخبار سے منسلک ہیں؟''

''دو سال سے۔'' مختصر سا جواب ملا۔

''آپ یقیناً جرنلزم میں ایم۔اے ہوں گی۔''

''ظاہر ہے۔'' خاتون کو جیسے ان بچکانہ سوالات پر کوفت ہو رہی تھی۔

''یہ ''ہمارا'' انٹرویو کرنے آئی ہیں۔'' آخر ثوبیہ سے نہ رہا گیا تو اس نے عثمان کو یاد دلایا بلکہ جتایا۔

وہ سوال نامہ ساتھ لائی تھیں۔ اس کے حساب سے سوالات کرنے لگیں۔ ثوبیہ بڑی سمجھ داری سے جواب دیتی رہی۔

آخر میں ان گہری رنگت والی خاتون نے عثمان سے پوچھا۔ ''اس دنیا میں آپ کے نقطہ نظر سے بہترین شے کیا ہے؟ دراصل ان سوالات کے جواب سے آپ کی شخصیت کا واضح خاکہ بنانے میں بہت مدد ملے گی۔'' انھوں نے ساتھ ساتھ وضاحت بھی کی۔

''اس دنیا میں مجھے جو چیز سب سے زیادہ پسند ہے، وہ حسین آنکھیں ہیں۔'' عثمان مسکرا کر بولے اور ثوبیہ کا دل چاہا کہ وہ اپنا سر پیٹ ڈالے۔ اس نے سوچا۔ ''صرف آنکھیں ہی نہیں، وہ چہرے بلکہ چوکھٹے بھی جن پر خوبصورت آنکھیں فٹ ہوتی ہیں۔'' ثوبیہ جل بھُن کر کباب ہو رہی تھی۔ آخر اس نے خود ہی اس ملاقات کو کام کا بہانہ کر کے مختصر کیا۔ اسے یہ خوف تھا کہ اس سروے کی ہیڈ لائن یہ نہ ہو۔ ''مسٹر عثمان حسین آنکھیں دیکھ کر ریشہ خطمی ہو جاتے ہیں۔'' اس نے پہلے تو بڑے سلیقے سے عثمان ہی کو ٹالا۔ ''جائیے آپ لباس تبدیل کر لیجیے۔ میں چائے کا انتظام کرواتی ہوں۔''

عثمان با دلِ ناخواستہ وہاں سے اٹھ گئے اور بولے۔ ''جیسے آپ چاہیں۔'' انھوں نے فرمانبردار شوہر کا کردار نبھا کر گویا خوشگوار ازدواجی زندگی کا راز منکشف کر دیا اور ثوبیہ نے سکون و طمانیت کا گہرا سانس لیا۔



وہ کسی کام سے راہداری میں آئی تھی کہ فون کی گھنٹی چیخ پڑی۔ رات نو بجے کا عمل تھا۔

اس نے فون اٹھایا تو بیڈ روم ایکسٹینشن غالباً عثمان نے اٹھالیا تھا۔ شادی کو ساتواں برس لگ چکا تھا لیکن پُراسرار و نامعلوم سے واہمے اب بھی ثوبیہ کو اسی طرح پریشان کرتے رہتے تھے کیونکہ عثمان میں ذرہ برابر تبدیلی نہیں آئی تھی۔

کوئی لڑکی تھی جو بڑی آہستگی سے ہیلو کہہ رہی تھی۔

''ہوں۔'' عثمان نے ہنکارا بھرا۔

''دیکھیے جی میں نے اس نمبر پر رنگ کیا ہے۔'' لڑکی نے نمبر بتایا۔

''یہی ہے۔'' عثمان کی آواز پھر اُبھری۔

''کیا مسٹر عثمان موجود ہیں؟''

''بول رہا ہوں۔''

چند لمحے خاموشی سے گزر گئے۔ پھر لڑکی کی آواز سنائی دی۔ ''پرسوں آپ پراچہ صاحب کے ہاں ڈنر میں ملے تھے۔ میں شگفتہ بول رہی ہوں۔ آپ نے فون نمبر بھی لیا تھا لیکن......''

''اوہ مِس شگفتہ!'' عثمان کو گویا بہت کچھ یاد آ گیا۔ ''دراصل مصروفیت میں یاد ہی نہیں رہا۔''

''آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ آپ کی کمپنی نئے سال کے کیلنڈر چھاپ رہی ہے اور آپ کے ہاں نئے چہروں کی ٹرانسپرنسیز کی ضرورت ہے......''

''فون کرنا بھول گیا تھا مگر باقی سب یاد ہے۔'' عثمان بات کاٹ کر بڑے رومانی انداز میں بولے۔

''عثمان صاحب! آپ کی پرسنیلٹی بھی تو غضب کی ہے۔ کسی سین میں اگر آپ کی ٹرانسپرنسی بھی شامل ہو تو کیلنڈر کافی خوبصورت ہو جائے گا۔'' وہ ہنسی، مدھری ہنسی۔

''ہونہہ! دیدے پھاڑ کر دیکھنے کے علاوہ ان کے پاس اور کون سی ادا ہے۔ اسی ادا کی وجہ سے چڑیل تجھے ان کی پرسنیلٹی ''غضب'' کی لگی ہوگی۔ ثوبیہ نے سوچا اور ریسیور کان سے لگائے رکھا۔ توبہ توبہ یہ آج کل کی چلتا پرزہ لڑکیاں گھروں میں آگ لگانے کے ہنر جانے کہاں سے سیکھ کر آتی ہیں اور انھیں تو دیکھو کیا کنوارے چھیل چھبیلے بنے چہک رہے ہیں۔ اس نے ریسیور آہستگی سے رکھ دیا اور کھولتی ہوئی بیڈ روم میں آ کر عثمان کو گھورنے لگی۔

عثمان نے ایک نظر اس پر ڈالی اور صورتِ حال سمجھتے ہوئے فون پر بولے۔ ''اچھا بھائی خدا حافظ۔'' یہ کہہ کر انھوں نے فوراً ریسیور رکھ دیا۔

ثوبیہ کی ماں کہا کرتی تھی۔ ''اکثر مرد اس بات سے سخت بیزار ہوتے ہیں کہ ان سے ایسے سوالات کیے جائیں کہ اتنی دیر کہاں کر دی؟ کہاں سے آ رہے ہو؟ کہاں چلے گئے تھے یا کس کا فون تھا؟'' ثوبیہ نے کبھی یہ سوالات کر کے اپنے مرد کو نالاں کرنے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن اس کا دل چاہ رہا تھا کہ صاحب کی طبیعت اچھی طرح صاف کر ڈالے۔ پہلے پوچھے کہ کس کا فون تھا، جواب میں غلط بیانی ہو تو پھر خبر لے ڈالے لیکن اس نے نہ جانے کیا سوچ کر خاموشی اختیار کر لی اور چپ چاپ پلٹ گئی۔



عثمان نے بہت دن پہلے اسے بتا دیا تھا کہ ان کا کوئی دوست کسی کام کے سلسلے میں یہاں آ رہا ہے۔ دو چار روز قیام کرے گا۔ آج واقعی وہ آ گیا تھا۔ لمبا چوڑا لیکن عجیب سے حلیے کا مالک۔ اسے الگ تھلگ کمرا دے دیا گیا تھا۔

عموماً اس کا کام ملازمہ ہی کر دیا کرتی تھی۔ اکثر وہ باہر ہی ہوتا تھا۔ اگر اس سے کبھی سامنا ہوتا تو رات کے کھانے پر اور اس وقت وہ اور عثمان اپنے قصے کہانیاں چھیڑ بیٹھتے وہ کمرے میں چلی آتی۔ عثمان نے بتایا کہ وہ پڑھا لکھا زمیندار ہے اور زمینوں ہی کے سلسلے میں آیا ہوا ہے۔ ثوبیہ کو اس سے مطلق سروکار نہ تھا بلکہ اس کے بارے میں جاننے کا ہلکا سا شوق بھی نہیں تھا۔

آج وہ ایک منگنی کی تقریب میں گئی تھی۔ عثمان نے جانے سے انکار کر دیا تھا کہ کام زیادہ تھا اور یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہ رات کا کھانا باہر ہی کھائیں گے۔ رات نو بجے وہ گھر لوٹی تو یہی فکر تھی کہ خدا جانے مہمان کب آیا ہوگا۔ کھانا بھی کھایا ہوگا یا نہیں؟ اس نے ابھی انگوٹھیاں ہی اتاری تھیں کہ یہ خیال آتے ہی وہ مہمان کے کمرے کی طرف چلی آئی۔ خوبصورت ساری کا آنچل اچھی طرح لپیٹ لیا۔ وہ بستر میں دھنسا ہوا تھا۔ انگلیوں کے بیچ سلگتا سگریٹ تھا اور دوسرے ہاتھ میں تاش کی گڈی۔

''اوہ۔'' وہ اسے دیکھ کر سنبھل گیا۔

''عثمان تو آج دیر سے لوٹیں گے۔ پتا نہیں آپ کب آئے ہوں گے اور کھانا بھی کھایا ہے کہ نہیں! یہی پوچھنے آئی ہوں۔''

"جی شکریہ۔ آپ گھر پر نہ بھی ہوں، تب بھی موجود ہوتی ہیں۔ اپنے پیچھے کافی سارے احکامات جو چھوڑ جاتی ہیں۔ ملازمہ نے کھانا کھلا دیا ہے۔"

"آپ اکیلے ہی تاش کھیلتے ہیں؟" وہ جاتے جاتے رُک کر حیرت سے بولی۔

"کھیلتا ہوں لیکن اکیلے نہیں۔ مجھے دنیا میں صرف اسی کا جنون ہے۔ میں نے شوق نہیں جنون کہا ہے۔ میں جواری ہوں، نوسر باز ہوں۔ صرف کھلاڑی نہیں۔"

ثوبیہ کو اس کے سچ سے خوف سا آنے لگا لیکن اس نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی کہ اس نے کبھی ارادتاً اسے نہیں دیکھا۔ نظر پڑی بھی تو بے حد بے تاثر، کہیں اور پہنچی ہوئی۔ اب جبکہ وہ اس قدر سجی سنوری اس کے سامنے تھی تو بھی اس کی بے نیازی کا وہی عالم تھا گویا اس کا چہرہ "اچھا چہرہ" نہ ہو۔

"دراصل میں کھیل نہیں رہا تھا چونکہ نوسر باز ہوں اس لیے نئی نئی تکنیک سوچتا رہتا ہوں۔" وہ سادگی سے مسکرا دیا اور جھک کر سگریٹ کی راکھ جھاڑی، وہ تیزی سے باہر نکل آئی۔

وہ کافی دن رُکا رہا۔ اچھا خاصا بے تکلف بھی ہو گیا تھا۔ گھر میں آنے جانے والوں سے بھی سابقہ پڑ جاتا تھا لیکن اس کی "نظریں" ہر امتحان سے سرخرو آئیں۔ "عجب مگن سا شخص تھا۔ ہر وقت کسی نہ کسی دُھن میں گم اطراف سے بے نیاز۔"



شگفتہ ان لڑکیوں میں سے نہیں تھی جو محض "دیکھنے" سے تسکین پا جاتی ہیں۔ وہ ہاتھ دھو کر عثمان کے پیچھے پڑ گئی تھی۔ ہر بار ان کی بولتی نظروں کے پیغام یاد دلاتی تھی۔ اسی کی بنا پر جھگڑوں نے طول پکڑا۔ ثوبیہ میکے چلی آئی اور اپنے اس اقدام کو حق بجانب قرار دیا کہ یہ تو بہت پہلے ہو سکتا تھا، بس اس کے صبر سے گاڑی چلتی رہی۔ عثمان کا کہنا تھا کہ وہ دونوں بیویوں سے انصاف برتیں گے۔ یہ سن کر تو وہ بھڑک ہی اُٹھی۔ وہ تو سمجھ رہی تھی کہ عثمان اسے منانے کے لیے پیچھے پیچھے چلے آئیں گے۔ نہ کہ دوسری شادی کی خبر دینے۔ اس نے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ شیر کو تازہ شکار مطلوب تھا۔ بھوک میں کچھ سجھائی نہیں دیتا سو اس کا مطالبہ مان لیا گیا۔ ان کی نظروں کے دام سے آزاد ہو کر ثوبیہ کو ایک طرح کا سکون ملا۔ اس نے سوچا اب جو چاہیں کریں میری بلا سے۔



عثمان احمد صاحب!

اگرچہ آپ کا اور میرا کوئی واسطہ ہے نہ تعلق، پھر بھی یہ چند باتیں آپ کے گوش گزار کرنا چاہوں گی۔

عورت کو چار دیواری کے تحفظ کے علاوہ سچی محبت بھی میسر آ جائے تو وہ کسی قربانی سے دریغ نہیں کرتی۔ آپ دوسری شادی کر سکتے ہیں تو یہ حق مجھے بھی حاصل ہے۔ وہ آپ کا دوست کہہ رہا تھا کہ یہ بددیانتی نہ ہو۔ میں نے اسے بتایا کہ اب میں بیگم عثمان نہیں ہوں۔ میں نے اس کا انتخاب بڑی جرأت سے از خود کیا ہے۔ عثمان صاحب! نظر باز سے نوسر باز اچھا۔ کم از کم اعصابی دباؤ سے تو مجھے رہائی مل گئی ہے۔

والسلام

فقط ثوبیہ



جوگن

''ارے وہ ایک دم پیچھے سے سامنے آ گئے۔ میں تو جیسے مر ہی گئی۔'' خاندان کی سب سے بودی، بزدل 1857ء کا بچا کھچا نمونہ، قسم کی مدھو آپی اپنی نوزائیدہ منگنی کے فوراً بعد پڑنے والی افتاد اس طرح سنا رہی تھیں، جیسے جیمز بانڈ کی سسپنس سے بھرپور فلم کا کلائمکس چل رہا ہو۔

''اچھا خیر...... پھر آپ زندہ کیسے ہوئیں؟ کسی مسیح موعود نے پھونک ماری یا ہاتھ پھیرا؟'' افشاں نے سیب کو دانتوں سے بھنبھوڑنے کے بعد جیسے سسپنس سے اکتا کر کہانی کو آگے بڑھانا چاہا۔

''اُف خدایا!'' مدھو آپی تو حیا سے دُہری ہو گئیں۔ ''ہاتھ پھیرنے'' جیسا نازیبا اور غیر سنسر شدہ جملہ تو انھیں جیسے زمین میں ہی اتار گیا۔

''کہیں سے تھوڑی بہت شرم اُدھار لے لو۔ اس گھر میں تو کوئی بھی تمھارے جتنا منہ پھٹ نہیں۔'' مدھو نے واقعی بہت محسوس کیا تھا۔

''مجبوری یہ ہے آپی! اس گھر میں تو مجھے کوئی ''صاحبِ نصاب'' نظر نہیں آتا۔ سب کا اپنا گزارا ہو جائے تو یہی بہت ہے۔ آپ کے پاس حیا کی ڈھیر ساری دولت ہے۔ اس کی زکوٰۃ نکالیں تو اس غریب مسکین کا خیال رکھیے گا۔'' افشاں نے اختتامی مراحل سے گزرتے سیب کا جائزہ لیا کہ اب کس زاویے سے منہ مارا جائے۔

''چھوڑیں آپی! آپ بات آگے بڑھائیں۔ پھر کیا ہوا؟'' نگار کی آتشِ شوق طوالت سے مزید بھڑک گئی تھی۔ اس نے کوفت بھرے انداز میں افشاں کو گھورا تھا جس کی وجہ سے کہانی درمیان میں ٹھہر گئی تھی۔

''پھر نصر بھائی نے کچھ کہا بھی؟''

''اُف اللہ۔ اگر وہ کچھ کہتے تو میں کیسے سنتی؟ میں تو بھیا بھاگ لی وہاں سے۔'' ان کا چہرہ لالوں لال ہو گیا۔

''پھر وہ آپ کے پیچھے بھاگے؟'' افشاں اتنی سادہ سی کہانی کی توقع نہیں کر رہی تھی، اس کا خیال تھا، ابھی مزید موڑ باقی ہیں۔

''لاحول ولا قوۃ۔ وہ کیوں میرے پیچھے بھاگتے؟'' ان کے نپے تُلے باضابطہ قسم کے مزاج پر پتھر کی طرح لگا یہ جملہ۔

''اچھا پھر تم وہاں سے بھاگ آئیں؟'' بیلا نے فلاور میکنگ کے عمل کے دوران ایک جملہ ادا کر کے یہ احساس دلانے کی کوشش کی کہ وہ بھی مجلس میں حاضر ہے۔ نہ صرف حاضر ہے بلکہ متوجہ بھی ہے۔

''پھر کیا ہوا؟'' سعدیہ کا اشتیاق سوا تھا۔ اگلے مہینے اس کی بھی منگنی ہونے والی تھی۔

''ارے کیا ہو گیا ہے تم لوگوں کو؟ جب میں وہاں سے آ گئی تو بات ختم، اب کیا ہونا تھا؟'' مدھو تو اس پھر پھر کی گردان سے جیسے جل کر رہ گئیں۔

''اوہ!'' افشاں نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے گہرا سانس لیا۔ ''آپ کی اسٹوری تو ''فارمولا اسٹوری'' بھی نہیں ہے۔ یہ تو ایسی مظلوم و بے چاری سی کہانی ہے جس کے مصنف کا کہانی لکھنے کے دوران ہی انتقال پُرملال ہو گیا ہو۔ اور کہانی اَن کہی رہ گئی ہو۔''

''فلمیں کم دیکھا کرو۔'' مدھو نے بُرا مان کر اسے درمیان میں ہی ٹوک دیا۔ ان کے نزدیک تو منگیتر سے تصادم بھی ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ ان کے تو رگ و پے میں ابھی تک سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ اور ان سب کے نزدیک یہ کوئی بات ہی نہیں تھی۔

''بہرحال...... خاک ڈالو اس سارے قصے پر۔ یہ بتاؤ چل رہی ہو بازار؟'' بیلا نے گویا اپنا کام تقریباً مکمل کر لیا تھا۔

''نگار کو لے جاؤ۔ میرا موڈ نہیں ہے۔'' افشاں نے ان کی زندگی کے رنگین تصادم کو بے وقعت کر کے واقعی ان کا موڈ خراب کر دیا تھا۔

''شی......!'' افشاں نے خاموش رہنے کا اشارا کیا اور دروازے کی سمت توجہ مبذول کرائی۔ روحی آپی اپنی نئی چوڑیوں کو چھنکاتی مسکراتی آ رہی تھیں۔

''آپی...... چچا کہہ رہے تھے۔ ان کا بجٹ بگڑ رہا ہے۔ آپ کی چوڑیوں کی وجہ سے۔'' افشاں نے ان کے مسکراتے چہرے پر شرارت بھری نظر ڈالی۔

''اچھا۔ مگر چوڑیاں تو ہم اپنے جیب خرچ سے پہنتے ہیں۔ چچا جان نے ہمارے

سامنے تو کبھی اعتراض نہیں کیا۔" وہ حیرت سے افشاں کو دیکھنے لگیں۔

"جو لوگ اسراف ناپسند کرتے ہیں، وہ یہ نہیں دیکھتے کہ جیب خرچ ضائع ہو رہا ہے یا قومی خزانہ؟" نگار نے ان کی خوبصورت چوڑیوں پر پسندیدگی کی نظر ڈالی۔

"وہ جو تائی جان نے درجن بھر سونے کی چوڑیاں آپ کو بنوا کر دے رکھی ہیں، وہ کیوں نہیں پہنتیں؟" افشاں کی نظر میں ان کی ایک سے ڈیزائن والی درجن بھر چوڑیاں چمکتی رہتی تھیں۔

"وہ تو ہم تقریبات میں پہنتے ہیں۔" وہ بے نیازی سے صوفے پر دراز ہو گئیں اور اپنی چوڑیوں سے کھیلنے لگیں۔

"آپ کب تک اپنی چوڑیوں سے خود ہی کھیلتی رہیں گی؟ دل نہیں چاہتا، کوئی ان حسین چوڑیوں سے کھیلے؟" سعدیہ نے شرارت سے ان کو دیکھا تھا۔

وہ ساکت سی ہو کر سعدیہ کی شکل دیکھنے لگیں۔ "ہم سے اس طرح کی باتیں نہ کیا کرو سعدی۔ تمھیں پتا ہے، ہمیں عارضی خوشیوں کے مقابلے میں مستقل غم پسند ہے۔ ہم ہمیشہ خوش رہنا چاہتے ہیں۔ خدا نہ کرے کہ ہم عارضی خوشی سے دوچار ہوں۔ کہو۔ آمین۔" ان کے لہجے میں یکدم تحکم ابھر آیا۔

"آمین۔" وہ سب تو چپ رہیں۔ افشاں کے منہ سے مگر آمین نکل گیا۔ نگار اس کو گھور کر رہ گئیں۔



واصف بھیا ہائر اسٹڈیز کے لیے امریکہ سدھار رہے تھے۔ گھر والے تو تھے ہی اس پر مستزاد پھوپھیاں اور ان کے بچے بھی انھیں الوداع کہنے کے لیے دو دن پیشتر آ موجود ہوئے تھے۔

"واصف بھیا آپ تو اب نہیں لوٹیں گے۔ جس کو "امریکیا" ہو جائے اسے پھر اس مرض سے مشکل ہی سے نجات ہوتی ہے۔" ان کی پھوپھی زاد گوہر نہ جانے ان کے منہ سے کیا سننے کی متمنی تھیں۔ اپنی دانست میں انھیں چھیڑ رہی تھیں۔

"اللہ نہ کرے۔ اللہ کرے میرے بھیا ساتھ خیریت کے واپس آئیں۔" نگار نے ناگواری سے گوہر کی طرف دیکھا۔ "آپا! کسی کو الوداع کہتے ہوئے بدفالیں منہ سے نہیں

نکالتے۔" وہ لہجے پر کنٹرول کر کے آخر کہہ ہی بیٹھیں۔

"بدفال نہیں ہے یہ۔ آج کی زندہ حقیقت ہے۔" گوہر کو ہار ماننا نہیں آتی تھی۔

"انشاء اللہ۔ میرا بیٹا کامیاب ہو کر بہت جلد ہمارے درمیان ہوگا۔" عائشہ نے اپنے اکلوتے بیٹے کو محبت اور جدائی کے جذبات سے افسردہ نگاہوں سے دیکھا۔

"اچھا یہ بتایئے لوٹ کر بدھو جب گھر کو آئیں تو آپ سب کے لیے کیا لائیں؟" واصف اپنی پیکنگ مکمل کر کے اطمینان سے ان سب کے قریب آ بیٹھے۔

"وہ اشیاء تو ہرگز نہ لیجیے گا جو یہاں بھی تھوک کے بھاؤ مل جاتی ہیں۔" سعدیہ نے حفظ ماتقدم کے تحت فوراً کہا۔

"روحی آپی! آپ بھی اپنی فرمائش نوٹ کرا دیجیے۔" افشاں کی پھر رگ پھڑکی۔

"کیا ان کے جانے کے بعد فون و خط و کتابت کا سلسلہ نہیں چلے گا۔ ایسی جلدی کیا ہے؟" وہ بہت انہماک سے گڑیا کا غرارہ سی رہی تھیں۔ پندرہ بیس گڑیاں تھیں ان کے کمرے میں جن میں "فینسی ڈریس شو" قسم کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔

"آپی سے فرمائش پوچھنے کا کیا فائدہ۔ بلکہ ضرورت ہی نہیں۔ یہ تو ظاہر ہے، چوڑیاں ہی منگوائیں گی۔ کیوں آپی؟"

"مگر ہم امریکہ سے چوڑیاں نہیں منگوائیں گے۔ امریکیوں کی شکلوں کی طرح بے رونق ہی ہوں گی۔" انھوں نے سلائی کا سلسلہ روک کر افشاں کو جواب دینے کی فرصت نکالی۔ کمرے میں قہقہے گونجے۔

"ایسی نادان نہیں آپی کہ ہر کس و ناکس سے چوڑیاں منگوانے لگیں۔ چوڑیاں تو خاص بندہ تحفے میں دے تو مزا ہے۔" گوہر کھلکھلائیں۔

"کیوں بھابی؟" انھوں نے کمرے میں داخل ہوتی رخشی بھابی کو گھیرا۔ جو بہت کچھ سن چکی تھیں۔

"مجھے کیا پتا بھئی۔ ہمارے تو کسی نے ایسے چونچلے کبھی نہیں کیے۔ خود ہی پہنی ہیں ہمیشہ۔"

انھوں نے کلس کر بڑے زہریلے انداز میں گڑیا کا غرارہ سیتی ہوئی روحی کی طرف دیکھا پھر پنسل اسکیچ سے بنے پورٹریٹ کی طرف اس طرح دیکھا جیسے وہ بے جان اسکیچ نہ ہو، ان

کے شوہر نامدار مسعود شاہ ہوں اور وہ انھیں کچھ جتا رہی ہوں۔ یہ اسکیچ مسعود شاہ کے ایک مصور دوست کا تحفہ تھا۔ شاید اسی لیے ڈرائنگ روم کی آرائشی اشیاء کا حصہ تھا۔

''آپ نے کبھی بھائی جان کو دھیان ہی نہیں دلایا ہوگا اس طرف۔'' نگار نے بھائی کی سائیڈ لینے کی کوشش کی۔

''لو......اور سنو تحفے بھی دھیان دلا کر بٹورے جاتے ہیں۔ یہ تو خوشی کا سودا ہوتا ہے بی بی! تمھارے بھائی کو سارے دھیان پہلے سے ہیں۔ انھیں کچھ سکھانے سمجھانے کی ضرورت نہیں۔'' انھوں نے تلخی سے کہا اور ہاتھ میں پکڑی فیڈر شیرخوار کے منہ میں جیسے ٹھونس دی۔

''بھئی، یہ کیا بے معنی سی باتیں شروع کر دیں۔ ہم تو چوڑیوں پر معلوماتی بحث کر رہے تھے۔'' افشاں نے گویا تصادم کا خطرہ ٹالا تھا۔

''آپ لوگوں کو روحی آپی سے اس طرح کی چھیڑ چھاڑ نہیں کرنی چاہیے۔ تائی اماں کو کتنی مشکل ہو جاتی ہے۔ پھر یہ آسانی سے دوا بھی نہیں کھاتی ہیں۔'' واصف نے دبی زبان میں جیسے ان سب کو فہمائش کی تھی۔

''وہ تو خود بہت خوش ہوتی ہیں چوڑیوں کے تذکرے سے۔'' سعدیہ نے کہا۔

''یہ تو ایسا ہی ہے جیسے آپ سب مل کر انھیں پاگل سمجھتے ہوئے مذاق اُڑا رہے ہوں۔'' واصف کو جیسے روحی پر بہت ترس آ رہا تھا۔

''اچھا چلیں آپ اپنا موڈ خراب نہ کریں۔ اب نہیں کریں گے اس طرح کی باتیں۔'' افشاں نے امن عامہ کے قیام میں آگے بڑھ کر حصہ لیا۔

''واصف!'' روحی نے سوئی میں دھاگا ڈالنے کا پروگرام موقوف کر کے واصف کو مخاطب کیا۔

''جی!'' وہ ان کے قریب آ بیٹھے۔

''بھئی، تم تو وہیں کسی امریکن سے شادی کر لینا۔ ان کے ہاں تو چوڑیوں ووڑیوں کے شگن ہی نہیں کیے جاتے۔ کسی عورت کی چوڑیاں ٹوٹتی ہیں تو اس کی ساری ہنسی ہی ٹوٹ جاتی ہے۔'' انھوں نے بڑی عالمہ فاضلہ بن کر واصف کو مشورہ دیا۔

''اگر عورت چوڑیاں پہننا پسند نہ کرتی ہو تو کیا اس کے بیوہ ہونے کا خطرہ ہمیشہ کے لیے ٹل جاتا ہے؟'' واصف مسکرا دیے۔

''جن کلائیوں کو چوڑیوں کی عادت ہو، وہ ننگی ہو جائیں تو بہت ستاتی ہیں۔ تمھیں کیا پتا؟'' وہ افسردگی سے پھر سلائی کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

''ہاں ٹھیک ہے، اگر مجھے بیوگی کا تجربہ نہیں تو آپ بھی تو اس طرح کے کیس میں ناتجربہ کار ہیں۔'' واصف ہنس دیے۔

''ارے ان کا تو دماغ اوندھا ہے، تم بھی بہک جاتے ہو۔ کیسی منحوس باتیں شروع کر دی ہیں۔'' رخشی بھابی تو جیسے بلبلا اٹھیں۔

''بیٹھے ہنس رہے ہو، تم پر بلا لا رہی ہے۔ امریکن کی چوڑیوں کی فکر پڑی ہے۔ یہ نہیں سوچ رہی ساری نحوست بھائی پر آ رہی ہے۔ میرے منہ میں خاک۔ تمھیں کچھ ہوگا تو تمہاری بیاہتا پر کوئی دکھ پڑے گا۔ اللہ تمھیں سلامت رکھے۔ جس کے بھاگ تمھارے ساتھ جاگیں، وہ سدا سہاگن رہے۔''

''بھابی! کیوں جان جلاتی ہیں اپنی؟ ان بے چاری کا تو ذہنی توازن......''

''تو کسی پاگل خانے میں ڈلوا دو۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوتیں یہ منحوس باتیں۔'' واصف نے بھابی کو بیچ میں ٹوک دیا تھا تو انھوں نے بھی واصف کی بات مکمل نہ ہونے دی۔

''دُلہن! بُری بات ہے بھابی سنیں گی تو انھیں رنج ہوگا۔'' عائشہ کو بالآخر مداخلت کرنا پڑی۔

''ہم تو انسان ہی نہیں ہیں امی۔ سارے رنج انھیں ہوتے ہیں یا ان کی امی کو ہونہہ۔ ہزار دفعہ کہا ہے، الگ مکان لے لیں۔ پاگل ہمارے سر منڈھ رکھے ہیں مگر ہماری سنیں کیوں؟ پاگل ہیں تو کیا ہوا۔ کسی کا دل تو لگا ہوا ہے۔'' وہ بچے کو شانے سے ٹکا کر بڑبڑاتی ہوئی باہر نکل گئیں۔

........❁........

''بھئی، ہزار مرتبہ کہا ہے، میرے کمرے میں مت آیا کرو۔ میرے پاس فالتو بھیجہ نہیں ہے جو تمھارے ساتھ کھپاؤں۔''

''ہم تو ہنی سے کھیل رہے تھے بھابی!''

''بخشو بی بی مجھے۔ تمہاری تو عمر پڑی ہے کھیل کود کے لیے۔ جب یہ چلنے پھرنے لگے گا تو کھیل لینا، مگر میرے کمرے میں مت آیا کرو۔ سارے گھر میں تو تم آسیب کی طرح

چھائی ہوئی ہو۔ ایک یہ کمرا ہی تو میری پناہ گاہ ہے۔ جاؤ خدا کے لیے یہاں سے۔'' وہ بُری طرح جھلا رہی تھیں۔

''کیا بات ہے رخشی! یہ تم اس سے کس طرح بات کر رہی ہو؟'' مسعود شاہ باتھ روم سے باہر آ کر بیوی کے اطوار پر شدید حیرانی کے عالم میں کھڑے تھے۔

''اور کس طرح بات کروں؟ کبھی کبھی میرا بھی دل چاہتا ہے کہ ایک گوشہ تنہائی میں چند سانس سکون کے لے لوں۔ جب دیکھو کوئی نہ کوئی سر پر سوار۔''

''مجھے نہیں چاہیے تفصیل۔ صرف یہ پوچھ رہا ہوں تم اس سے بات کس انداز میں کر رہی ہو؟ یہ اس گھر کا سب سے بے ضرر وجود۔'' مسعود شاہ تولیہ بیڈ پر پھینک کر برہمی سے مخاطب ہوئے۔

''ہونہہ۔ سب سے بے ضرر وجود۔ سب سے بڑی جونک میری شہ رگ سے چمٹی ہوئی۔'' رخشی بڑبڑائیں۔

''تمھیں اچھی طرح جان لینا چاہیے۔ جو رشتہ بھی میری ذات سے وابستہ ہے۔ تمھیں اسے اتنی ہی امپورٹینس دینا ہوگی جتنی میری خواہش ہے اور یہ اس لیے کہ مجھے پتا ہے۔ اس گھر میں مجھ سے اور میری وجہ سے تم سے کس قدر محبت کی جاتی ہے۔ میری چھوٹی چھوٹی خوشی کا خیال رکھا جاتا ہے تو اس کا جواب تم اس طرح سے دوگی؟ جبکہ یہ بے چاری تو ابنارمل ہے۔'' انھوں نے بہت دُکھ سے روحی کی طرف دیکھا۔

''اور شاید آپ بھول گئے ہیں، یہ آپ ہی کی وجہ سے ابنارمل ہوئی۔ جوگ لیا ہے اس نے آپ کے نام پر۔''

''شٹ اَپ!'' مسعود شاہ دھاڑے۔

روحی انھیں الجھتا دیکھ کر باہر نکل گئی تھیں۔

''یہ ایک معصوم اور پاک سیرت لڑکی ہے۔ اس کے متعلق بات کرتے ہوئے آئندہ احتیاط سے کام لینا۔ ورنہ۔''

ورنہ۔ شوہر غصے کی آخری حدوں کو چھوتے ہوئے ''ورنہ'' کہہ کر چپ ہو جائے تو ہوش مند بیوی ''ورنہ'' کا مطلب نہیں پوچھتی اور نہ ''ورنہ'' سے آگے گفتگو بڑھانا پسند کرتی ہے۔ رخشی کا اگرچہ خون کھول رہا تھا۔ مگر مسعود شاہ کے غضبناک انداز انھیں کسی ممکنہ خطرے کی پیشگوئی

کرتے محسوس ہو رہے تھے۔

اور یوں بھی جس عورت کو شوہر کی وفا اور محبت پر شک یا تذبذب رہتا ہو، وہ کمتری کے احساس سے ہمہ وقت دوچار رہتی ہے۔ بے بنیاد خطرات کی تلوار اسے ہمہ وقت سر پر لٹکتی محسوس ہوتی ہے۔ یہی...... بے اطمینانی و بے اعتمادی اس کی زندگی کا سارا حسن، سارا رس چوس لیتی ہے۔ نہ وہ محبت دینے کے قابل رہتی ہے نہ لینے کے۔ اور جو عورت اپنے مرد کو اپنی فطرت محبت سے سیر نہیں کرتی۔ وہ اپنے پاؤں پر خود ہی کلہاڑی مارتی ہے۔ وہ اگر کسی نئی عورت کو نہیں اپناتا تو اس کا بھی نہیں رہتا۔ عجیب سے فاصلے درمیان میں در آتے ہیں۔

دل اُجاڑ، دماغ بنجر، زبان بول۔ بالآخر نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ مرد ''ورنہ'' سے آگے کا ٹکڑا جوڑ کر جملہ مکمل کر دیتا ہے۔

جملہ مکمل ہو جاتا ہے۔

ذات ادھوری...... رہ جاتی ہے۔

مگر مسعود شاہ بہت مضبوط آدمی تھے۔ انھیں غیض وغضب کے عالم میں بھی دھیان رہتا تھا کہ ''عزت'' وہ کمائی ہے جو ایک بار لوٹ لی جائے تو پھر عمر بھر جمع نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی اس معاشرے کا المیہ ہے۔ بہت سی خوبصورت اور زیادہ جہیز والی بیویاں بہت سے معقول مردوں کی زندگی کو مستقل، المیہ بنا ڈالتی ہیں اور وہ ''عزت'' کی خاطر ''سب اچھا ہے'' کی رپورٹ دیتے پائے جاتے ہیں۔

انھیں بچپن میں پڑھی یا سنی ہوئی وہ کہانیاں یاد آنے لگتی ہیں جن کے اختتام پر لکھا ہوتا تھا یا بتایا جاتا تھا کہ ''راوی آگے چین لکھتا ہے'' اور ایک آہ سردان کے سینے سے آزاد ہوتی ہے اور وہ سوچتے ہیں انھیں ''چین'' کے ہجے بھی یاد ہیں یا نہیں؟

انھی آفت زدگان میں مسعود شاہ کا شمار بھی ہوتا تھا۔ رخشی خوبصورت بھی تھیں۔ اور ''جہیز یافتہ'' بھی، ڈگری نے ان کا کچھ نہ بگاڑا تھا۔

اگر ان کی بڑی بہن میاں سے لڑ کر میکے میں پڑاؤ نہ ڈالے ہوتیں تو شاید آج وہ اتنی احتیاط سے کام نہ لیتیں۔ مسعود شاہ کو ایک بار سبق تو سکھا ہی دیتیں۔ مگر پرسوں ممی سے بات ہوئی تھی فون پر۔ وہ ان کی بڑی بہن کے گھریلو جھگڑے کی وجہ سے بیمار پڑ چکی تھیں۔ ان کا بلڈ پریشر مستقل ہائی ہو رہا تھا۔

اس لیے رخشی نے اپنا ''پروگرام'' ملتوی کر دیا تھا۔ اب خاموشی سے ہنی کو گود میں بھر کر کمرے سے باہر چلی گئی تھیں مگر خون آشام نظروں سے اس طرف دیکھنا نہ بھولی تھیں جس طرف روحی کی موجودگی کا احتمال تھا۔

............⚜............

واصف کی فلائٹ رات دو بجے کی تھی۔ چند قریبی کزنز بھی آ موجود ہوئے تھے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد ڈرائنگ روم میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ پہلے تو تاش و کیرم کھیلے گئے، پھر بھی ٹائم پاس نہ ہوا تو بیت بازی کی محفل جم گئی۔ لڑکیاں بھی نماز پڑھ کر ہنگامے میں شامل ہو چکی تھیں۔

روحی البتہ سارے ہنگامے سے الگ تھلگ ایک موڑھے پر بیٹھی ایک بڑی سی گڑیا گھٹنوں کے بیچ دبوچے اس کے ریشمی بالوں میں پراندہ ڈال رہی تھیں۔ ریشم و پوت سے یہ پراندہ ان کی تازہ ترین تخلیق تھی۔

''ارے آپی! آپ تو ویسے بھی بڑی ادبی قسم کی چیز ہیں۔ آیئے ناں بیت بازی کی محفل شروع ہے۔'' واصف کے خالہ زاد رافع نے روحی کو دعوت دی۔

''بھئی، سب کچھ پڑھنے کی حد تک ہے۔ یہ بیت بازی وغیرہ مجھے پسند نہیں۔'' انھوں نے گڑیا کا رُخ اپنی طرف کرنے کے بجائے خود آگے چہرہ کر کے گڑیا کے بالوں کی سیٹنگ دیکھنے کی کوشش کی جیسے وہ گڑیا نہ ہو۔ کوئی بھاری بھرکم قسم کی لڑکی ہو جسے آسانی سے اپنی طرف گھمایا نہ جا سکے۔

''یہ کیا بات ہوئی؟'' رافع نے انھیں پھر متوجہ کیا۔

''بھئی، اپنی اپنی فطرت ہوتی ہے۔ ہر انسان کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ تم نے شاید پڑھا یا سنا ہو۔ افلاطون نے کہا تھا فطرت آزاد اور غلام الگ الگ پیدا کرتی ہے۔ ہر ایک کا اپنا اندازِ فکر ہوتا ہے۔ ایک چیز کسی کو پسند ہوتی ہے تو دوسرے کو ناپسند۔'' ان کی تو عام باتیں ہی بڑی عالمانہ و فاضلانہ ہوتی تھیں اس پر سے ان کی شان بے نیازی۔

''اور آپ کو یہ بھی پتا ہوگا کہ اسی ''نظریے'' کی مخالفت پر سقراط کو زہر کا پیالہ پینا پڑا تھا؟'' رافع کو ان سے الجھنے میں بڑا مزا آتا تھا۔

''تو پھر ہوئی ناں۔ اپنی اپنی سمجھ اور پسند کی بات۔'' وہ جیت جانے کے احساس سے

بڑے افتخار سے مسکرائیں۔

''جی نہیں۔ افلاطون نے واقعی غلط کہا تھا۔ انسان کوشش کرے تو خاطر خواہ تبدیلی عمل میں آسکتی ہے۔'' رافع کب ہار ماننے والا تھا۔

''ہم ڈرائنگ روم میں ہیں یا ''ایتھنز'' میں۔ افلاطون و سقراط کے حمایتیوں و مخالفوں میں ٹھن گئی ہے۔'' واصف بھیا مسکرا دیے۔

''کس بحث میں اُلجھ گئے ہیں۔ رافع بھائی! چلیں شروع کریں۔'' بیلا کو تو بیت بازی میں بڑا لطف آتا تھا۔

بیت بازی شروع ہوئی۔ لڑکیوں اور لڑکوں کی دو ٹیمیں تھیں۔ اس قدر غل غپاڑہ مچا کہ توبہ ہی بھلی۔ ہار ماننے والی تو کوئی ٹیم بھی نہیں تھی۔ مقابلہ اس قدر طویل ہوا کہ ''اسٹاک ایکسچینج'' میں مندی کا رجحان پیدا ہونے لگا۔ مطلوبہ شعر خاصی دیر بر آمد ہونے لگا۔

آخر ایک جگہ لڑکیوں کی گاڑی اٹک گئی۔ حرف ''الف'' کا استعمال دونوں طرف سے اس قدر رہا کہ دوسرے حروف سے شروع ہونے والے اشعار تو یاد آ رہے تھے مگر ''الف'' سے شروع ہونے والا یاد نہیں آ رہا تھا۔ لڑکے انھیں سوچ میں ڈوبا دیکھ کر فتح کا جشن منانے کی تیاریاں کرنے لگے۔

؎ ابھی سے دل و جاں سر راہ رکھ آئیں
کہ لٹنے لٹانے کے دن آ رہے ہیں

روحی اپنی گڑیا تھام کر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔
بہت ہمدردی سے مسکرا کر انھوں نے لڑکیوں کی ''مدد'' کی تھی۔
''واہ واہ روحی آپی زندہ باد۔'' لڑکیاں خوشی سے چیخ پڑیں۔

''روحی آپی مقابلے میں شامل نہیں تھیں۔ یہ دھاندلی ہے۔'' واصف کا ایک اور خالہ زاد ندیم چیخ اٹھا۔

''مگر بہرحال وہ لڑکی ہیں۔'' افشاں نے اطمینان سے کہا۔
''مگر رولز و ریگولیشن میں لکھا ہے کہ......''
''جی نہیں۔''
''جی ہاں۔''

وہ چیخ و پکار شروع ہوئی کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دی۔ مسعود شاہ بھی اندر آ گئے۔ پیچھے پیچھے چائے، کافی کی ٹرالی دھکیلتی رخشی بھی۔

''کیا مسئلہ ہے بھئی؟'' مسعود شاہ کو اندازہ تو تھا کہ ہوگی کوئی شرارت۔ کہ باقاعدہ طور پر سب شریر تھے۔

''آپ ہی انصاف کیجیے مسعود بھائی!'' رافع نے دہائی دی۔

''اچھا بابا بات تو بتاؤ'' وہ ہنستے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئے۔ واصف نے قصہ بیان کرنا شروع کیا۔

رخشی سب کی طرف باری باری کپ بڑھانے لگیں۔

''اوہ! یہ بات ہے۔'' تفصیل سن کر انھوں نے روحی پر ایک نظر ڈالی۔

''روحی آپی کی وجہ سے سارا کھیل تلپٹ ہوا'' ندیم نے شکایتی انداز میں کہا۔

''ہونہہ...... دیکھتے جائیے، ابھی تو ان کی وجہ سے جانے کیا کیا تلپٹ ہوگا'' رخشی کے لہجے میں اتنا زہر تھا کہ مسعود کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

''انصاف ہونے تک آپ نہیں جاسکتیں۔'' رافع نے روحی کو باہر جانے سے روکا۔

''اسی بہانے کچھ دیر۔ یہاں بیٹھو بی بی! عدالت لگ رہی ہے۔'' رخشی بھابی کی طنزیہ ہنسی مسعود شاہ اچھی طرح سمجھتے تھے۔

...........❁...........

دس کمروں کی اس دومنزلہ عمارت میں تین بھائیوں کے خاندان آباد تھے۔

سب سے بڑے حمود احمد شاہ مرحوم جن کی صرف دو بیٹیاں، دردانہ اور روحانہ تھیں۔ ان سے چھوٹے سعد احمد شاہ تھے جن کی دو بیٹیاں، مدیحہ عرف مدھو اور افشاں اور دو ہی بیٹے تھے مسعود شاہ اور واصف شاہ۔ سب سے چھوٹے محمود احمد شاہ تھے۔ ان کی بھی صرف دو ہی بیٹیاں تھیں نگار اور بیلا۔

اس خاندان کو اللہ نے خوشی اور نعمت کے جلوے بھی دکھائے تھے۔ اور اندوہ بیکراں کے نظارے بھی۔ پہلا اور بڑا دکھ جس سے روحانہ عرف روحی کی چپ کا آغاز ہوا تھا۔ وہ ان کی سب سے چھوٹی اور سب سے حسین و لاڈلی پھوپھی کی بیوگی کا سانحہ تھا۔ ان کے شوہر کو کینسر ہو گیا تھا۔ پھوپھو اپنے شوہر کو علاج کی غرض سے ہی کراچی لائی تھیں اور بحکم الٰہی ان کا انتقال بھی

نہیں ہوا تھا۔ چار سال کی بچی ان کی گود میں تھی۔

روحی، پھوپھا کے سرہانے بیٹھی سیپارہ پڑھ رہی تھیں، جب عورتوں نے بے ہوش پھوپھو کی کلائیوں سے چوڑیاں اتاری تھیں۔

جوان پھوپھی کی بربادی کا منظر نہ جانے کس زاویے سے دیکھا تھا کہ کبھی ذہن سے محو نہ ہوسکا۔ جائے نماز پر بیٹھتیں تو جیسے سریش لگا کر بیٹھتیں۔ گھبرا کر علاج معالجہ شروع کیا گیا۔ عادتوں میں قدرے تبدیلی ضرور ہوئی مگر چپ ٹوٹ کر نہ دی۔ گھنٹوں کسی سے مخاطب نہ ہوتیں۔ کوئی بات کرتا تو جواب دے دیتیں۔ مرضی نہ ہوتی تو اس طرح بیٹھی رہتیں جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔

ابھی شفیق سے باپ کی محبت سے جی بھر کر سیراب بھی نہ ہو پائی تھیں کہ وہ بھی چل بسے۔ شاید جوان بہن کا دکھ انھیں اندر ہی اندر کھا گیا تھا۔ پھر دوسرے بیٹی کی اُفتاد...... کس طرح پاگل ہو رہے تھے۔ وہ روحی کی خاطر۔ کہاں کہاں اسے لے کر نہ پھرے تھے علاج کی غرض سے؟ ان ہی کی محنتوں کا ثمر تھا کہ وہ اپنے ہوش و حواس میں واپس آ گئی تھیں۔

مگر...... جس رات بڑی چچی نے ماں کی کلائی سے اترنے والی چھ سونے کی چوڑیاں انھیں تھما کر کہا۔

''روحی! انھیں حفاظت سے رکھ دو۔'' اس رات سے پھر ان کا ذہن خلاؤں میں تیرنے لگا تھا۔

ابو جان کے چہلم کے فوراً بعد انھوں نے ماں کو صاف صاف کہہ دیا، وہ شادی نہیں کریں گی۔ نہ مسعود شاہ سے نہ کسی اور سے۔ گھر میں ایک نیا طوفان برپا ہوگیا۔ مسعود شاہ تو جیسے ریزہ ریزہ ہوگئے۔ مگر وہ کسی طرح بھی ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ نہ وجہ بتائی۔ بڑی چچی جوان کے ''نفسیاتی کیس'' بننے کے بعد سے پریشان رہنے لگی تھیں۔ دل ہی دل میں شکر کا کلمہ پڑھ رہی تھیں۔ مگر روحی کی ماں، بڑے چچا اور مسعود شاہ کو اپنا آپ سنبھالنے میں خاصا عرصہ لگا۔ بڑی چچی نے ان کے دکھ کا مداوا تو اس طرح کیا کہ اپنی خوبصورت بھتیجی بیاہ لائیں۔ روحی اور مسعود شاہ کی نسبت کا ذکر تو سارے خاندان میں ہو چکا تھا اور یہ بھی کہ مسعود شاہ بادل نخواستہ شادی پر رضامند ہوئے۔ یہی ایک بات رخشی کو ڈستی رہتی تھی کہ جس کے سبب مسعود شاہ کا دل ویران ہوا، وہ ہر وقت سامنے رہتی ہے۔ ان کے اعصاب کی مصروفیت، ان کے حواس کا پرتو، اور نری یادداشت ہے جو چوبیس گھنٹوں میں کسی بھی لمحے محو ہونے کا امکان نہیں رکھتی۔ مسعود شاہ سے

قربت کے وہ لمحے جو کسی بھی بیوی کا حق ہوتے ہیں۔ان کے وسواس کی نذر ہو جاتے تھے۔

مسعود شاہ کی ہر مہربانی پر ان کی تلخی بڑھ جاتی تھی۔انھیں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے حق نہ دیا جا رہا ہو''ڈیوٹی'' ادا کی جا رہی ہو۔

حالانکہ مسعود شاہ، روحی کو رحم سے تو دیکھتے تھے۔آلودہ نظری سے نہیں۔وہ مرد تھے۔

جب پھوپھو گھٹ گھٹ کے روتی تھیں، تو وہ پھوٹ پھوٹ کے روتی تھیں۔

نماز پڑھتیں تو سجدے طویل ہوتے جاتے۔ان کے سجدوں کی طوالت۔آنسوؤں سے بھیگی جائے نماز۔ان کے فنکارانہ مزاج کے افق پر نئے نئے معنوں کا سورج بن کر طلوع ہوتی۔ان دنوں انھوں نے تھوک کے بھاؤ پینٹنگز بنائی تھیں جو سب کی سب غم و ملال کی عکاس تھیں۔

ابھی تو پھوپھی کے غم سے اکتساب جاری تھا۔زندگی حقیقتوں کے پردے سرکا کر کچھ دکھانے اور سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ ان سے بڑی دردانہ کے جواں سال شوہر کے حادثے میں چل بسے۔زندگی سے بھرپور آپا بی سونی کلائیاں لیے دہلیز پہ آ کھڑی ہوئیں۔اسی رات پھوپھو کو برین ہیمبرج ہوا تھا۔یعنی غم کا سلسلہ دراز ہوا تھا۔وہ اپنے خدائے مجاز سے زیادہ دن دور نہ رہ سکی تھیں۔

پھوپھو کی ویرانیاں جو زندگی کو نئے عنوان دے رہی تھیں۔وہ اب آپا بی کو منتقل ہو گئیں۔پردے پر وہی...... منظر چلنے لگے۔صرف چہرہ بدلا تھا۔روحی کی چپ اب گہری اور مستقل ہو چکی تھی۔

ان کے اندر اتنی خاموشی سے تبدیلیاں در آئی تھیں کہ کسی کو احساس تک نہ ہو سکا نہ ان کی ماں کو اور نہ مسعود شاہ کو جن سے وہ بچپن سے منسوب تھیں۔آپا بی کا راتوں کو جاگنا، لان میں ٹہلنا، تسبیح کرتے ہوئے آنکھوں سے موتی برسنا۔

شادیوں کی تقریبات اور عید کے دنوں میں بند کمرے میں ان کی بیوگی بال کھولے بین کرتی محسوس ہوتی تو ان کے برش سے راتوں رات ایک تصویر مکمل ہو جاتی۔آپا بی کو انھوں نے کبھی رات کو پرسکون سوتے نہیں دیکھا۔جب آنکھ کھلی ان کا بستر خالی پایا۔یا تو جائے نماز پر ملتیں یا لان میں ٹہلتی ہوئی۔ان کا دل بہت نازک تھا شاید۔مسلسل حزن کی تاب نہ لا سکا۔دوسری شادی کا ذکر انھیں گالی کی طرح لگتا۔ان کا غم بڑھ جاتا۔بے قراری سوا ہو جاتی۔دل ناصور ایک رات پھڑک کر ہمیشہ کے لیے ٹھہر گیا۔گڑیا سی آپا بی ہمیشہ کے لیے سوتی رہ گئیں۔

اور اس شب کرب و بلا میں بہت سے ہوش مند چونک پڑے تھے۔روحی کے انداز اس دن بہت اجنبی و غیر معمولی محسوس ہوئے تھے۔جنھیں شدت غم کا عنوان دے کر نظر انداز کر دیا گیا تھا۔مگر دن گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی عجیب و غریب حرکات سامنے آنے لگیں۔

نہانے جاتیں تو گھنٹوں کے لیے غسل خانے میں بند ہو جاتیں۔

ہاتھ دھوتیں تو دھوئے چلی جاتیں۔

انھیں دکھ کے بعد سمجھوتے کے ہنر آ گئے تھے۔پھر ان کا ضمیر بھی مجرم نہیں تھا۔اسی لیے وہ سکون باطنی سے عاری نہیں تھے کہ روحی کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ فطری تھا۔اس میں ان کا ہاتھ نہ تھا۔وہ فرسٹ کزن ہونے کے ناتے اور روشن ضمیری کی وجہ سے اپنی تائی اور روحی کو اپنی ذمہ داری جانتے تھے مگر رخشی کی تنگ ذہنیت نے ان کا ذہنی سکون برباد کر دیا تھا۔

بیلا ابھی ان کی طعن بازی سن کر افسردہ سی لان میں آ کر بیٹھ گئی تھی۔اسے مسعود بھائی روحی آپی سے بھی زیادہ مظلوم دکھائی دیتے تھے۔

واہ روحی آپی۔آپ نے تو اپنے سارے غم اور خوف کے امکانات کو موت کی نیند سلا دیا خلاؤں سے ناتا جوڑ لیا۔مگر بے چارے مسعود بھائی۔آہ۔''

چوڑیوں کی جھنکار پر اس نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔دو سو گز سے زائد رقبے پر بنے لان کے ایک انتہائی کونے میں جامن کے پیڑ تلے روحی عجیب سی ترنگ میں جھولا جھول رہی تھیں۔اُڑتے بالوں کو ہاتھوں سے سمیٹتیں تو چوڑیاں چھن چھن بجنے لگتیں۔بلا کا اطمینان ان کے انداز سے ظاہر تھا۔پیرٹ گرین کرنکل کے کرتا شلوار اور دوپٹے میں اپنی کھوئی کھوئی کیفیت کے ساتھ وہ اتنی ماورائی سی لگیں کہ بیلا ایک ٹک انھیں دیکھتی چلی گئی۔

اسے یوں محسوس ہوا۔جیسے وہ کوئی جوگن ہوں۔جو کسی خوش آئند امکان کو سامنے رکھ کے روز سنورتی ہے۔پھول چنتی ہے۔گجرے بناتی ہے۔

آس کا دیا جلا کر۔جیسے چاند کی زمین کے رومان سوچتی ہے۔مسکراتی ہے۔کھلکھلاتی ہے۔دنیا سے ناتا توڑ کر محض فطرت سے رشتہ جوڑ لیتی ہے۔جس کے روپ سنگھار کو کسی ''حادثے'' کا خطرہ نہیں ہوتا۔دنیاوی تغیرات اسے نہیں ڈراتے جسے وہم و ناامیدی کے ناگ نہیں ڈستے۔ایک دُھن میں رہتی ہے۔ایک کی دُھن میں رہتی ہے۔جو طلب کا دامن سمیٹ لیتی ہے۔جو نقصانات کے شمار بند کر دیتی ہے۔جس کے حسین ہاتھ دیا جلاتے ہیں یا پھول

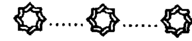
پروتے ہیں۔

''بیلا!'' معاً قریب سے اسے روحی کی آواز سنائی دی۔ وہ خیالات کی رو میں بہہ کر جانے کس طرف نکل گئی تھی کہ اسے پتا ہی نہ چلا وہ جھولے سے اتر کر کب اس کے قریب چلی آئیں۔

''جی آپی؟''

''میں نے سرخ اور ہری چوڑیوں کا ایک سیٹ بنایا تھا۔ رکھ کر بھول گئی ہوں۔ تم نے تو نہیں دیکھا۔'' وہ اس سے پوچھنے کے دوران بھی ذہن پر زور ڈال رہی تھیں۔

''نہیں آپی!'' اس کی آنکھوں میں نہ جانے کیوں آنسو چمکنے لگے۔



حسب، نسب، کسب

مطلق العنانی وہ کہ موروثی بادشاہ و راجے مہاراجے غش کھائیں۔ (مارے رشک کے) کرّوفر کہ وہ ملکہ وکٹوریہ کے بُت کو پسینے چھوٹیں، انداز بیاں پُرتحکم اور بلا کا پُرجوش کہ لیڈر اپنے لیڈر کا ... لیڈر مانیں بصد کمالِ انکسار و احترام ابا میاں اور اماں جان علامہ اقبال و چودھری سر شہاب الدین کی چلتی پھرتی یادگاریں نظر آتے تھے۔ (نوک جھونک کرتے ہوئے)

خدا معلوم ابا میاں ان کی حکومت میں ایک رائے دہندہ کی حیثیت سے بھی پرے کیوں تھے۔ مذاق و موڈ میں پھبتیاں ضرور کس دیا کرتے۔ جن سے اماں جان مزید نخرے میں آجاتی تھیں۔ نہایت ناز و نخوت سے سر جھٹک دیتی تھیں۔ ابا جان علامہ موصوف کی طرح شگفتگی کا مظاہرہ کرتے اور اماں جان ان کے مذاق پر مزید تیکھی ہو جاتیں یا شاید ابا میاں کے مرعوب یا محکوم ہونے کا یہ سبب تھا کہ اماں جان نے انھیں گھریلو بکھیڑوں سے کوسوں دور رکھا تھا۔ کیا خاندانی ذمہ داریاں ہیں کیا بچوں کے اسکول کالجوں کے جھگڑے۔ کیا رتیوں، رسموں پر لینا دینا۔ ابا میاں کی جانے بلا۔ شاید چپ اظہارِ قدر دانی تھا۔

بچے جب تک چھوٹے رہے بھلے رہے کہ برداشت کر جاتے تھے مگر اب بچوں کو بھی جائز ناجائز کی سمجھ آرہی تھی بلکہ آ گئی تھی۔ مبالغہ تو ہے مگر زیادہ نہیں کہ پانی تک پوچھ کر پیو۔ عبدالصمد جب چھوٹے تھے تو دوست بھی اماں کے مرضی اور پسند سے منتخب کرتے تھے۔ انھیں یاد تھا کہ کوئی نیا بچہ ان کے ہمراہ نظر آتا فوراً پوچھ گچھ ہوتی۔

''کون ہے؟''

''کہاں سے آیا ہے؟''

''باپ کیا کرتا ہے؟''

''کتنی دیر پڑھتا ہے؟ کتنی دیر کھیلتا ہے؟''

جوابات تسلی بخش مل جاتے تو بنا کچھ مزید کہے اندر ہو جاتیں۔ ابا جان کو اس انٹرویو کی

وجہ تسمیہ یہ بتاتیں۔

''صحبت سریع الاثر نشہ ہے اچھی ہو یا بری۔ بچوں کی بنیاد اچھی اٹھے تو ساری عمر چین کی بانسری بجاتے گزرتی ہے۔ ماں باپ کی بھی اور بچوں کی بھی۔'' ابا میاں قائل ہو کر گردن ہلا دیتے یہ ہلتی گردن اماں جان کی کرسی مضبوط کرتی گئی۔

بچوں کے کھیلنے، کودنے، پڑھنے کے اوقات مقرر تھے۔ بے وقت کبھی کھانا نہیں ملتا تھا۔ خواہ کوئی بھوکا پڑا سو رہے۔ اماں جان کے تمام تر احساسات میں قوی تر احساس ''احساسِ فخر'' تھا۔ جب سسرال کی چوکھٹ پر قدم دھرا سوائے بوڑھے سسر کے گھر میں کوئی نہ تھا۔ تین نندیں اپنے اپنے گھر کی تھیں۔ دیور کوئی نہ تھا، جیٹھ الگ رہتے تھے نوکری کے سلسلے میں۔ میکے میں بھی سب سے بڑی تھیں۔ گویا بلا مقابلہ منتخب ہوتی چلی گئیں اور یہ اعزاز کوئی کم تھا۔ سیّد زادی بھی کوئی بناسپتی نہیں تھیں۔

مگر اب ان کے نادر شاہی احکامات بچوں کے لیے احساسِ خفت بن جایا کرتے تھے۔

تابندہ، رخشندہ، عبدالصمد سے چھوٹی تھیں۔ کبھی اپنی سہیلیوں کے ہمراہ بیٹھی ہوتیں۔ اماں جان اندر آ کر ان پر نظرِ غائر دوڑاتیں۔

''یہ تم کیا چار چار گھنٹے تک باتیں کیا کرتی ہو؟ یہ تمہارا پڑھنے کا وقت ہے۔'' پھر سہیلیوں سے مخاطب ہوتیں ''کیوں بھئی لڑکیو! تمھارے گھروں میں کوئی پوچھنے گچھنے والا نہیں ہے؟ کیسے ماں باپ ہیں تمھارے جو اس قدر لاپرواہ ہیں کبھی ملوانا مجھے اپنی ماؤں سے۔''

غالباً اماں جان ماؤں تک پہنچ کر اپنی حکومت کی وسعت کے خواب دیکھتیں۔ تابندہ، درخشندہ کڑھ کر رہ جاتیں، مارے شرمندگی کے آنکھیں بھر آتیں۔ رخصتی کے وقت چپکے سے سہیلیوں کے کانوں میں کہتیں ''برا مت منانا۔ اماں جان تم لوگوں کو بھی ہماری طرح سمجھتی ہیں یعنی بیٹیوں جیسا۔ دل کی بری نہیں۔''

اور تو اور عبدالصمد پورے اٹھائیس برس کے مرد ہو گئے تھے مگر اماں اب بھی اٹھائیس دن کے بچوں کی طرح ان پر نگاہ رکھتی تھیں۔ پہلے پہل تو انھوں نے ان پابندیوں پر کچھ بھی محسوس نہیں کیا تھا۔ ماں نے غیر معمولی صاف ستھرا اور پرسکون گھریلو ماحول دے رکھا تھا۔ انھیں احساس تک نہ ہوا کہ ماں ان کے اوڑھنے سونے میں بھی دخیل ہیں۔

مگر جب سے بار ایٹ لاء کر کے جرمنی سے لوٹے تھے۔ ذہن جمہوریت پسند ہو گیا

تھا۔ گھر کے شہنشاہی ماحول میں ان کا دم گھٹنے لگا تھا۔

''یہ نیا سوٹ کب سلوایا؟''

''اتنے کپڑے بنانے کی کیا ضرورت ہے؟''

''سوٹ کی تو سلائی ہزاروں پہ جاتی ہے۔ باہر رہ کر تم فضول خرچ ہو گئے ہو۔''

وہ وکیل تھے سرکاری ملازم تو نہیں کہ ان کے وقت کا حساب رکھا جائے۔

ماں سدا اس کروفر سے رہی تھیں کہ سامنے بسیار کوشش کے زبان نہیں کھلتی تھی۔ چھ فٹ کے مضبوط جسم کے مالک تھے اتنے ہی مضبوط اعصاب کے۔

تابندہ کی شادی انھوں نے اپنی مرضی سے طے کی۔ وہ جانتے تھے کہ تابندہ کو خالہ کے گھر کا ماحول اور ان کی اولادیں بالکل پسند نہیں۔ انھوں نے رشتہ طے ہو جانے پر تابندہ کی آنکھیں کئی بار متورم دیکھی تھیں۔

ابا میاں سے کوئی بات کرنا بیکار تھی ان کا ایک ہی جواب تھا ''بھئی تمہاری ماں بہت سمجھدار ہیں۔''

وہ رخصت ہوئی تو ستر مرتبہ بیہوش ہوئی۔ یہ بیہوشیاں محض غم جدائی نہیں تھیں۔ غلط فیصلوں کے تیز زہریلے خنجر اس کی سانسوں کو پنپنے نہیں دے رہے تھے۔

وہ جانتے تھے کہ اماں جان اس بات سے لاعلم ہیں کہ تابندہ راکھ کی ڈھیری ہے جو بکھرتی رہے گی۔ وہ اس روز عدالت جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے کہ جلدی میں کف کا بٹن ٹوٹ گیا۔ وہ تابندہ، درخشندہ کے مشترکہ کمرے کی طرف بڑھے تو اندر سے آواز آئی۔

''رخشی! قسم سے انھوں نے کل میری دونوں سہیلیوں کے سامنے مجھے بُرا بھلا کہا۔ میری بھی حیثیت ہے۔ کوئی ہستی ہے اللہ کرے میں مر جاؤں یا۔ یہ۔''

''ہائے توبہ باجی۔ ماں کو بھی کوئی ایسے کہتا ہے۔ استغفار کریں۔'' رخشی کانپ گئی۔

''اپنی ناک چوٹی کی لمحہ لمحہ فکر رہتی ہے۔ ہماری کوئی عزت ہی نہیں۔'' تابندہ بڑبڑائی۔

عبدالصمد اندر داخل ہوئے تو تابندہ غسل خانے میں گھس گئی انھوں نے رخشی سے بٹن لگوایا۔ مگر تابندہ کا طرزِ تخاطب ان کے اعصاب پر ہتھوڑے برساتا رہا۔ سارا وقت وہ یہی سوچتے رہے کہ اس نے ایسا کیوں کہا؟

تابندہ کی شادی پر انھوں نے ثریا کو دیکھا تھا اور سو جان سے فریفتہ ہو گئے تھے۔ وہ

تابی کی سہیلی تھی۔

دو برس بعد ان کی شادی کا ذکر چھڑا تو انھوں نے ثریا کا نام لے دیا۔ جس پر چند لمحے گنگ رہ کر ماں نے بیٹے کو دیکھا۔ پھر ماتھے پر سینکڑوں بل ڈال کر بولیں۔

''کیا میں اس قدر گئی گزری ہوں کہ ڈھنگ کی بہو بھی نہیں لاسکتی یا مجھ میں پرکھ کا سلیقہ نہیں۔ یا تم بیرسٹر ہو کر ماں کو کسی قابل ہی نہیں گردانتے ؟''

''یہ بات نہیں اماں جان۔''

''نہیں میاں! یہی بات ہے۔ میں نے تو تمہاری پرورش اس نہج پر نہیں کی تھی کہ تم پرائی بچیوں پر آنکھیں لگاؤ۔ تاکتے پھرو......''

گویا انھیں بے شرمی کا طمانچہ مارا گیا تھا۔

ان کا جی چاہا ماں سے کہہ دیں کہ ہماری پرورش میں اس بات کا بھی خیال رکھنا تھا کہ جذبات دل میں پال ہی نہ سکیں۔ یا غیر سیّدوں سے میل ہی نہ رکھنا تھا۔

''بہر حال......اماں جان......''

''کیا بہر حال اور کیا غیر حال غیر سیّد زادی لا کر میں اپنے خاندان کی لٹیا نہیں ڈبو سکتی۔ سنا تم نے۔ کوئی حسب نسب ہو ڈھنگ کا تو بات بھی ہو۔ یہاں تو نائی، قصائی، سقے، چمار، شیخ سیّد بنے بیٹھے ہیں۔ تم کل کے بچے کیا جانو......غیر خاندان میں تو کبھی مٹی لینے بھی نہ جاؤں گی۔ صحیح شجرہ کون بتاتا ہے۔

خاندان میں دیکھی بھالی لڑکیاں ہیں۔ جب تم نے اڑنگا لگا ہی لیا ہے تو ان میں سے بتادو۔''

اماں نے گویا سات پشتوں پر احسانِ عظیم کیا۔

''ان میں سے کوئی بھی نہیں۔''

''یعنی کہ......کیا مطلب......؟'' (صفاچٹ جواب پر حیرانی)

''صرف وہی......صرف اور صرف......'' اس وقت ان پر بیرسٹری سوار تھی دھن میں بولے۔

''اے کیا اُلو کا گوشت کھلا گئی تھی؟ دیکھو آج کل کی چلتر لٹر۔''

''اماں......اس بیچاری سے تو میری بات بھی نہیں ہوئی کبھی......''

''اے جانے دو بیچاری کو......خوب جانتی ہوں......دیکھو صمد میاں تم سمجھدار ہو، خواہ

مخواہ کی ضد بحث نہ کرو۔'' یہ کہہ کر وہ باہر چلی گئیں۔



ایک پیچیدہ کیس تھا۔ اغوا کا کیس تھا۔ ملزم کا بیان تھا۔ لڑکی خود اپنی رضا سے اس کے ہمراہ فرار ہوئی تھی۔ لڑکی کی ماں کا کہنا تھا کہ اسے اغوا کیا گیا تھا اور لڑکی بھی یہی کہہ رہی تھی کہ اسے کالج سے واپسی پر اٹھایا گیا۔ آج مقدمے کی پہلی سماعت تھی وہ بار روم میں بیٹھے اپنے مقدمے کی سماعت کا انتظار کر رہے تھے ان کے خیال میں ان کا نمبر لنچ کے بعد ہی آنا تھا۔ وہ فائلیں کھول کر بیٹھ رہے۔

''السلام علیکم جی......!''

انھوں نے سامنے دیکھا چست کپڑوں میں ملبوس اسی مغویہ کی ماں تھی اس کے ہمراہ برقعے میں لڑکی تھی جس کے دیدار سے وہ ہنوز محروم تھے......

''دیکھیں جی......ہم نے ساری باتیں سچ سچ بتائی ہیں۔ یہ شخص بہت عرصے سے آتا جاتا تھا۔ ہمارے گھر......ذلیل ہے پکا......بڑی جب تھی تو اس کے پاس رقم نہیں تھی اسے تو کویت کا شیخ لے گیا اللہ رکھے سکھی ہے......البتہ میں اسے ڈاکٹری پڑھانا چاہتی ہوں۔

ہزار بار جتانے پر بھی کہ میں اس کا ہاتھ کسی شریف آدمی کے ہاتھ میں دوں گی، یہ منحوس پیچھے ہی پڑا رہا۔ یہ کرتب دکھائے اس نے......وہ تو قسمت اچھی تھی......''

''آپ......؟'' عبدالصمد اٹک گئے۔

''مقدر کے لکھے ہیں......جب میں اس کے جتی تھی دلی سے حیدر آباد آئی تھی۔ تین برس دھندہ کیا تھا پھر ایک ساہوکار سے، وہ فلمیں بھی بناتا تھا نکاح کر لیا جس سے یہ لڑکیاں ہوئیں۔ مگر ہماری بات کو لوگ سچ کب مانتے ہیں۔ وہ ساہوکار تو دل کے دورے میں چل بسا۔ اب بچوں کا پیٹ تو پالنا ہی تھا پھر دھندا کرنے لگی۔ مگر میں نے سوچ لیا تھا کہ بچیوں کو دور ہی رکھوں گی۔ بڑی کی تصویر کیلنڈر پر چھپی تو شیخ نے در کی مٹی لے لی۔ وہ تو وہاں راج کر رہی ہے۔ مگر اس کمینے نے ہم پر زندگی تنگ کر رکھی ہے۔''

وہ نہ جانے کون سے شجرے پر نازاں ماورزاد ننگی گالیاں مہذب وکیل کے سامنے دے رہی تھی۔

''مقدمہ میرے حق میں ہو گیا تو سونے سے لاد دوں گی۔

وکیل صاحب!'' وہ گویا جوش دلاتے ہوئے بولی۔

''جی نہیں شکریہ۔ مجھے فقط اپنی فیس درکار ہوگی۔'' انھوں نے رسانیت سے جواب دیا۔

لڑکی ہنوز خاموش تھی۔ مہربائی ذرا باہر گئی تو وہ ایک کرسی پر ٹک گئی۔

وہ اسی طرح سر جھکائے مصروف رہے۔

کافی دیر بعد سر اٹھایا تو اس پر اتفاقیہ نظر پڑ گئی۔ انھیں اس کا وجود لرزتا محسوس ہوا۔ اس کی نقابیں بھیگی ہوئی لگیں۔ غالباً وہ رو رہی تھی۔ مگر کیوں؟ وہ نہ جان سکے۔

بار روم میں ہلچل سی ہوگئی تھی۔ پہلے مقدمے کے وکلاء گاؤن اتارتے ہوئے بولتے ہوئے داخل ہو رہے تھے ان کے موکل بھی ان کے پیچھے گھسٹ رہے تھے۔

وہ فائلیں سمیٹنے لگے۔ ان کا نمبر تھا اب۔



ساعت کے دوران لڑکی نے آنکھیں نقاب سے آزاد کر لی تھیں باقی چہرے پر نقاب موجود تھی۔

تیسری پیشی پر وہ پہلی مرتبہ بار روم میں ان کے پیچھے پیچھے چلی آئی تھی۔

''وکیل صاحب! اگر ہم مقدمہ ہار گئے تو میں فنا ہو جاؤں گی، مجھے اپنی ماں کے ماحول سے نفرت ہے۔ مجھے قطعی احساسِ تحفظ نہیں ہے۔ خدارا۔ یہ شخص۔ مجھے اس سے بہت خوف آتا ہے۔'' وہ رو دی۔

''دیکھیں محترمہ۔ میں سخت محنت کر رہا ہوں۔ اگر ہم حق پر ہیں تو خدا ہماری ضرور مدد کرے گا۔ انشاء اللہ۔''

عبدالصمد نے تسلی دی۔



روز گاڑی صاف ہو رہی تھی روز اماں جان لڑکیاں ''چھاننے'' نکل رہی تھیں۔ خاندان اور ہم پلہ لوگوں میں۔

جھٹ پٹا سا تھا۔ کل رات وہ صمد میاں سے پھر الجھی تھیں ابھی تک اس کا اثر موڈ پر تھا۔

کچن پر نگاہ ڈالنے چلی تھیں کہ ٹھٹھک کر رہ گئیں صمد میاں کسی برقع پوش کے ہمراہ

داخل ہو رہے تھے۔

''اے یہ کون ہے؟'' وہ دل ہی دل میں حیران ہوئیں۔ تابندہ بھی گھر آئی ہوئی تھی۔

صمد میاں ماں کو دیکھ کر لمحہ بھر کو ٹھٹکے اور ایک ہاتھ سے برقع پوش خاتون کا نقاب الٹ دیا۔

''یہ میری اماں جان ہیں۔ سلام کرو۔''

''آداب!'' وہ لکھنوی انداز میں بولی۔

''کیا تماشا ہے صمد میاں کون ہے..... یہ.....؟''

''میری منکوحہ..... اماں جان.....''

ماں کو غش آ گیا..... غدار کس قدر دلیر تھا۔

ان کے شیشے کے تخت پر دراڑ پڑ گئی۔

''میرا تم سے مذاق کا کوئی رشتہ نہیں ہے..... سمجھے.....؟''

''یہ مذاق نہیں ہے.....'' وہ وقار سے بولے۔

تابندہ و رخشندہ بھی آ کھڑی ہوئیں۔

''آپ خود ہی تو فرماتی ہیں کہ ہر کام کا وقت ہوتا ہے آپ تو وقت نکالے دے رہی تھیں۔ حسب نسب کے چکروں میں۔ میں نے آپ کا کام آسان کر دیا ہے۔''

''ہاں۔ بہت ہی آسان۔ ہائے میری قسمت۔''

وہ سر پر دو ہتڑ مار کر بولیں بلکہ چیخیں۔ بنا سازش تخت الٹ دیا تھا۔ وہ بھی وارث نے

ابا میاں نے احساسِ شکست خوردگی سے چور چور بیگم کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ گویا تسلی دی۔

''آپ پوچھیں گی اس کا حسب نسب کیا ہے تو سن لیجیے کہ اس کا حسب نسب ''کسب'' ہے۔''

''کیا.....؟'' ان کی آنکھیں پھٹیں۔ کیا کہہ رہا ہے۔ کسی؟''

''کسب کہہ رہا ہے بیگم۔'' ابا میاں کی جان بھی پانی پانی ہوگئی۔



مجھے جیت لو

اتنی بد دماغ، اتنی خودسر، اس قدر منہ پھٹ لڑکی اس خاندان کی پچھلی سات پشتوں میں نہیں ہوئی تھی نہ اگلی سات پشتوں میں ہونے کا امکان تھا۔

اور اس کے ساتھ نہ ہی اس جیسا حسن خاندان و خاندان سے باہر نظر آتا تھا۔ عجب خودنگر اور خود پسند لڑکی تھی جس کی نہ کوئی سہیلی تھی نہ ہم جولی۔ اس عظیم الشان گھر کی اکیلی ''جیو'' پاپا تو شادی سے پہلے سے ہی دیارِ غیر میں رزق تلاشتے تھے۔

امی اس لاڈلی کے نخرے سمیٹا کرتیں۔

درحقیقت نہ یہ اس کی امی تھیں نہ پاپا اس کے والد، دونوں اس کے سگے خالہ خالو تھے اور وہ اس خبر سے باخبر تھی۔ خالہ کو خدا نے ہیروں سونے میں ڈھانپ دیا تھا مگر اولاد جیسے جوہر سے ان کا خزانہ خالی رہا تھا۔ ان کی چھوٹی بہن کے ہاں جب چوتھی بیٹی ہوئی اور ماں چوتھی بیٹی کی پیدائش پر حسب روایت ملول ہوئی تو بڑی بہن نے اپنے بازو وا کر دیے کہ تم تو ناشکری ہو، مجھے خدا سات دے تو میں چوم چوم مروں۔

اور وہ سب کی رضامندی سے خالہ کے گھر آ گئی۔ خالہ نے جوہری سے بڑھ کر اس کی قدر کی۔ ایک تو صورت ایسی کہ ہر تلخ ادا بھی شہد لگے۔ اس کا حسین مکھڑا چومتے چومتے دل نہ بھرے۔ خالہ خود بھی سب بہنوں میں بے حد حسین تھیں۔ خالو بھی نہایت وجیہہ و پُروقار تھے۔ اس نے ہوش سنبھالتے پر نخرے اٹھانے والے حسین چہرے دیکھے۔ عظیم الشان محل جیسا گھر، دنیا کی ہر نعمت اپنے اردگرد بکھری دیکھی۔ اس کے ایسے ٹھاٹھ دیکھ کر اس کی بہنیں سوچا کرتیں کاش ہم چوتھے نمبر پر آئے ہوتے۔

ان کی یہ بات سن کر ماں کہتیں۔ ''ارے میں نے اسے پھینکا تو نہیں تھا، نفرت تو نہیں ہے مجھے اس سے۔ وہ تو تمہاری دادی اور پھوپھی نے مجھے طعنے دے دے کر میرا کلیجہ چھلنی کر دیا تھا۔ میں نے سوچا خدا معلوم اس بچی کو اس کے حصے کی ممتا دے بھی سکوں گی یا نہیں کہ

دن رات کی طعنے بازی سے جی تو یہ چاہتا تھا کہ خود بھی مر جاؤں اور بچوں کو بھی۔ تمھارے باپ الگ چپ چپ رہنے لگے تھے۔ وہ تو خدا نے بہت کرم کیا کہ دولڑکوں سے نواز دیا۔ لوگ تو کہتے ہیں کہ یہ پھول ہی بھاگوان تھی۔ دو بھائی لائی تھی ساتھ۔ خالہ کے گھر گئی تو وہاں پہلے کیا کمی تھی۔ پاؤں تلے کی مٹی بھی سونا بننے لگی۔'' امی جان سناتیں سب بڑے رشک سے سنا کرتے تھے۔

خدا معلوم اس کو اپنے حسین ہونے کا احساس تھا یا خوش قسمت ہونے کا۔ بچپن ہی سے لوگوں نے اس کی ناک کو نخوت سے سکڑے دیکھا۔ خالہ کبھی اسے بہن کے ہاں لاتیں تو وہ تمام وقت ان کے ساتھ ہی چپکی رہتی۔ مجال ہے کہ جو بچوں کے ساتھ کھیل میں شامل ہو جاتی۔

امی جان وغیرہ بھی خوش حال لوگ تھے مگر امی بچوں میں بری طرح مصروف رہا کرتی تھیں۔ ایک روز جب وہ سات سال کی تھی تو خالہ کے ہمراہ اپنی سگی پھوپھی کے ہاں آئی اور حسب عادت خالہ کے پہلو سے لگی بیٹھی رہی۔ پھوپھی نے بہت کہا کہ باہر لان میں جا کر کھیل لو بہن بھائیوں کے ساتھ، مگر وہ ہونٹ لٹکائے اسی طرح بیٹھی رہی۔ جب پھوپھی نے دوسری بار کہا تو خالہ کے کان میں منمنائی۔

''ممی! میں نہیں کھیلوں گی۔ ان کے بچے کتنے گندے ہیں۔ دیکھیں بغیر شوز کے کرکٹ کھیل رہے ہیں۔''

پھوپھی نے اس کی بڑبڑاہٹ سن لی۔ وہ تو ''اُن کے'' سن کر ہی تپ گئی تھیں۔

''ارے بیٹا! یہ اُن کے کیا ہوتا ہے؟ شاہینہ! پال رہی ہو، اسے رشتے بھی بتاؤ۔ ان وِن نہیں ہوں، پھوپھی ہوں، سگی پھوپھی اور ہاں بچے گندے کیوں نہ لگیں گے۔ تمہاری ماں عطر، لوبان، بلکہ کستوری میں نہلاتی ہے تمھیں۔ نوکر پھونکیں مار مار کر گرد اڑاتے رہتے ہیں۔''

پھوپھی طبعاً حساس تھیں۔ دوسرے بھاوج کی دولت مند بہن کے سامنے اپنی کم مائیگی کا احساس بھی تھا۔ چپ نہ رہ سکیں، سنا ہی گئیں۔

''ارے بابا! آپ تو بچی کی بات کا برا مان گئیں۔ رشتے سمجھانے کے لیے ہی تو آپ لوگوں سے ملاتی رہتی ہوں۔ آپ تو بچی کی بات کا بہت ہی برا مان گئیں، چلیں معاف کر دیں۔''

پھوپھی تو مزید سنانے کا ارادہ رکھتی تھیں مگر شاہینہ کے معذرتی انداز پر ٹھنڈی پڑ گئیں۔

''خیر بُرا تو نہیں مانا میں نے۔ میرا مقصد تو یہ تھا کہ لڑکی ذات ہے، پرائے گھر جانا ہے۔ خودسری اور ضد اچھی نہیں ہوتی۔ آج بچی ہے خیر سے کل بڑی بھی ہو گی۔''

"بیٹے یہ آپ کی پھوپھی اماں ہیں۔ پھوپھی اماں کہا کریں آپ۔" انھوں نے پھول کا رخسار چوم کر تلقین کی جو بڑی بیزار بیزار سی بیٹھی تھی۔

پھوپھی نے چائے پیش کی تو وہ پھوپھی کے بجائے ماں کی بغل میں گھس کر بولی۔

"میں چائے نہیں پیوں گی۔"

شاہینہ خفیف سی ہو کر بولیں۔

"یہ چائے نہیں پیتی آپا۔ صبح ناشتے میں بمشکل دودھ پلاتی ہوں۔"

"اے بیٹا! اللہ نے بڑا روپ دیا ہے ماشاءاللہ۔ آج پی لو گی تو میلی نہیں ہو گی۔"

پھوپھی بڑی سادہ سی خاتون تھیں۔ ہر بات اپنی ذات تک لے جاتی تھیں۔ ان کو اس انکار میں بھی اپنی ہتک محسوس ہوئی۔ حالانکہ شاہینہ چائے بھی پی رہی تھیں، اسنیکس وغیرہ بھی لے رہی تھیں مگر پھوپھی ہر بات میں پھول کو گھسیٹ رہی تھیں۔

گھر آتے ہی پھول نے اعلان کر دیا کہ وہ آئندہ اس گندے بچوں والے گھر میں نہیں جائے گی۔ وہ تو خیر پھوپھی کا گھر تھا وہ حقیقی ماں کے گھر جاتی تو بھی شاہینہ کے پہلو سے لگی بیٹھی رہتی۔ بچپن ہی سے اس نے کہیں آنے جانے میں سرگرمی نہیں دکھائی تھی۔ رشتے داروں کے ہاں جانے سے تو بہت ہی کتراتی تھی۔ البتہ تفریحی مقامات پر شاہینہ کے ساتھ بہت شوق سے جاتی تھی، ان کا ہاتھ تھام کر دور دور ہو آتی۔ خوشی سے ہنستی کھلکھلاتی۔ سمندری مقامات پر شاہینہ کے ساتھ پانی سے کھیلتی۔ بس لوگوں کے گھر جانے سے ہمیشہ کتراتی۔ لوگوں کا جی چاہتا وہ ان کے ہاں آئے اور تقریبات میں شریک ہو مگر وہ شاہینہ سے لپٹ کر منہ بسور کر کہہ دیتی۔

"ممی! میرا دل نہیں چاہتا۔" وہ اس انداز سے کہتی کہ وہ بے بس سی ہو جاتیں۔

اس کا منہ چوم کر کہتیں "بیٹے ملنا جلنا بھی چاہیے ناں؟"

"آپ تو مل لیتی ہیں۔" وہ ان کے زانو پر سر رکھ کر نخرے سے کہتی۔

"مگر لوگ تمھیں بھی تو بلاتے ہیں۔"

وہ کوئی جواب نہ دیتی۔ اسی طرح ہونٹ لٹکائے ہاتھ میں پکڑی چیز نوچتی رہتی۔

وہ اور اس کی حقیقی بہنیں ایک ہی اسکول میں پڑھتی تھیں۔ اب کالج میں بھی آگے پیچھے کلاسز میں تھیں، شہر کا بہترین کالج تھا۔ اعلیٰ گھرانوں کی لڑکیاں وہاں آتی تھیں، مگر کالج میں بھی وہ بے حد نمایاں نظر آتی تھی۔ اس کی تینوں بہنوں نے سہیلیوں کو بتایا تھا کہ وہ ان کی حقیقی

بہن ہے۔ لڑکیاں حیران ہوئی تھیں کہ وہ ان کی حقیقی بہن ہے تو ان سے اتنا الگ کیوں رہتی ہے۔ ان کی گاڑیاں الگ الگ کیوں ہیں اور مختلف سمتوں میں کیوں جاتی ہیں؟ بہرحال انھوں نے وضاحت کر دی تھی۔ ویسے وہ بھی اپنی بہنوں سائرہ، حمیرا، ماہرہ میں جھلک ضرور مارتی تھی مگر ان سے ہر انداز میں مختلف اور الگ تھلگ۔ سردیوں میں جب وہ کالج کے احاطے میں بیٹھی کسی کتاب میں گم ہوتی اور اس کی ناک میں پڑی ہیرے کی لونگ سورج کی تیز روشنی میں منعکس ہوتی تو وہاں بیٹھی لڑکیاں مبہوت ہو کر اسے تکا کرتیں۔

قدم قدم پر خود کو اہم دیکھ کر اس میں حد سے زیادہ سرد مہری اور بے نیازی آتی گئی۔

اسے خود اندازہ تھا کہ وہ کیا ہے۔ اس نے شاپنگ سینٹر میں جا کر جانا تھا کہ لوگ کس طرح آگے بچھ بچھ کر چیزیں دکھاتے ہیں۔ لوگوں کا مڑ مڑ کر دیکھنا اس کو خوب احساس دلاتا تھا۔ اس کے باوجود وہ خود کو بے حد سادہ رکھتی تھی۔ سرو قامت ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے بال بھی بے حد دلکش تھے۔ لانبے، گھنے اور چمک دار۔ خدا نے بڑی فرصت سے بنایا تھا۔ رشتے تو اس کے اس وقت سے آنے شروع ہو گئے تھے جب وہ پالنے میں تھی۔ اب خاندان میں سے تو خیر کسی نے بھی ہمت نہیں کی تھی البتہ غیر بہت آتے تھے۔

سائرہ کے فائنل کرتے ہی شادی کی تاریخ ٹھہر گئی۔ خالہ ہونے کے ناتے شاہینہ کو تو اہمیت سے جانا تھا۔ انھوں نے اُسے وقت کی نزاکت اور اہمیت سمجھاتے ہوئے آخر کار رام کر لیا تھا۔ یہ پہلی شادی تھی جس میں وہ اہتمام سے شریک ہو رہی تھی۔ آخر اس کی حقیقی بہن کی شادی تھی۔ شاہینہ نے اس کے بے حد حسین ملبوسات تیار کرائے تھے۔

جب وہ شاہینہ کے ہمراہ پورچ میں اتری تو سب نے خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کیا۔ وہ بھی رواداری سے مسکرائی۔ بچپن کی طرح اسی طرح شاہینہ کے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔ لڑکیوں نے ڈھولک گیت گائے وہ اسی طرح خاموش بیٹھی رہی۔

پھوپھی جان کی شبانہ نے اسے بھی دعوت دی کہ وہ بھی گائے، مگر اس نے انکار کر دیا۔ تب شبانہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ ارے پھول آؤ ناں۔"

پھول نے ایک دم ہاتھ کھینچ لیا۔

"ارے بھئی کیا بدتمیزی ہے؟ آپ تو بالکل آؤٹ آف مینرز ہیں۔"

پھول کے ساتھ کب کسی نے بے تکلفی کی تھی۔ اس نے شبانہ کو بری طرح جھاڑ دیا۔

شبانہ تو خفیف سی ہو کر رہ گئی۔

سب ایک دم خاموش ہو گئے تھے۔ پھول اسی طرح بیٹھی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

رات کو شاہینہ جانے لگیں تو وہ بچوں کی طرح بسور کر ہمراہ چلنے کو کہنے لگی تب شاہینہ نے سمجھایا کہ سب لوگ مجھے بڑا بھلا کہیں گے کہ نہ خود رک رہی ہوں اور نہ بیٹی کو ٹھہرا رہی ہوں۔ تم رک جاؤ میں صبح پھر آ جاؤں گی، گھر پر جو کوئی نہیں ہے ورنہ میں بھی رک جاتی۔ ویسے بھی آج پچیس تاریخ ہے ہو سکتا ہے، پاپا آ جائیں تمھارے۔''

انھوں نے اسے دوسروں سے چھپ کر سمجھایا کیونکہ سب بچپن سے یہی کہتے تھے کہ شاہینہ ڈانٹ ڈپٹ بھی کرنا چاہیے۔ بچے سر پر چڑھ جاتے ہیں مگر شاہینہ آج تک نہ ڈانٹ پائی تھیں۔ ان کی بہن یعنی پھول کی ''جنم ماتا'' امینہ بھی بہن کو سمجھاتی تھیں کہ بچوں کو سونے کا نوالہ کھلانا چاہیے مگر ساتھ نگاہ شیر کی رکھنا چاہیے مگر شاہینہ پر کسی کے کہنے کا اثر نہ تھا۔

وہ شاہینہ کو رخصت کر کے پورچ سے واپس آ رہی تھی تب ہی سامنے سے دو نوجوان آتے دکھائی دیے۔ وہ اپنی سمت آتا دیکھ کر ایک طرف ہو کر چلنے لگی۔

''بات سنیں، محترمہ!'' ان میں سے ایک بولا۔

وہ بولی نہیں بلکہ ناک سکوڑ کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

''آپ غالباً پھول ہیں۔ شاہینہ آنٹی کے گلشن کا؟'' دوسرے نے ٹکڑا لگایا۔

''کیا بدتمیزی ہے!'' (یہاں تو کسی کو بھی بات کرنے کی تمیز نہیں) پھول کا خون کھول گیا۔

''یہ بدتمیزی نہیں بکرے کا مغز ہے۔ اندر کچن میں پہنچا دیجیے اور بتا دیجیے کہ فضل کہہ رہا تھا پائے نہیں ملے۔'' پھول سمجھ تو گئی کہ یہ نوکر کا لایا ہوا سودا سلف ہے مگر اسے تو یہ بات انتہائی ناگوار گزری کہ اس سے کام کرنے کو کہا جا رہا تھا، وہ بھی اس قسم کے کام کو۔ اس نے بڑی رکھائی سے کہا۔

''آپ کے بھی تو ہاتھ پاؤں سلامت ہیں۔ خود دے آیئے۔'' وہ یہ کہہ کر بے نیازی سے آگے بڑھ گئی۔

''جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا؟'' ندیم نے فواد کو آنکھ ماری تو فواد نے جواباً کہا۔

''کچھ زیادہ ہی میرے یار۔'' ندیم نے اسے دور جاتے ہوئے دیکھا۔ جانے کیا

سوچ کر مسکرا دیا۔

ندیم امینہ بیگم کے جیٹھ کا لڑکا اور فواد ان کی نند کا لڑکا تھا۔

دوسرے دن ندیم کھڑکی میں کھڑا تھا، غالباً نہا کر آیا تھا تو لیے سے سر رگڑ رہا تھا۔ اس نے امینہ بیگم کو اس کمرے کی سمت ٹرے اٹھائے جاتے دیکھا جس میں پھول کا قیام تھا۔ وہ تو لیے کو صوفے پر ڈال کر تیزی سے نیچے آیا۔

''چچی جان یہ کیا ہے؟'' اس نے ٹرے کی سمت اشارہ کیا۔

''بیٹا یہ پھول کا ناشتا ہے دیر سے اٹھتی ہے ناں، وہ سب تو کر چکے ہیں۔''

''غضب خدا کا چچی جان آپ بزرگ ہو کر یہ کام کر رہی ہیں، لایئے مجھے دیجیے میں لے جاتا ہوں۔''

اس سے بیشتر وہ کچھ بولتیں اس نے ٹرے ہاتھ سے لے لی۔

دروازے کی دستک پر اس نے تھوڑے وقفے کے بعد دروازہ کھول دیا، سامنے ندیم کو دیکھ کر اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

''فرمایئے!'' اس نے رکھائی سے کہا۔

''شہزادی عالیہ کا ناشتا ہے۔ چچی جان لے کر آ رہی تھیں مجھے اچھا محسوس نہیں ہوا کہ وہ بزرگ ہو کر، اگرچہ بڑا تو میں بھی ہوں مگر بزرگ تو بہرحال پھر بھی نہیں ہوں۔''

وہ جتانے کے انداز میں مسکرایا مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ٹرے لے کر سرد انداز میں دروازہ بند کر دیا۔ لمحہ بھر کو وہ وہیں کھڑا رہا، پھر واپس پلٹ گیا۔

ہزار کہنے پر بھی وہ مہندی میں جانے کے لیے تیار نہیں ہوئی، اگرچہ شاہینہ بھی آ گئی تھیں اور انھوں نے بھی اس سے کہا تب اس نے بے زاری سے کہا۔

''ممی! اس قدر ہنگاموں میں میرے سر میں درد ہو جاتا ہے، بس کہہ جو دیا نہیں جاؤں گی۔''

فرل لگی چھوٹی چھوٹی آستینوں والی قمیص اور ہم رنگ چست پائجامے میں وہ نظروں میں کھبی جا رہی تھی۔ وہ شاہینہ کے گلے میں باہیں ڈال کر کوئی بات کہے اور شاہینہ نہ مانیں تو یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ ہمیشہ کی طرح ماتھا چوم کر بولیں۔

''اچھی بات میری جان نہ جاؤ، آرام کرو۔''

سب لوگ چلے گئے تھے نو بجے تک امینہ ان کی ایک دو نندیں بس گھر میں تھیں اور دلہن، وہ کمرے میں لیٹی میگزین پڑھتی رہی پھر باتھ روم میں گھس گئی۔ نہا دھو کر ڈارک بلیو شلوار سوٹ میں ملبوس باہر نکلی، بال سلجھائے، تھوڑا سا فیس پاؤڈر لگایا، ہلکی پنک لپ اسٹک ہونٹوں پر لگائی اور دوپٹہ شانوں پر پھیلا کر باہر آ گئی۔ امینہ غالباً کچن میں تھیں۔ گھر میں متوقع خاموشی طاری تھی وہ دلہن کے کمرے میں چلی آئی۔

سائرہ آنکھوں پر بازو رکھے شاید سو رہی تھی۔

''سو رہی ہیں اپیا؟'' اس نے عام سے انداز میں پوچھا۔

سائرہ نے چونک کر بازو ہٹایا، اسے سامنے دیکھ کر ایک دم بیٹھ گئی۔ ''ارے پھول! تم نہیں گئیں؟''

''نہیں اپیا! میرے تو سر میں درد ہو رہا ہے، ان ہنگاموں میں، سچ بے حد احمقانہ رسمیں لگتی ہیں مجھے تو یہ۔ بس خاموشی سے نکاح ہو جائے۔ دلہا کے ماں باپ اور بہن بھائی دلہن کے ماں باپ اور بہن بھائی اور بس۔'' وہ سائرہ کے بستر پر لیٹ گئی۔

''ارے نہیں پھول! مشرق میں انہی، گیدرنگز، سے تو فطری خوشی کا اظہار جھلکتا ہے۔ کون سا لوگ روز روز ایک دوسرے کے ہاں آتے جاتے ہیں اور خوشیاں مناتے ہیں۔'' اس نے پھول کو پیار سے دیکھا۔

''چھوڑیں اپیا! ایسا بھی کیا ضروری ہے خوشی کا اظہار؟'' وہ لاپروائی سے بولی۔

سائرہ چپ ہو گئی۔

''ایک تو اپیا یہ ہمارے ریلیٹوز (رشتے دار) بالکل بھی سویلائزڈ نہیں۔ کوئی مقاصد نہیں زندگی گزارنے کے اور کچھ نہیں تو لوگ اپنی شان بڑھانے کے لیے ہی جدوجہد کریں۔''

''غالباً تم خود کو ''رائل فیملی'' میں دیکھنا چاہتی تھی۔'' سائرہ بھی تھوڑی تیکھی ہو گئی۔

''ارے نہیں اپیا! پاکستان میں بھی بعض فیملیز بہت ویل مینرڈ اور سویلائزڈ ہیں۔ جن کے ہاں کی عورتیں دال گوشت، پان چھالیہ تک محدود نہیں، جن کے بچے انٹرنیشنل لیول پر دنیا کے دوسرے لوگوں کے دوش بدوش کھڑے ہونے کے قابل ہیں، جن کے آئیڈیل میرا مطلب ہے اباؤٹ لائف بہت نومٹی اونچے ہیں۔ جب ہی تو مجھے ان لوگوں سے بہت کوفت ہوتی ہے۔ ہمارا خاندان تو ابھی تک محمد بن قاسم کے زمانے کا ہے۔ سچ یہ لوگ مجھے مغرور کہیں،

بد دماغ کہیں، میں ان لوگوں میں مکس ہو کر نہیں بیٹھ سکتی۔'' اتنے دن سے جو وہ سرگوشیاں سن رہی تھی۔ اس کی بھڑاس اس نے بہن کے سامنے اس طرح نکالی تھی۔

سائرہ جیسی سادہ لڑکی کے پاس اس کی ان باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ کچھ نفسیاتی طور پر بھی وہ خود کو اس سے کمتر محسوس کرتی تھی۔

اس کے بالوں میں پیار سے انگلیاں پھیر کر بولی۔

''اب کیسا بھی سہی خاندان تو ہوا ناں۔ رہنا تو انہی لوگوں کے درمیان ہے۔''

''میں تو نہیں رہوں گی آپ کی وجہ سے مجبوراً مجھے یہاں آنا پڑا ہے۔'' اس نے احسان جتایا، اسی دم ندیم اندر آ گیا۔

''ارے ندیم بھائی! آپ نہیں گئے؟''

''بے فکر رہو اور بہت لوگ گئے ہیں، تمہارے ہاں، مایوس نہیں ہوں گے وہ لوگ ایک میرے نہ جانے سے کیا فرق پڑے گا؟'' وہ شرارت سے مسکرا دیا۔ سائرہ جھینپ گئی۔

وہ اسی طرح نیم دراز تھی۔

''اور بھی کئی لوگ نہیں گئے۔'' وہ کنکھیوں سے پھول کو دیکھ کر مسکرایا۔

سائرہ بھی مسکرا دی۔

''ایک تو کراچی کا موسم بھی خوب ہے۔ لوگ کہتے ہیں یہاں صحت ٹھیک نہیں رہتی حالانکہ صحت تو یہاں بھی اچھی خاصی ہوتی ہے، ہاں بعض انسانوں کے چہرے پر سست آتی ہے ساری کی ساری۔'' وہ کھلے ہوئے کوٹ کے پٹ پیچھے کر کے پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کھڑا ہو گیا۔ ''کیوں مس؟'' وہ پھول کی طرف متوجہ تھا۔

''دیکھیے مسٹر! آپ جو کوئی بھی ہیں زیادہ فری ہونے کی کوشش نہ کیجیے۔ میں کل سے برداشت کر رہی ہوں۔ جہالت تو آپ کی پور پور سے چھلکتی ہے۔'' وہ ایک دم غضب ناک ہو گئی۔

''ارے نہیں پھول! ایسے نہیں کہتے ہیں اور ندیم بھائی جاہل کیوں ہونے لگے سول انجینئر ہیں۔'' سائرہ کو پھول کا اس طرح لتاڑنا بہت ناگوار گزرا مگر وہ پھر بھی تحمل سے گویا ہوئی تھی۔

''چھوڑیں اپیا! ایسے ایسے سول انجینئر تو پاکستان میں بکھرے پڑے ہیں۔ روزگار تو ملتا نہیں، ہونہہ۔'' اس نے مغرور انداز میں ناک سکوڑی۔

''لیکن محترمہ! یہ سن کر آپ کو بہت افسوس ہو گا کہ میں بین الاقوامی کنسٹرکشن کمپنی

سے وابستہ ہوں اور اتنا کماتا ہوں کہ آپ جیسی بد دماغ لڑکیوں کو۔'' وہ ایک بہت نازیبا بات کہتے کہتے رک گیا۔ سائرہ نے بہت منت سے ندیم کو دیکھا تھا اور خوشامد کے انداز میں پھول کے ہاتھ بھی سہلائے تھے۔

پھول کو اتنی بات آج تک کس نے کہی تھی؟ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سائرہ کی جان علیحدہ عذاب میں پھنس گئی تھی۔ ندیم فوراً باہر نکل گیا تھا۔ ''اللہ، پھول، گڑیا مت رو۔ سب لوگ کیا کہیں گے؟'' وہ پریشان ہو رہی تھی۔

''اپیا کیا نام ہے اس فولش کا۔ میں اسے شوٹ کر دوں گی۔ میں اسے......''

''ارے نہیں گڑیا! ایسے نہیں کہتے، وہ ایسے ہی مذاق کر رہے تھے، ان کی تو عادت ہے۔''

''گو ٹو ہیل ہز ہیبٹ (جہنم میں جائے اس کی عادت)'' وہ روتے روتے بپھر کر بولی۔

''میں اسے مار ڈالوں گی۔'' اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ ''بائی گاڈ! آئی وِل کل ہم۔ (خدا کی قسم میں اسے ضرور مار ڈالوں گی)''

سائرہ نے بمشکل اسے چپ کرایا۔ وقتی طور پر وہ خاموش ہو گئی مگر شاہینہ کو دیکھ کر پھر شروع ہو گئی۔

شاہینہ کے گلے لگ کر سسک پڑی۔

''ممی! میں ابھی گھر جاؤں گی۔''

''کیا ہو گیا زندگی؟'' وہ بری طرح پریشان ہو گئیں۔

''ممی! وہ سائرہ اپیا کا فولش کزن ہے اس نے مجھے برا بھلا کہا ہے۔ ہی از چیپ مین۔ ہی از کری ایچر۔'' (وہ گھٹیا آدمی ہے۔ وہ حیوان ہے)۔ اس نے اس طرح تڑپ تڑپ کر کہا کہ شاہینہ کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

''ارے غضب خدا کا کس نے کہہ دیا، کیا کہہ دیا؟''

تب سائرہ نے ٹو دی پوائنٹ بات بتا دی۔

شاہینہ برا مان کر بولیں۔ ''بھئی جب میری بیٹی کسی کے ساتھ مذاق نہیں کرتی تو کوئی اس کے ساتھ مذاق کیوں کرے؟ اسے عادت نہیں ہے اس قسم کی باتیں سننے کی۔''

امینہ بیگم کو بہن کی حمایت پر تھوڑا تاؤ آ گیا۔

''اے شاہینہ آپا! بہت ہو گئی ہے۔ پرائے گھر جانا ہے اس کو۔ اپنے ہی قابل بنا کر

رکھ چھوڑا ہے۔ نواب ہوں کہ بادشاہ زادے، سسرال تو سسرال ہوتی ہے۔ دو کوڑی کا کر کے رکھ چھوڑا ہے۔''

''کوڑی کی ہے یا لاکھوں کی۔ ہے تو میری۔ خدا نے شہزادیوں جیسی صورت دی ہے، انشاء اللہ شہزادی کی طرح زندگی گزارے گی۔ یہ تو پہلے ہی نہیں آ رہی تھی۔ میری ہی شامت نے دھکا دیا تھا۔'' شاہینہ اسے ساتھ لگائے لگائے باہر نکل گئیں۔

پھر کافی سمجھانے بجھانے پر وہ ٹھہرنے پر آمادہ ہوئی، وہ بھی شاہینہ کی ہزار منتوں پر۔

شادی کے بعد وہ گھر آ گئی تھی اور بے حد پرسکون تھی۔ اسے اس منہ زور نوجوان کے ہاتھوں اپنی توہین کا شدت سے احساس تھا مگر جلنے بھننے کی وہ عادی نہیں تھی۔ سو فراموش کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اسی دوران اس پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ شاہینہ فجر کی نماز کے لیے اٹھی تھیں کہ ان پر فالج کا زبردست حملہ ہوا۔ شاہینہ کے شوہر کو فوراً اطلاع دی گئی مگر ان کے آنے تک وہ چٹ پٹ ہو گئی تھیں۔ عمر بھر کا پہلا مگر بھرپور صدمہ...... پھول کو تو گویا سکتہ ہو گیا۔

ایسی جان چھڑکنے والی سو سو ناز اٹھانے والی ماں۔ خالہ کا تو کبھی اس کے ذہن میں تصور بھی نہ آیا تھا بلکہ وہ تو سگی ماں کو خالہ کہنے لگی تھی۔ پورے خاندان میں کس بچے کو شاہینہ جیسی ماں نصیب ہوئی تھی؟ جنازہ اٹھنے پر وہ بے ہوش ہوئی تھی پھر تو اس پر بے ہوشی کے دورے پڑنے لگے تھے۔ پاپا اس کی پٹی سے لگے تھے۔ امینہ سرتاپا اس کی خدمت میں غرق تھیں۔ اس کی حالت کے پیش نظر امینہ بمشکل اسے اپنے گھر لے آئی تھیں۔ سب اس کی دیکھ بھال میں لگے ہوئے تھے۔ جب ممی کہہ کر روتی تو سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔

وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی خالی خالی آنکھوں سے سامنے دیکھ رہی تھی۔ اسی دم ندیم کار کی چابیاں گھماتا تیزی سے برآمدے کی سمت بڑھا تھا۔ سیاہ باتھ گاؤن میں ملبوس گیلے بال لیے ہونٹ چباتی وہ اس کے دل میں اتر گئی۔ پھول کی نظر جیسے ہی ندیم پر پڑی وہ اٹھ کر اندر بھاگ گئی۔ حمیرا کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ رونے کے تو آج کل بہانے ڈھونڈ رہی تھی۔

''بجو! اس چیپ مین کو کہیں میرے سامنے نہ آیا کرے۔''

حمیرا تو پہلے ہی اس کے اس طرح رونے سے حیران پریشان تھی، یہ سن کر اور ہونق

ہوگئی کہ جانے اس گھر میں کون "چیپ مین" آ گیا ہے۔ وہ بنا بات کیے اسے اپنے کمرے میں لے آئی اور اسے بیڈ پر بٹھا کر چیپ مین کو دیکھنے باہر نکل آئی۔ اسی الجھن ماہرہ نے دور کر دی کہ وہ ندیم بھائی کی صورت سے چڑتی ہے۔ ندیم کے متعلق پھول کے خیالات سن کر حمیرا کو ناگواری تو محسوس ہوئی مگر اس نے ظاہر نہیں کی۔

شام کو وہ اپنا بیگ اٹھا کر کھڑی ہوگئی اور ماں کے سر ہوگئی۔ "خالہ جان! میں گھر جاؤں گی، میرا یہاں دل نہیں لگتا۔" امینہ نے بہت سمجھانا چاہا مگر وہ مان کر نہیں دی۔

"بس میں گھر جاؤں گی۔ میرے بابا اکیلے ہیں۔ میں یہاں بور ہوتی ہوں۔"

تب امینہ نے ڈرائیور کے ہاتھ اسے بھجوا دیا۔

گھر آ کر اس پر طمانیت سی چھا گئی۔ اگرچہ شاہینہ کو یاد کر کے راتوں کو روتی تھی کہ تکیہ بھیگ جاتا تھا۔ غم کیسا ہی ہو اس کی لو آہستہ آہستہ مدھم پڑ ہی جاتی ہے۔

پاپا کو اب اس کی فکر رہنے لگی کہ وہ تنہا کیسے رہے گی؟ تین ماہ کے لیے تو وہ اس کے پاس تھے مگر اس کے بعد؟ انھوں نے پھول کو سمجھایا کہ وہ امینہ کے پاس چلی جائے۔

"کیوں میں کیوں جاؤں؟ آپ ان لوگوں سے کہیے کہ وہ خود یہاں آ جائیں۔" وہ ٹھنک کر بولی۔

"بیٹا تم تو اکیلی ہو۔ وہ لوگ کس طرح آ سکتے ہیں۔ پھر میں اس قسم کی بات ان سے کیسے کہہ سکتا ہوں؟"

"پاپا! میں نے کہہ دیا میں کہیں نہیں جاؤں گی۔" اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

پھر انھیں پھول کو تنہا چھوڑ کر ہی جانا پڑا۔ امینہ وغیرہ سے کہہ گئے تھے کہ گھر کا خیال رکھیں۔ اب اتنا پھیلا ہوا بزنس ایک دم بند کر کے بیٹھنے سے تو رہے تھے۔

اس نے خود کو بے حد مصروف کر لیا تھا۔ گل رعنا جا کر فلاور میکنگ کورس کرنے لگی تھی۔ کالج تو بند تھے۔ فورتھ ایئر کے ایگزام ابھی دور تھے۔

تنہائی سے تو کبھی بور نہیں ہوتی تھی۔ سارا دن پھول بناتی رہتی۔ خوبصورت گلدان خرید کر لاتی، اپنے تیار کردہ پھولوں سے انھیں آراستہ کرتی۔ گھر کی آرائش میں لگی رہتی۔

پاپا کے بیڈروم کی سیٹنگ تبدیل کی، ان کے کمرے میں گرمیوں کے حساب سے کلر کروایا، کنٹراسٹ پردے لگائے، فرنیچر بدلا، کمرے کی عظیم الشان سجاوٹ دیکھ کر پھر قالین پر

بیٹھ کر رونے لگی۔

"اللہ! آج میری ممی ہوتیں، کمرے کو دیکھتیں تو مجھے کتنا پیار کرتیں۔ ایک بار جب میں نے ان کا کرتا کاڑھا تھا تو انھوں نے مجھے کتنا پیار کیا تھا۔ میری آنکھیں چومی تھیں، میری ہتھیلیوں کو بوسے دیے تھے۔ آہ، میری ممی۔"

ایک صبح جب وہ سو کر اٹھی تو نوکر نے اسے خوش خبری سنائی کہ رات پاپا آ گئے تھے۔ وہ خوش بھی ہوئی اور حیران بھی کہ اتنی جلدی تو پاپا کبھی نہیں آتے تھے۔

پاپا نے کمرہ دیکھ کر اس کی بہت تعریف کی تھی، دعا دی تھی، مگر رات کو اس کی خوشی یک دم کافور ہوگئی جب پاپا نے اسے دھماکہ خیز خبر سنائی۔

"پھول دیکھو بیٹا! تم بڑی ہو سمجھ دار ہو۔ تمھیں ایک دن اپنے اصل گھر جانا ہے اور شاید یہ دن نزدیک آ گیا ہے۔ بات دراصل یہ ہے بیٹا امینہ نے مجھے خط لکھا تھا اسی لیے میں آیا ہوں۔ اگر رشتے داروں میں اچھے لڑکے مل جائیں تو یہ خوش قسمتی ہوتی ہے۔ امینہ نے جس رشتے کا ذکر کیا ہے وہ بہت اچھا ہے۔ شاہینہ بھی اس گھرانے کی بہت تعریف کرتی تھیں۔ یہاں کراچی میں بھی میں لڑکے کو دیکھ چکا ہوں۔ گزشتہ سال وہ مجھے کینیڈا میں بھی ملا تھا۔ ملاقات رہی تھی۔ تمہاری۔ میرا مطلب ہے سائرہ کی بڑی پھوپھی کا لڑکا ہے۔ اکلوتا بیٹا دو بہنیں ہیں۔ امینہ مجھے تفصیلاً لکھ چکی ہے۔ میں اس لیے جلدی کر رہا ہوں کہ تمہاری طرف سے بہت فکر رہتی ہے۔"

وہ واضح طور پر نہ کہہ سکے۔ امینہ نے اس کی خودسری، ضدی پن، مستقبل کے خدشات ایک ایک بات بہنوئی کو لکھ دی تھی۔ یہ باتیں اگرچہ کسی نے پہلی مرتبہ انھیں بتائی تھیں مگر بہت دفعہ وہ شاہینہ کے بے جا لاڈ پیار کا اندازہ کر چکے تھے۔

اسے تو خاندان کے بارے میں کچھ علم نہ تھا۔ خدا معلوم کون سی پھوپھی تھیں اور کیسا لڑکا تھا۔ سارے زمانے میں ایک پاپا ہی سے اس کی رگ دبتی تھی۔ شاہینہ ہوتیں اسے ہر بات منوانا آسان تھی۔ اس کا دل تو چاہا کہ پاپا سے کہے مجھے اس کی صورت تو کم از کم دکھا دیجیے۔ پاپا تو اس کی خاموشی کو رضامندی سمجھے۔ ان کے خیال میں وہ کراچی میں مقیم ہر رشتے دار سے واقف تھی۔ "بڑی پھوپھی۔" کا اشارہ ہی کافی تھا۔ اب انھیں کیا پتا تھا کہ اسے اتنا تو پتا ہے کہ پھوپھیاں ڈھیروں ہیں مگر یہ نہیں معلوم تھا بڑی کون ہیں، منجھلی کون ہیں، چھوٹی کون ہیں؟

پاپا نے اس رشتے کو ترجیح اس لیے دی تھی کہ ایک تو وہ اس کی سگی پھوپھی کا گھر تھا۔

دوسرے فیملی بہت مختصر تھی۔ سوئم لڑکا لائق خوبصورت اور آگے بڑھنے کا جذبہ رکھتا تھا۔

جب تک شادی کی تاریخ نہ ٹھہر گئی اسے یقین نہیں آیا۔ اس نے امینہ کو کہلوا دیا تھا کہ گھر میں کوئی فضول رسم نہیں ہوگی۔ آخر اس کی بات ہی مانی گئی حالانکہ لوگوں کو اس گھر سے ایسی شادی کی توقع تھی جو برسوں یاد رہتی۔

صبح گیارہ بجے اس کا نکاح ہونا تھا، شام کو ہوٹل میں ڈنر تھا۔

آتشی گلابی بنارسی شلوار سوٹ میں ٹشو کا دوپٹہ سر پر پھیلائے وہ بے حد سادہ تھی۔ بال سلجھا کر ایسے ہی چھوڑ دیے تھے۔ امینہ نے شگون کے طور پر زبردستی اس کی ناک میں نتھ ڈالی۔ ایک نتھ ڈالنے سے ہی اس پر ایسا رُوپ آیا تھا کہ امینہ نے اسی وقت اس کی نظر اتاری۔ وہ آج بہت خوش تھیں کہ وہ اپنے بہنوئی سے زیادہ اس کی طرف سے فکر مند تھیں۔

اس کے حقیقی باپ ''دنیاوی'' باپ ایک دو خاندان کے دوسرے مردوں کے ہمراہ نکاح خوانی کو آئے تو وہ بڑے ضبط سے بیٹھی رہی۔

نکاح کے دوران جب اس نے سنا عارف ندیم کے ساتھ نکاح قبول ہے؟ تو اس کی ہتھیلیوں اور تلوؤں سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ کک، کہیں، ند، ندیم......'' اس کی آواز نہ نکل سکی۔

''بیٹی! کہو بیٹی! قبول ہے۔'' وہ سسک پڑی۔ آج اس کی کوئی سننے والا نہیں تھا۔ صحیح سننے والا بھی نہیں تھا کہ اس کی ماں شاہینہ نہیں تھی جو اس کی غلط بھی مانتی تھی۔ غلط بھی سنتی تھی۔

اسی دم پاپا کی آواز اُبھری ''پھول بیٹی!'' امینہ نے اس کے ہاتھ دبائے۔ انجانے واہموں سے امینہ کے ہاتھ لرزنے لگے تھے۔ انھوں نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر آہستگی سے کہا۔

''روتے نہیں بیٹی۔'' پھر آہستہ سے اس کے کان میں بولیں۔ ''خدا کے لیے پھول۔'' تب اس نے نم آواز میں کہا ''جی۔''

تین بار اقرار کیا تھا اس نے کہ جس کی صورت دیکھنے کی روادار نہیں تھی، اسے جیون بھر کا ہمسفر مان لیا ہے۔

اعصاب تو اس کے سدا ہی سے نازک تھے۔ ممی کہہ کر فوراً بے ہوش ہوگئی تھی۔

باہر عارف ندیم نے کاغذات پر دستخط کرتے ہوئے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبایا۔

''حیرت ہے پھول بیگم! کہیں یہ دستخط جعلی تو نہیں؟ تم میرے مقاصد زندگی میں

سب سے بڑا مقصد تھیں اور میں نے اتنی آسانی سے۔'' وہ سوچ کر رہ گیا۔

رخصتی تو ظاہر ہے رات ڈنر کے بعد تھی۔

وہ بھی دوپہر کا کھانا کھا کر سوگئی تھی۔ چار بجے حمیرا نے اسے جگایا کہ تیاری بھی کرنا تھی۔ پانچ بجے بیوٹیشن کو آجانا تھا۔ اس کی مرضی کے عین مطابق دوسروں سے قدرے مختلف شادی ہو رہی تھی۔

ابھی وہ چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر دلہن بننے کی تیاری کر رہی تھی کہ بیوٹیشن بھی آ گئی۔ وہ سہاگ کے پُرشکوہ غرارہ سوٹ میں ملبوس ڈریسنگ روم سے باہر آئی۔ سلام وجواب کے دوران بیوٹیشن اس کا چہرہ نظروں میں جانچتی رہی۔ اس کی نظروں میں پسندیدگی کا تاثر جھلک رہا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے اسے بٹھا کر ماہر آرائش حسن نے اس کا چہرہ تھاما۔

''بہت خوبصورت اسکن ہے آپ کی۔''

''میں میک اَپ نہیں کرتی، اس لیے شاید۔'' اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

بیوٹیشن اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔ اس نے پھول کے اصلی بالوں کا بے حد خوبصورت اسٹائل بنایا جو وہاں موجود سب لڑکیوں کو بہت پسند آیا۔ سب کی آنکھوں سے رشک جھانک رہا تھا۔ بڑی مہارت سے پھول کا میک اَپ کیا۔ گلاب کی اَدھ کھلی کلیوں اور موتیوں کی منہ بند کلیوں کا خوبصورت گجرا اس کے بائیں جانب اٹکایا تو ایسا ٹوٹ کے رُوپ آیا کہ حمیرا سے برداشت نہ ہوسکا، اس نے جھک کر پھول کا رخسار چوم لیا۔

''اے خیانت نہ کرو، بخشی نہیں جاؤ گی۔'' حمیرا کی چچا زاد بہن بولی۔ کمرے میں قہقہے گونج اٹھے۔ پھول جھینپ گئی پہلی بار۔ پھول کا یہ نخوت سے پاک اسٹائل سب کے دل میں اتر گیا۔

سرخ دہکتے نگینوں کا طلائی سیٹ پہنا کر سائرہ نے آگے بڑھ کر ماتھے پر بندیا ٹکائی۔

بیوٹیشن نے سرخ وسنہری زرتار آنچل اس پر پھیلا دیا۔

''چشم بددور۔'' سائرہ نہال ہوگئی۔

''ان کے ہسبینڈ کیسے ہیں؟'' بیوٹیشن نے شیشوں اور ڈبیوں کو ڈھکن لگاتے ہوئے تجسس سے پوچھا۔

''بھئی خاص طور پر اس کے لیے ہی بنائے گئے ہیں۔ بہت گریس فل، چارمنگ اور

ویل ڈریسڈ۔'' سائرہ نے خوش ہو کر تعریفوں کے پُل باندھے۔

وہ کرسی سے اٹھ کر صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ اسی وقت امینہ اندر داخل ہوئیں۔

''ارے بھئی لڑکیو جلدی کرو۔ اوہ، پھول تیار ہو گئی۔ ماشاء اللہ میری بیٹی کو کسی کی نظر نہ لگے۔ ذرا فضل سے کہو کالا بکرا ادھر ہی لے آئے میں اس کا ہاتھ چھوا دوں۔ آؤ پھول ذرا تم دروازے تک آ جاؤ۔'' انھوں نے پھول کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی چومی۔

''ماشاءاللہ''

فضل بکرا برآمدے میں لے آیا۔ امینہ اسے تھام کر دروازے تک لائیں، اس کا ہاتھ لگوایا اور فضل سے کہا کہ ذبح کروا کر گوشت غریبوں میں تقسیم کر دے پھر لڑکیوں کی طرف متوجہ ہوئیں۔

''بھئی، اب جلدی کرو۔ مہمان تو پہنچ گئے ہوں گے۔ چلو جلدی کرو شاباش۔ بھائی صاحب باہر انتظار کر رہے ہیں۔'' وہ کمرے سے باہر چلی گئیں۔

ایک گھنٹہ تو نکلتے نکلتے ہی لگ گیا۔ ایک گاڑی میں امینہ ان کے شوہر پھول کے پاپا، سائرہ اور حمیرا تھیں۔ باقی لوگ دوسری گاڑی میں تھے۔

ہوٹل کا استقبالیہ خصہ دور ہی سے جگمگ کر رہا تھا۔ سلونی شام دبے پاؤں رخصت ہو رہی تھی۔ جب پھول کو تھام کر گاڑی سے اتارا گیا، کئی جھماکے ایک ساتھ ہوئے۔ کئی لوگ کیمرے سے فیض اٹھانے میں مصروف ہو گئے تھے۔ دلہن کی آمد کا شور مچ گیا۔ سائرہ نے آتش شوق بھڑکانے کے لیے اس کا گھونگھٹ مزید آگے کھینچ دیا۔ ندیم اپنے دوستوں اور رشتے دار بھائیوں کے ہمراہ استقبالیے پر ہی تھا۔ کیمروں کی فلش نے اسے سیراب کر دیا تھا جن کے نورانی جھماکوں نے پھول کا چہرہ بے حد واضح کر دیا تھا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار ایک انوکھی سی مسرت اپنی رگ و پے میں اترتی محسوس کی۔

''ارے دلہا میاں بھی کھڑے ہوئے ہیں، دلہن کا چہرہ چھپاؤ۔'' لڑکیوں نے شور مچایا۔

ندیم سر جھکا کر مسکرا دیا۔ پھول کی تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا لڑکیاں اسے مسند کی سمت لے جا رہی تھیں اور وہ چابی بھری ہوئی گڑیا کی طرح عمل کر رہی تھی۔

اسے شوپیس کی طرح ایستادہ کر دیا گیا۔

ڈنر کے بعد تصاویر و موویز کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ ایک صوفے پر پھول کو بٹھا کر ندیم

کے لیے منادی کی گئی جو جانے کس کونے میں دوستوں سے نمٹ رہا تھا۔ اس کے غیر ملکی دوستوں کو بھی دلہن بہت پسند آئی تھی انھوں نے اسے مبارکباد دی تھی وہ انھیں ہی رخصت کر رہا تھا۔

جب وہ داخلی دروازے سے اندر داخل ہوا تو پھول سامنے ہی دیکھ رہی تھی۔ وہ سناٹے میں رہ گئی۔ گویا یہ عارف ندیم میری اتنی نفرت کے باوجود کہیں انتقاماً؟ بے شمار سوالات اس کے ذہن میں اُبھرے لیکن اس کا دل بجھ گیا تھا۔ پاپا یہ آپ نے کیا کیا؟ یہی آپ کو کینیڈا میں ملا تھا؟ یہی ہے وہ خوش شکل؟ یہی ہے وہ مؤدب و مہذب؟ پاپا میں نے آپ پر، آپ کی محبتوں پر اندھا اعتماد کیا۔ پاپا آپ نے یہ کیا کیا؟ میں دنیا میں کئی لوگوں سے چڑی مگر کبھی کسی کے سائے سے پناہ نہیں مانگی جس کے سائے تک سے پناہ مانگی۔ پھول کے لیے یہ ایک بڑا دھچکہ تھا۔ وہ جس کزن جس دلہا کی تعریفیں گزشتہ پندرہ دن سے سن رہی تھی۔ وہ یہ تھا؟

اس کا دل بجھ گیا۔ جس جیون ساتھی کے بارے میں وہ افتخار محسوس کر رہی تھی وہ یہ ہے؟ ندیم کو اس کے پاس بٹھا دیا گیا۔ وہ اس کا وجود محسوس کرتے ہی دوسری طرف تھوڑا سا کھسک گئی۔ اس کی یہ حرکت قطعی غیر ارادی تھی۔

''ارے سول انجینئر ضرور ہیں، سیمنٹ کے نہیں بنے ہوئے ہیں جو چبھیں گے۔'' اس کی کزن نے سرگوشی کی جو ندیم نے بھی سن لی وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔ اسی وقت کیمرہ چلا اور ایک حسین پوز ہمیشہ کے لیے مقید ہو گیا۔ رات گئے تک ہنگامہ رہا۔ رخصتی ہوئی اور وہ بہت ضبط سے گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی۔ سارے ہنگامے میں وہ شاہینہ کو ایک پل فراموش نہ کر سکی تھی۔ آج ممی ہوتیں تو اس تقریب کا چہرہ ہی بدلا ہوتا۔ اس نے دکھ سے سوچا تھا۔ گاڑی ندیم ڈرائیو کر رہا تھا۔ ساتھ میں چھوٹی بہن تھی۔ پچھلی نشست پر پھول اپنی ساس یعنی بڑی پھوپھی اور دونوں نندوں کے ہمراہ تھی۔ ندیم نے گاڑی میں بیٹھتے ہی اندرونی بیک ویو مرر کا زاویہ بدلا تو ساتھ بیٹھی بہن شوخی سے کھنکاری تھی۔ پھوپھو ان سب باتوں سے بے نیاز ایک طرفہ گفتگو میں مصروف تھیں۔

''ارے دلہن! یہ کڑے چھوٹے تو نہیں پڑے۔ اب اتنی جلدی کیسے بنتے، بنے بنائے لینے پڑے۔ مجھے تو فکر ہو رہی تھی کہ چھوٹے نہ پڑ جائیں۔ وہ سیٹ کی انگوٹھی تو ڈھیلی ہو گی۔ دھاگہ لپیٹ لینا، کبھی گر جائے۔''

''ارے امی! اتنی سمجھ تو پھول بھابی کو بھی ہو گی۔'' آگے بیٹھی روشن نے سر گھما کر ماں سے کہا۔

"ارے ان ہنگاموں میں تو سمجھ بھی پھر جاتی ہے۔ اس۔"

"امی! گھر جا کر پہلی فرصت میں چیک کر لیجیے گا۔" ندیم نے مسکراہٹ دبا کر ایک موڑ کاٹا۔

وہی چبھتا ہوا لہجہ جو پھول کے تن بدن میں آگ بھر دیتا تھا۔ پھوپھی کی تو سمجھ میں نہیں آئی ندیم کی بات مگر روشن نے بھائی کو گھورا۔

"بڑی بات بھائی جان۔"

مگر پھول کا ذہن گاڑی میں نہیں تھا اس کے ذہن میں الگ ہی کھچڑی پک رہی تھی۔

وہ پھوپھی کی ہدایتوں سے بیزار ہو رہی تھی۔ توبہ پھوپھی کا نام توصیفہ کے بجائے ہدایت جہاں یا مشورہ بیگم ہونا چاہیے تھا۔ پھول نے بیزار ہو کر سوچا۔ اس نے کاہے کو یہ نصیحتیں و ہدایتیں سنی تھیں۔

گھر جا کر پھوپھی کو کچھ شگون اور یاد آ گئے۔ نازک مزاج پھول تھک کر چور چور تھی۔ ضبط کرنے کی تو اس کی عادت نہیں تھی، روشن کے کان میں بولی۔

"خدا کے لیے مجھے کہیں لٹا دو، مجھے چکر آ رہے ہیں۔" چکر کا سن کر تو روشن حواس باختہ ہو گئی اور لمحہ ضائع کیے بغیر اسے آراستہ کمرے میں لے آئی۔

کمرہ ایئر کنڈیشنر سے ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ وہ وسیع بیڈ پر بے دم ہو کر لیٹ گئی اور لگی زیور اتارنے۔

"ار، رے نہیں بھابی! پلیز جہاں اتنی دیر، وہاں......" روشن نے اس کے ہاتھ تھام لیے منت سے۔ وہ بھی نیکی کے موڈ میں تھی، نند کی بات مان گئی۔

روشن کے جاتے ہی ندیم کو بھیج دیا گیا کہ وہ دلہن کی دل جوئی کرے۔ وہ اندر آیا تو اس کا نصیب بلکہ خوش نصیبی تکیے پر سر ٹیکے بالکل بے دم تھی۔

اس نے صوفے پر بیٹھ کر آرام سے جوتے اتارے، ساتھ اس کا جائزہ بھی لیتا رہا۔

"میں نے کہا محترمہ! آج کی جمع شدہ توانائیاں بھی آج کے دن کام نہ آئیں۔ جو شخص کبھی ہل کر پانی نہ پئے اس کی توانائی کا ذخیرہ اس قدر تو ہوگا کہ ایک چھوٹا موٹا ایٹمی بجلی گھر چل سکے۔" اس نے میز پر پاؤں پھیلا دیے۔

پھول کے تھکے ہوئے اعصاب پر اس کی بات ہتھوڑا بن کر لگی۔ وہ نباہ کے تصورات

میں کھوئی تھی کہ وہ ہزار منہ پھٹ، بددماغ اور مغرور تھی مگر مشرقی لڑکی تھی۔ ایسے گھرانے کی لڑکی جہاں لڑکیاں ماؤں سے تو الجھ کر بات منوا سکتی ہیں مگر باپ کے سامنے حد ادب ان کے پاؤں کی بیڑی بن جاتی ہے اور عارف ندیم کو تو اس نے خود قبول کیا تھا جس کی تعریفوں میں گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والے پاپا نے زمین آسمان کے قلابے ملا دیے تھے۔ یہ فیصلہ اس باپ کا تھا جس نے پھول نام رکھ کر بالکل پھولوں کی طرح رکھا تھا؟ چند گھنٹے قبل جب شکست کا احساس کر کے اس کے اعصاب چٹخنے لگے تھے ایک اور خوبصورت احساس کسی کونے سے ابھرا۔

"ندیم ایک بہادر، پُرعزم مرد۔ عورت اگر مضبوط کردار کی ہو تو چیلنج کرنے اور جیتنے والے مرد سے ضرور متاثر ہوتی ہے۔ پتھر سے پتھر عورت بھی اس وقت پگھل جاتی ہے جب مرد اسے جیتتا ہے، اسے سر کرتا ہے، مغرور و مضبوط عورت کبھی شکست نہیں کھاتی۔ کھاتی ہے تو تسلیم نہیں کرتی لیکن صحیح معنوں میں پُرعزم مرد مل جائے تو قدر کرتی ہے۔"

پھول کو اس کا جیت لینا اچھا لگا۔ وہ کسی کے اعصاب پر سوار ہے کسی نے اسے اپنانے کے جتن کیے۔ پھول کو اپنے مقام کا پتا تھا مگر آج غرور بے توڑ نشہ بن گیا تھا۔ گویا اس نے سمجھوتا کر لیا تھا لیکن اس وقت ندیم کا انداز، نہ وہ پروانہ بنا اور نہ بھسم ہوا، نہ وہ عاشق بنا اور نثار ہوا۔ یہ انداز محبت کرنے والوں کے جیتنے والوں کے تو نہیں ہوتے۔ پھول اسی طرح دراز رہی۔

وہ ننگے پاؤں قالین پر جماتا آہستہ آہستہ اس کے نزدیک چلا آیا۔

آنکھیں بند کیے وہ نڈھال تھی۔ بند آنکھوں کی پلکیں تھرتھرا رہی تھیں۔ وہ ایک لمحے کو مبہوت ہو گیا۔ اسی دم پٹ سے پھول نے آنکھیں کھول دیں۔

وہ ایک دم سنبھل گیا۔ "ارے شکر ہے زندہ ہو۔" وہ مسکرایا "میں تو ڈر ہی گیا تھا کہ......"

کیسی نفرت انگیز بات جو محبت کرنے والے سوچتے بھی نہیں۔ اتنی خوبصورت رات اور مرنے مارنے والی بات!

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی، ضبط کی پرت پرت اترنے لگی۔

"میں اس لب و لہجے اور اس قسم کی باتوں کی عادی نہیں ہوں۔" وہ زیادہ نیکی کی راہ نہ چل سکی، بگڑ اٹھی۔ اب اس کے تصور میں عارف ندیم نہیں بلکہ ندیم تھا جس کی تلخ باتیں سن کر اسے اپنے ہار جانے کا احساس ہو رہا تھا۔

"مسٹر! زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے پاپا اتنے

سیدھے ہیں کہ ان نوجوانوں سے متاثر ہو جاتے ہیں جو قرض حسنہ کے ذریعے کینیڈا پہنچتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے میری حیثیت؟ شاید نہیں معلوم جب ہی اس طرح کی باتیں کرتے ہیں، گویا میں آپ کی بے دام ہوں۔ ہمارے گھر سے لوگ اپنے اسکولوں کے لیے فنڈ لے کر جاتے ہیں۔ آپ جیسے لوگوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کے اخراجات اٹھاتے ہیں۔ آپ اگر غیر ہوتے تو شاید میری ڈھول بھی نہ پاتے۔ پاپا نے آپ کو رشتے دار ہونے کے ناتے ترجیح دی اور آپ۔''

پھول نے شکست کا لاوا بہاتے ہوئے لمحہ بھر کو بھی نہ سوچا کہ اس وقت وہ ندیم سے نہیں اپنے قانونی و مذہبی شوہر سے مخاطب ہے۔ وہ مشرق میں شوہر کی حیثیت سے شاید قطعی نابلد تھی۔

''ختم ہو گئی آپ کی تقریر؟'' وہ کٹیلے انداز میں مسکرایا۔

''ارے پھول بیگم! کیا سمجھتی ہیں آپ کہ حسن آپ پر ختم ہے؟ ہم جیسے سیلف میڈ لوگوں کو اَپر کلاس جال پھینک کر کھینچتی ہے۔ ان کے اپنے لڑکے تو عیاشیوں میں پڑ جاتے ہیں یا باہر شادیاں کر لیتے ہیں۔ پھر یہ طبقہ مڈل کلاس، تازہ ترقی پسند اور ذہین نوجوانوں کو کاروبار میں شیئر کے ساتھ داماد بناتا ہے۔ ایک سے ایک لڑکی مجھے مل سکتی تھی۔ تم سے تو میں نے ثواب کمانے کے لیے شادی کی ہے۔'' اس کا لہجہ دو دھاری تلوار ہو گیا اور لفظ ''ثواب'' سن کر تو پھول کے جیسے بھڑیں چمٹ گئیں وہ ہسٹریائی انداز میں رونے کا پروگرام بنانے لگی تھی کہ ندیم نزدیک آ گیا۔

''میں تم جیسی بدزبان، مغرور لڑکی کو سیدھا کرنے کا عزم لے کر اس آگ میں کودا ہوں اور ظاہر ہے یہ ثواب کا کام ہے۔ اچھا خیر چھوڑو۔ یہ آج کیا بے سروپا باتیں شروع ہو گئیں۔''

اس نے مسکرا کر بڑی چالبازی سے کہا اور پھول بری طرح بدک کر پیچھے ہٹ گئی۔

اسے اس وقت اپنی بے بسی کا پورا پورا احساس ہو چکا تھا۔ وہ سسک پڑی۔

''آپ اگر میرے پاس آئے ناں تو میں جان دے دوں گی۔ دیکھیے گا صبح سب کو بتا دوں گی کہ یہ شادی نہیں انتقام ہے۔ جو جو آپ نے کہا ہے وہ بھی سب کو بتا دوں گی۔'' اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ ''آپ مجھے ٹھیک کریں گے؟ صبح ہو جائے تو ہوش ٹھکانے لگا دوں گی۔'' اس نے روتے روتے ناک پونچھی ''اور میں صبح ہی چلی جاؤں گی کسی سے بات نہیں کروں گی نہ امینہ خالہ سے نہ پاپا سے۔ اپیا بجو وغیرہ تو میری پکی دشمن ہیں، جلتی ہیں مجھ سے جب ہی تو صاف صاف نہیں بتایا کہ...... میں سمجھی پتا نہیں کون اوتار آسمان سے اترا ہے اس خاندان میں۔ میں سب پر لعنت بھیجتی ہوں۔'' اس کا انداز ہسٹریائی ہو گیا تھا۔ وہ باقاعدہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

''اگر میری ممی زندہ ہوتیں تو مجھ پر کبھی بُرا وقت نہیں آتا۔ آہ! میری ممی۔''

''چپ ہو جاؤ پھول! مت تماشا بناؤ۔ بااختیار ہو۔ خدا تو نہیں ہو۔ بہت شوق سے جانا اور مت واپس آنا۔ سن لو پھول جو دلہن پہلی رات سسرال گزار کر جائے اور پھر اس کا شوہر پلٹ کر اسے لینے کبھی نہ جائے تو ٹھیکرا ہوتی ہے اس معاشرے میں۔ خواہ وہ کتنی خوبصورت کیوں نہ ہو۔ ایک حسین عورت کو اس کا شوہر لینے نہ جائے تو لوگوں کے لیے یہ بڑی آسان بات ہوتی ہے خواہ وجہ اور کوئی بھی ہو۔ سبب کوئی دوسرا بھی ہو، میں ابھی تک تمہارا خیر خواہ ہوں۔ تمہیں سمجھانے کو کہہ رہا ہوں۔''

''نہیں چاہیے مجھے تمہاری خیر خواہی۔ دھمکیاں دے رہے ہو مجھے؟''

''تمیز سے بات کرو۔'' ندیم نے گرج کر کہا اور فوراً باہر نکل گیا۔

''ہونہہ؟'' اس نے سر جھٹکا ''سیدھا کر دیں مجھے نہ کر دیا تمہیں الٹا تو پھول نام نہیں۔'' وہ ناک پونچھتے ہوئے پھنکاری۔

صبح اس نے سنا روشن پھوپھی جان سے کہہ رہی تھی۔

''امی ندیم بھائی کہہ رہے ہیں کہ بھابی ابھی نہیں جائیں گی اپنے میکے۔ وہ کہہ رہے ہیں شام کو ولیمے کے بعد چلی جائیں گی اور کل ہم لوگ لے آئیں گے۔''

''ٹھیک ہے، جیسے اس کی مرضی۔'' پھوپھی نے قصہ کوتاہ کیا تھا۔

روشن دونوں کا ناشتا کمرے میں لے آئی تھی۔ اس نے صرف ایک کپ چائے کا لیا۔

''ارے بھئی! ناشتا کرو، موٹی ہو جاؤ گی تو بھی کوئی بات نہیں۔'' آخر ندیم کو اس پر ترس آ گیا مگر وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔

وہ ناشتا کرنے کے بعد اخبار کھول کر بیٹھ گیا۔ اس نے آج تک کسی دلہا کو ولیمے کی صبح دلہن کے پاس بیٹھ کر اخبار پڑھتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اٹھ کر سنگھار میز کے سامنے بیٹھ کر کیوٹکس چینج کرنے لگی۔

ناشتے سے فارغ ہو کر وہ باہر نکل گیا، بنا کوئی بات کیے ہوئے۔

پھول نے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ سفید کرتے پائجامے میں وہ نظر انداز کیے جانے کے قابل نہیں لگ رہا تھا۔

''ہونہہ، بہت اچھا کیا عارف جو اپنے ارادے ظاہر کر دیے۔ تم کیا سیدھا کرو گے

مجھے؟'' اس نے نخوت سے سوچا۔

ولیمے کے بعد پاپا اور دوسرے لوگوں کے ہمراہ وہ گھر چلی آئی تھی۔ اگرچہ اس نے اپنے کمرے میں آکر بہت سکون محسوس کیا لیکن آج اسے سب کچھ اجنبی اجنبی لگ رہا تھا۔

شام کو روشن کا فون آیا تھا کہ میں اور امی آپ کو نو بجے تک لینے پہنچ جائیں گے۔

ایک دم ندیم کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرا کر گونجی ''جس دلہن کو دلہا لینے نہ پہنچے......''

''روشن! ندیم نہیں آئیں گے؟'' اس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

''بھابی! ظاہر ہے انھیں ہی پہنچنا چاہیے لیکن شام سے بھائی جان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔''

اس نے مروتاً یہ بھی نہیں پوچھا کہ کیا ہوا اتنی بات بھی اس نے اپنی غرض و عزت نفس کی خاطر کر لی تھی۔

''روشن! جب وہ ٹھیک ہو جائیں تو آ جائیں۔ ایسی جلدی بھی کیا ہے؟''

''مطلب یہ ہوا بھابی! کہ آپ صرف بھائی جان کے ہمراہ ہی آئیں گی۔'' روشن نے شریر لہجے میں پوچھا۔

وہ خاموش رہی۔ روشن نے اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے فون رکھ دیا۔

نو بجے تک اس نے انتظار کیا پھر پاپا کے ہمراہ کھانا کھا کر اپنی خواب گاہ میں آ گئی اور ایزی چیئر پر بیٹھ کر میگزین کی ورق گردانی کرنے لگی۔ جانے کیوں اس کا دل کہہ رہا تھا وہ آئے گا اور بعض اوقات جب دھڑکنیں سمٹ کر سکڑ کر ایک خدشہ ظاہر کرتی ہیں تو دل کی بات سچ نکل آتی ہے۔ وہ آ گیا تھا، دندناتا ہوا سیدھا خواب گاہ میں۔ دروازہ تھپتھپانے کے ساتھ ہی وا ہو گیا تھا۔ صبح والے کرتے پائجامے اور گریس فل ہیئر اسٹائل کے ہمراہ آتے ہی گویا ہوا تھا۔ وہ فیروزی کرتے پائجامے اور بنارسی دوپٹے میں میک اَپ و زیورات کے ہمراہ اسے گھائل کرنے کو تیار بیٹھی تھی مگر اس نے نظر چرا کر فوراً کہا تھا۔

''بھئی اب جلدی سے کھڑی ہو جاؤ۔ آدھی رات تو ہو چکی ہے۔'' اس کا جی چاہا کہ پوچھے کہ پھوپھی جان اور روشن نہیں آئیں؟ مگر وہ خاموش رہی۔ بس اتنا کہا۔

''پاپا سے تو مل لیں۔''

''بھئی! انہی کے درشن یاترا سے فارغ ہو کر آ رہا ہوں اور ان کا ہی حکم ہوا تھا کہ ''دیوان خاص'' میں حاضری دوں۔ انھوں نے شاید ہمیں تنہائی کا موقع دیا تھا مگر اس کی کوئی

ضرورت نہیں تھی۔ میں نیچے ہوں آ جاؤ۔''

اس کا حکمیہ لہجہ پھول کو پھر سلگا گیا مگر وہ وینٹی پرس اٹھا کر اس کے پیچھے ہی نکل آئی۔ پاپا سے اجازت لے کر وہ سرخ کرولا میں آ کر بیٹھ گئی۔ دوسری سمت سے وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا اور اندرونی لائٹ آن کر دی۔ نظر بچا کر پھول کو دیکھا اور غزلوں کی کیسٹ لگا دی۔ زہرہ نگاہ کی خوبصورت غزل طاہرہ سیّد کی آواز میں اُبھری:

اپنا ہر انداز آنکھوں کو تر و تازہ لگا
کتنے دن کے بعد مجھ کو آئینہ اچھا لگا

وہ بدستور کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔

''ارے بھئی روشن اور امی بھی تمھیں گاڑی میں لے کر جاتیں، گدھا گاڑی میں تو نہیں۔ تمھیں تو کسی کی بیماری کا بھی احساس نہیں۔'' وہ زیادہ دیر پتھر نہ بن سکا۔

''میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ آپ لوگ آج ضرور لینے آئیں۔'' اس نے بڑی خود اعتمادی اور تیہے سے ندیم کو دیکھا جو سامنے بہت توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ غزل کا آخری شعر اُبھرا۔

میں تو اپنے آپ کو اس دن بہت اچھی لگی
وہ جو تھک کر دیر سے آیا اسے کیسا لگا؟

''بہت اچھا لگا۔'' ندیم سوچ کر رہ گیا اور بہت ضبط سے ڈرائیو کرتا رہا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ ستائش اس کریلے کے لیے ''نیم'' ثابت ہو گی۔

اس نے گاڑی پورچ میں داخل کر کے اس پر ایک نگاہ ڈالی۔

''ابھی گھر میں مہمان بھرے ہوئے ہیں کیوں ہماری کرکری کرانے پر تلی ہوئی ہے؟ کم از کم دلہن ہونے کے ناتے آنچل سر پر ڈال لو۔'' اس نے جیسے ندیم کی بات ہی نہیں سنی۔ وہ تو روشن بھاگتی ہوئی آ گئی تھی اور اسے اتارتے ہوئے بڑی ترنگ میں آنچل بھابی کے سر پر ڈال کر تھام کر اندر لے گئی تھی۔

رات کو ندیم نے اس سے کہا تھا۔

''دیکھو بھئی! میں تو گرمیوں میں کھلی ہوا میں سونے کا عادی ہوں اور اُوپر مچھر دانی لگا کر سوتا ہوں۔ تم سو سکتی ہو تو تم بھی چھت پر چلو۔ ایک مچھر دانی اور بھی ہے۔'' اس نے بڑی فراخدلی سے کہا۔

''میں نے یہ واہیات چیزیں کبھی استعمال نہیں کیں اور نہ ہی مجھے چھتوں پر سونے کا

شوق ہے۔'' وہ بھنّا کر گویا ہوئی تھی۔

ندیم تکیہ بغل میں داب باہر نکل گیا اور وہ سر ہاتھوں میں تھام کر رگ رگ میں نفرت کا زہر اتارنے لگی۔

پھر تو ہر روز اس کے پندار کے شیشے پر ضرب پڑنے لگی۔

شاید اس کی شادی کو پندرہ روز ہوئے تھے۔ پاپا نیویارک جا چکے تھے۔ اب تو گھر پر بھی کوئی نہ رہا تھا۔ آج صبح جب وہ ہمیشہ کی سی بے فکر نیند میں ڈوبی ہوئی تھی، کسی نے اس کا کندھا ہلایا۔ اس کی میٹھی نیند ٹوٹ گئی۔ سامنے ندیم کھڑا تھا۔

''ارے بھئی! مجھے پونے چھ بجے ناشتا کرنے کی عادت ہے، اب میں اپنی بوڑھی ماں کو کب تک پریشان کرتا رہوں۔ ذرا ناشتا تو بناؤ۔ ایسا کوئی لمبا چوڑا ناشتا نہیں کرتا۔ آملیٹ اور ٹوسٹ۔ اٹھو بھئی، پونے چھ بجے کے بعد میری بھوک ختم ہو جاتی ہے۔''

وہ تو ایک دم حیران پریشان اس کی صورت دیکھ رہی تھی پونے چھ بجے؟ ناشتا؟ اس نے گھڑی دیکھی ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ باہر بھی ہلکی ہلکی روشنی ابھری تھی۔

اس کے پورے وجود میں ناگواری کی لہر دوڑ گئی۔

''مجھے ناشتا بنانا نہیں آتا۔'' وہ بے زاری سے گویا ہوئی۔

''ارے بھئی! میں کون سا تم سے حلیم پکوا رہا ہوں۔ سیدھا سادا آملیٹ۔ انڈا توڑنا تو آتا ہوگا اسی بہانے جلدی اٹھ جایا کرو گی، فجر کی نماز بھی پڑھ لیا کرنا۔ حضور ﷺ نے معراج کی شب ایک ایسا مسلمانی گروہ دیکھا جن کے سر پتھروں سے کچلے جا رہے تھے پتا چلا یہ وہ لوگ ہیں جو فجر کے وقت پڑے سویا کرتے تھے۔'' اس نے کھڑے کھڑے ایک اور حربہ آزمایا۔

پھول کے اعصاب پر ابھی تک نیند کا غلاف چڑھا تھا۔ منہ اندھیرے سر منہ کچلنے کا سن کر بھک سے نیند اُڑ گئی۔ پھر منہ موڑ کر بولی۔

''میں نماز پڑھ لوں گی، مگر مجھ سے یہ آدھی رات کو اٹھ کر ناشتا نہیں بنے گا۔''

ندیم زیر لب مسکرا دیا۔ ''چلو کچھ تو کرو۔ آہستہ آہستہ ناشتا بھی بنانے لگو گی۔''

وہ جاتے جاتے پلٹ پڑی۔

''میں کچن کا کام کرنے کی عادی نہیں ہوں۔ پھوپھی نہیں کر سکتیں تو خانساماں رکھ لیں۔''

نماز پڑھ کر وہ پھر سو گئی تھی۔

پھول اپنی عادت کے خلاف حیرت انگیز طور پر بہت ضبط کر رہی تھی۔ یہ سارے ضبط

اس کی اپنی انا، اپنے پندار کے لیے تھے۔ ندیم سے بہت کم اس کا سامنا ہو رہا تھا۔

رات کو وہ اپنی مچھر دانی میں ہوتا تھا اور وہ ایئر کنڈیشنڈ خواب گاہ میں۔ چار پانچ مرتبہ کے ضبط کے بعد وہ بری طرح پھٹ پڑی۔

کئی روز سے دعوتوں کا سلسلہ جاری تھا اور وہ اس کی تیاری میں دخل دیا کرتا تھا جن پر وہ عمل تو نہیں کرتی تھی مگر جان تو جلتی تھی۔

اس نے سبز ساڑھی پھیلائی تو ندیم نے مشورہ دیا کہ اس کے ساتھ براؤن بلاؤز پہنو۔ وہ ایک دم سلگ اٹھی۔

''یہ سبز کے ساتھ براؤن کا کیا کنٹراسٹ ہے؟''

''کیوں نہیں ہے، دیکھنا سب سراہیں گے۔ جوڑا وڑا مت باندھنا۔ چوٹی میں سفید پراندہ ڈالو اور چاندی کا زیور پہنو۔ گرے سینڈل پہنو۔ تم گھبراؤ مت کوئی پوچھے گا تو میں کہہ دوں گا کہ قوس وقزح نیا فیشن ہے تم دیکھنا پھر سب تقلید کریں گے۔ قوس وقزح تو سب کو اچھی لگتی ہے۔''

وہ اتنا سیریس تھا کہ وہ سلگ اٹھی اور اپنے پرانے انداز میں چل کر اس کے پاس آئی۔

''ندیم صاحب! آپ میری نرمی سے خوش فہمی میں مبتلا مت ہوں۔ میں اس ملک کی ان لڑکیوں میں سے ہوں جو فیشن تخلیق کرتی ہیں تقلید نہیں۔ آپ حکم چلا کر خوب خوش ہوتے رہیے۔ میری مصلحت کوشی کو اپنی کامیابی سمجھیے۔ ندیم صاحب میں اس خاندان کی سب سے دولت مند لڑکی ہوں۔ دولت وحسن میرا اثاثہ ثانیہ ہے اور عزت ووقار اثاثہ اوّل کیونکہ اس کے بغیر وہ اثاثے دھندلا جائیں گے، بے تاثر ہو جائیں گے۔ میں اپنی قسمت کے اس تاریک دور میں کسی جذباتیت سے کام لے کر اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا نہیں چاہتی۔ انسان اس دنیا میں زندگی گزارنے آیا ہے ناں، تو شان سے زندگی گزارے۔ آپ اپنی شان کی حفاظت کریں اور میں اپنی آن بان اور شان کی۔ براہ کرم مجھ پر احکام صادر کرنے کی کوشش نہ کریں، ورنہ یہ کسی کے لیے بھی اچھا نہیں ہوگا۔''

ندیم کے لیے اس کا انداز ناقابل برداشت ہو گیا۔

''پھول! تمیز سے بات کیا کرو، کیا شان ہے تمہاری؟ تین بول کے عوض یہاں آئی ہو تین بول کے عوض یہاں سے واپس بھیج سکتا ہوں۔''

پھول سناٹے میں رہ گئی۔ اس کے گمان جھوٹے نکلے۔ وہ جیتی نہیں گئی تھی انتقام کا

نشانہ بنی تھی۔ محبت کرنے والے فراق کے ذکر سے بھی ڈرتے ہیں اور یہ، یہ شخص...... وہ ندیم کے نزدیک چلی آئی۔

''ندیم صاحب! لوگ محبتوں سے جیتے جاتے ہیں، نفرتوں سے نہیں۔ آپ لوگ ہمارے معیار کے نہیں ہیں۔ میں پونے چھ بجے آپ کو ناشتا نہیں دے سکتی۔ میں آپ کے منتخب کیے ہوئے، آپ کی ذہنیت کے غماز لباز نہیں پہن سکتی، میں چھتوں پر نہیں سو سکتی۔ میرے پاپا سیدھے سادے آدمی ہیں، آپ انھیں پھنسا سکتے ہیں مجھے نہیں۔ مجھ سے شادی کرنے سے پہلے آپ کو معلوم کر لینا چاہیے تھا کہ دولت مندوں کی اکلوتی بیٹیاں کیسے رکھی جاتی ہیں۔'' اس نے اپنا وینٹی پرس اٹھایا، آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بال سیٹ کیے۔

''تم تو چار بہنیں ہو، جن کی دولت پر تم نازاں ہو وہ۔''

''میں نے جس محل میں آنکھ کھولی ہے، وہ میری راجدھانی ہے، وہاں میرا حکم چلتا ہے میں اس کی مالکن ہوں۔ جنھوں نے مجھے محبتوں سے نوازا وہ ہی میرے والدین ہیں۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر ترشی سے بولی۔

''اور ندیم صاحب ایک بار کینیڈا اور ہو آیئے ہو سکتا ہے اس بار زیادہ اچھی آسامی۔''

چٹاخ...... ندیم کا ہاتھ میکانکی انداز میں اس کے رخسار پر جا پڑا تھا اور وہ نادم بھی نہیں تھا۔

''پھول! تم میری پسلی سے نکلی نہیں لگتیں۔ میری پسلی اتنی ٹیڑھی تو نہیں ہو سکتی۔ میں نے تو سوچا تھا محبتیں سب پر ایک سا اثر کرتی ہیں۔ جاؤ تم سونا بچھا کر سو، نوٹوں کی چادر بنا کر اوڑھو، بے وقوف لڑکی۔'' وہ پردہ اٹھا کر تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔

امینہ پھوپھی، خاندان کے دیگر بڑے اسے سمجھا چکے تھے اور اس نے قطعیت سے کہہ دیا تھا کہ اس کا ندیم سے کوئی رشتہ نہیں۔ اس فیصلے کے بعد بے حد پرسکون تھی اور اپنی پرانی مصروفیات میں مصروف ہو گئی تھی۔ روشن فون پر رونا دھونا مچاتی تھی۔ پھول نے نوکر سے کہہ دیا کہ اگر روشن کا فون آئے تو اسے نہ بلایا جائے۔

''بھائی، بھائی، تعویز بنا کر گلے میں ڈال لو روشن بیگم، ہونہہ۔''

رمضان شروع ہو گئے تھے۔ روزے تو اس نے ساری عمر میں گنتی کے رکھے تھے مگر عید اکثریت کی طرح بے حد اہتمام سے مناتی تھی۔

گھر کی نئے سرے سے سیٹنگ ہو رہی تھی۔ پاپا کے دوست، ممی کی سہیلیاں، ان کے بچے اسے مبارکباد دینے آتے تھے جو اس کے گھر لباس حسن کی تعریفوں سے اس کی گردن میں مزید کلف لگاتے تھے۔

چاند رات تک تمام صفائی وغیرہ ہو چکی تھی۔ وہ اپنے ملبوسات وارڈ روب میں لٹکا چکی تھی۔ مہندی کا تو اسے شوق نہیں تھا۔ وہ ایئر کنڈیشنر تیز کر کے نوکروں کو کوارٹروں میں بھیج کر لمبی تان کر سو گئی۔

ایک بجے کے قریب شور سے اس کی آنکھ کھل گئی، اسے گمان ہوا، نوکر جو اندر ہی رہتے تھے، سحری کرنے اٹھے ہیں۔ اس نے غور سے دیکھا تو ایک بج رہا تھا۔ اسی دم کسی کے بھاگنے کی آواز آئی۔ مردانہ قدموں سے کاریڈور میں دھمک پیدا ہو رہی تھی وہ چادر پھینک کر اٹھی اور نیچے جھانکا تو اس کا سانس چلنا بھول گیا۔ کالے کالے ڈھاٹے باندھے، اونچے لمبے ڈاکو نوکروں کو رسیوں سے جکڑ رہے تھے۔ غفور کے منہ میں کپڑا ٹھونسا ہوا تھا۔ وہ ستون سے بندھا ہوا تھا۔

پھول کی ٹانگیں بے جان ہو گئیں، وہ خود کو گھسیٹ کر فون تک لائی اور تھانے کے بعد امینہ کے گھر ڈائل کیا اور شکر ادا کرنے لگی کہ فون کی تاریں نہیں کاٹی گئی تھیں۔

اتنی دیر تک گھنٹی بجتی رہی، فون کسی نے نہیں اٹھایا۔ اسی دم کسی کے زینہ طے کرنے کی آواز آئی تو پھول کی گھگھی بندھ گئی۔ اس نے روشن کا دیا فون نمبر ملایا۔

اسی دم دروازہ دھڑ دھڑایا گیا۔

''دروازہ کھول سیٹھانی۔''

پھول ٹیلی فون سیٹ اٹھا کر ڈریسنگ روم میں گھس گئی۔ اس کے حواس جواب دینے لگے تھے۔

''سیٹھانی دروازہ کھول، ورنہ دروازہ توڑ دیں گے۔'' سندھی لہجے میں کوئی غرایا اور دروازہ بڑی طرح پیٹ ڈالا۔

اسی دم دوسری طرف کسی نے فون اٹھا لیا تھا۔ آواز ابھری تھی۔ ''ہیلو۔''

''مم...... میں، پھول۔''

''سیٹھانی تیری خیر نہیں۔''

''ہائے اللہ۔'' دوسری طرف پھول کی ہائے اللہ سنی گئی۔ اس کے منہ سے بمشکل نکلا۔

ڈاکو، اسی دم کوئی کھڑکی توڑ کر کودا۔ پھول کے اعصاب جواب دینے لگے۔ اس نے فون لکڑی کی

میز کے نیچے چھپا دیا۔ اسی دم ایک سیاہ طوفان اندر جھانکا اور پھول تاب نہ لا سکی، اگلے لمحے وہ بے خبر تھی۔



''پھول، پھول۔'' کوئی اس کے رخسار تھپتھپا رہا تھا، غالباً اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے گئے تھے۔ پھول نے آنکھیں کھولیں وہ اپنے دبیز بستر پر تھی کوئی اس پر جھکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ دیکھنے کے قابل ہوئی۔ لائٹ براؤن نائٹ سوٹ میں ندیم اس کے بہت قریب تھا۔ اسے ایک دم وہ خوفناک منظر یاد آیا جب ڈریسنگ روم کا سرخ پردہ کھسکا تھا۔

وہ چیخ کر اٹھ بیٹھی۔ ندیم کے گلے سے لگ کر وہ بڑی اپنائیت سے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''وہ سب کہاں ہیں؟ آپ کیسے آئے؟''

''ارے بھئی! مجھے ان سب کی تو خبر نہیں فکر تو بس تمہاری تھی، شکر ہے کہ تم ٹھیک ہو۔''

''وہ ڈاکو کہاں ہیں؟ کیا کیا لے گئے؟''

''بھئی! پکڑا تو ایک گیا ہے باقی شاید بھاگ گئے۔ تم نے شاید پولیس کو فون کر دیا تھا۔ دیکھو بھئی تم بالکل ٹھیک ٹھاک ہو۔ صبح کے پانچ بج رہے ہیں، گھر میں کسی کو نہیں معلوم کہ میں ادھر آیا ہوں۔ عید کا دن شروع ہو چکا ہے۔ امی اٹھ چکی ہوں گی مجھے نہ پا کر پریشان ہوں گی۔'' وہ ایک دم اجنبی انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔

پھول نے چونک کر دیکھا۔ وہ اسے روکنا چاہتی تھی۔ اس سے کچھ پوچھنا چاہتی تھی لیکن اس کا نروٹھا پن دیکھ کر وہ اپنی انا پرست طبیعت کو آمادہ نہ کر سکی کچھ بھی کہنے پر۔

ندیم نے ٹیبل سے اپنی رسٹ واچ اٹھائی اور اس کی طرف پلٹا۔ ''اچھا بھئی عید مبارک، آئندہ ڈاکو آنے تک خدا حافظ۔'' کیا انداز تھا جتانے کا۔

''آپ نہ جائیں، فون کر دیں کہ میں یہاں ہوں۔'' اندر کی زبردست طاقتوں سے نبرد آزما ہو کر اس کی خالص آواز دھیمے سے اُبھری۔

ندیم نے چونک کر اس کی سمت دیکھا۔ ''ارے نہیں بھئی! ماں بہنوں کے سامنے تھوڑی بہت عزت ہے۔ کیا سوچیں گی کہ ندیم صاحب بھی کیا بے حمیت انسان ہیں۔ بیوی آنے پر آمادہ نہیں اور یہ ہیں کہ راتوں رات عید مبارک کہنے فرار ہو گئے۔''

اس کا دل کہہ رہا تھا کہ ندیم صرف ایک بار کہہ دے کہ گھر چلو، مگر وہ خاموش تھا۔

''ندیم چلیے، میں بھی ساتھ چلتی ہوں۔ پھوپھی اور روشن کو عید مبارک بھی کہہ دوں گی۔'' اس نے ٹیڑھی میڑھی بات کی۔

''اجی نہیں شکریہ! مبارکباد ہی تو دینا ہے، فون پر دے دیجیے گا۔''

پھول کا خون پھر جوش پر آنے لگا۔

وہ انا سے جنگ میں مصروف ہو گئی۔ ندیم باہر نکل گیا تھا۔ ندیم کا ہر آگے بڑھتا قدم پھول کا دل بھینچ لیتا تھا وہ بھاگ کر گیلری میں آ گئی۔ ریلنگ تھام کر نیچے جھانکنے لگی۔ ندیم گاڑی تک پہنچ گیا تھا۔ پھول ایک دم نائٹی میں الجھتی زینے طے کر گئی۔ ندیم ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ اس کے اپنے کان پھول کے قدموں کی آہٹ پر لگے ہوئے تھے جب دیر تک چاپ نہ ابھری تو وہ بے حد شکستہ دل ہو گیا تھا۔ اب عین سامنے پھول کو دیکھ کر دل خوش گوار انداز میں دھڑکا۔

''سنیں میں بھی چل رہی ہوں۔'' اپنی دانست میں پھول نے اپنی زندگی کا سب سے کڑا امتحان دیا۔

''اگر تم ڈاکوؤں کے ڈر سے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو تو ڈاکو تو وہاں بھی آ سکتے ہیں۔''

پھول نے سامنے بیٹھے پتھر کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

''اچھا بھئی! اگر چلنا ہے تو لباس وغیرہ تو تبدیل کر لو۔'' اس نے پھول کے سراپے پر بھرپور نظر ڈالی گویا احسان سا توڑا۔ ''ویسے بھی میرے ناشتے کا وقت ہونے والا ہے۔ پونے چھ۔''

''آپ ناشتا کر لیجیے، آئیے ناں پلیز۔'' پھول نے ایک بار بھی نظریں نہیں اٹھائی تھیں۔

''ناشتا کون بنائے گا؟ ایک نوکر تو اسپتال میں ہے باقی نظر نہیں آ رہے۔'' اس نے تامل کیا۔

''میں خود بنا لوں گی۔'' اتنی دلفریب ادا تھی کہ ضبط مشکل ہو گیا۔

وہ ناشتا بنانے چلی گئی۔ ندیم نے گھر فون کیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ آملیٹ، ٹوسٹ اور چائے سے سجی ٹرے لیے حاضر تھی۔ گلابی نائٹی میں صبح کے خوبصورت سے وہ پھول ہی لگ رہی تھی۔

''سنیں! ہمیں تھانے وغیرہ تو جانا نہیں پڑے گا؟'' اس نے ٹرے رکھتے ہوئے پوچھا۔

''ارے نہیں بھئی! با قاعدہ گواہوں کے سامنے تمھیں قبول کیا ہے۔''

وہ تیزی سے بولا تھا۔ پھول نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر مسکراہٹ روکی۔

''میں ڈاکے کے متعلق کہہ رہی تھی، رپورٹ تو مرتب کر لی گئی ہوگی؟''

"پتا نہیں؟" وہ ناشتے میں مصروف ہو گیا۔ پھول لباس تبدیل کرنے چلی گئی۔

"ارے بھئی پھول بیگم! یہ آملیٹ تو تمھارے اخلاق کی طرح بالکل جلا ہوا ہے۔"

کف کے بٹن بند کرتی پھول بری طرح شرمندہ ہو گئی۔

جب وہ گاڑی میں اس کے برابر بیٹھی تو ندیم نے اس کی سمت دیکھا۔

تم میرے پاس ہو پھول مگر مجھے بالکل خوشی نہیں کہ مجھے یہ خوشی ڈاکوؤں کی مرہون منت لگ رہی ہے۔ میں بہت احمق ہوں پھول۔ تمھیں دیکھا، تمھیں چاہا اور پیچھے پڑ گیا۔ حالانکہ تم کوئی خوبصورت شو پیس نہیں بلکہ ایک جیتی جاگتی لڑکی ہو۔ شادی کسی فریق کی بالادستی و شہنشائیت کا نام نہیں۔ یقین کرو بعض اوقات مجھے بہت افسوس ہوتا ہے۔ دراصل میں مشکل پسند آدمی ہوں۔ سوچا تھا تمھیں محبت کرنا سکھاؤں گا، مگر پھول محبت سکھائی نہیں جاتی یہ تو......"

اس نے بات ادھوری چھوڑ کر ہونٹ بھینچ لیے۔

"ندیم وہ مرد ہی کیا جس کا عزم راستے میں دم توڑ دے۔ ندیم وہ مرد ہی کیا جس کے فیصلے پختہ نہ ہوں۔ وہ مرد ہی نہیں جس کی زبان ایک نہ ہو۔ آپ اپنی خوبیوں پر افسوس کر کے مجھے مایوس نہ کریں۔ مجھے زندگی بخش کر زہر نہ پلائیں۔ آپ مجھے کبھی بھی برے نہیں لگے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ آپ پر ظاہر ہو جائے کہ آپ مجھے کتنے اچھے...... ندیم شاید ہمارا منفی اور شدید عمل اسی لیے ہوتا ہے کہ ہم اپنے حقیقی جذبات کو چھپانا چاہتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ حقیقت کو منفی انداز میں چھپا کر ہم خود پر کتنا ظلم کرتے ہیں۔"

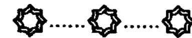
اس نے ہاتھ مسلتے ہوئے دھیرے سے اپنی خودداری، اپنے غرور کو موت کا آخری نشتر چبھو دیا۔ اسی دم گاڑی کے بریک تیزی سے چرچرائے اس کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔

"معاذ اللہ، ارے بھئی! اتنی خوبصورت بات کہنے سے پہلے یہ تو سوچ لیا ہوتا کہ میں گاڑی چلا رہا ہوں۔"

پھول نے مسکراہٹ سر جھکا کر چھپانا چاہی۔

"پھول!"

پھول نے نظریں اٹھائیں۔ ندیم نے اس کی خوبصورت آنکھوں میں جھانکا اور مسکرا کر کہا۔ "ٹھیک ہے۔" ساتھ ہی ایکسیلیٹر دبا دیا۔" پھول کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی تھی۔



رشتوں کے ریشم

"چٹاخ" کی زوردار آواز سے فیملی کورٹ میں موجود ہر ذی نفس چونک اٹھا تھا۔

"نہ تم محبت کرتی ہو نہ میرے ساتھ رہنے پر آمادہ ہو۔ یہی کہا نا تم نے؟" وہ سفید کرتے پاجامے میں ملبوس سُپر سا آدمی مارے جذب کے سرخ ہو رہا تھا اور نیلوفر اپنے رخسار پر ہاتھ رکھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"اب کیا ان سب کے سامنے وہ سارے منظر دہراؤں دغا باز لڑکی! جن کی وجہ سے دھوکا کھا کر آج میں ذلیل و خوار کھڑا ہوں۔ اچھا خاصا ذلیل و خوار کیے بغیر تو میں تمھیں نہیں چھوڑوں گا۔" وہ "کی رِنگ" مٹھی میں بھینچ کر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

مگر راستے ہی میں نیلوفر کے پاپا نے اسے جا لیا۔

"تم نے اس پر ہاتھ کس خوشی میں اٹھایا؟ میں تمھیں شوٹ کر دوں گا۔" وہ گرج کر مزید آگے بڑھے۔

"ہاتھ خوشی میں اٹھایا ہو یا غم میں، آپ مجھے ٹوکنے والے کون؟ میں اپنی بیوی کے ساتھ جو چاہے سلوک کروں، میری مرضی۔" وہ بھی غضبناک ہوا۔

"شاید تم بھول رہے ہو، یہی زبردستی کا رشتہ ختم کرنے کے لیے تم آج اس کورٹ میں مدعو تھے۔"

وہ سنی اَن سنی کر کے پھر آگے بڑھ گیا تھا۔ کورٹ میں موجود لوگوں کو ایک تماشا مل گیا تھا دیکھنے کو۔ اسی وجہ سے نیلوفر کے پاپا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ قیمہ بنا دیں اس کا۔

"رازی......! رُکیے، ٹھہریے۔" وہ جانے کیا سوچ کر اس کے پیچھے بھاگی۔

"نیلی!" پاپا نے اسے زوردار آواز میں پکارا مگر اس نے جیسے سنا ہی نہیں۔

"رازی خدا کے لیے آپ رُکیے۔ میں آپ کے ساتھ چل رہی ہوں۔"

وہ گاڑی کا اگلا دروازہ کھول کر بیٹھ چکا تھا۔

ایک نگاہِ غلط اس پر ڈالی اور اگنیشن میں چابی ڈال دی۔ ''بہت ہو چکا یہ ڈراما، میں تمہارا خون تو کر سکتا ہوں مگر تمھیں ایک پل اپنے قریب برداشت نہیں کر سکتا۔'' اس نے تیزی سے گاڑی بیک کی تو وہ اُچھل کر پیچھے ہٹ گئی۔

''میں آپ کے ساتھ چل رہی ہوں، چاہے آپ مجھے۔''

''بہت شکریہ، کوئی ضرورت نہیں مجھ پر احسان کرنے کی۔'' وہ زَن سے گاڑی لے اُڑا۔

وہ اپنی جگہ ساکت کھڑی رہ گئی۔

''یہ کیا حرکت تھی؟'' غضبناک سے پاپا اس کے سر پر کھڑے تھے اور علیم بھائی علیحدہ اسے ناراضگی سے دیکھ رہے تھے۔ امی البتہ چپ چاپ سی تھیں۔

''کیا کر رہے ہیں آپ لوگ میرے ساتھ؟ کیوں تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں مجھے؟'' وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''سنا تم نے؟ ہم اسے تباہ کر رہے ہیں۔ نادان لڑکی! تمھیں اتنا بھی احساس نہیں کہ وہ کچے دھاگے سے بندھا رشتہ اور ہم تمھارے ماں باپ ہیں۔'' وہ بیوی کی طرف متوجہ ہوئے پھر اگلے جملے بیٹی سے کہے۔

''یہ کچے دھاگے سے بندھا رشتہ نہیں ہے پاپا!'' اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

''تم...... دیکھ رہی ہو'' وہ موقع محل کا لحاظ کیے بغیر بیوی پر برس پڑے۔ ''ہزاروں روپیہ برباد کرنے کے بعد اسے دھیان آ رہا ہے رشتوں کی مضبوطی اور کمزوری کا۔'' ان کا بلڈ پریشر ہائی ہونے لگا۔

''آپ لوگ خود ہی تو یہ تعلق توڑنا چاہ رہے ہیں۔ مجھ سے کب کس نے رائے لی ہے؟'' اس نے ایک ہاتھ ماں کے کاندھے پر رکھا اور دوسرے سے آنکھیں پونچھیں۔

''دیکھ لو وحیدہ بیگم...... دیکھ لیا...... ہماری اپنی اولاد ہمیں ذلیل کرانے پر تلی ہوئی ہے، وہ بھری عدالت میں طمانچہ مار کر دُھتکار کر چلا گیا...... اور یہ اس کے کلمے پڑھ رہی ہے۔''

وہ چپ کھڑی باپ کی گرمی محسوس کرتی اور ڈانٹ کھاتی رہی۔

عبیدالرحمٰن کچھ دیر نظریں نیچے کیے آنسو بہاتی بیٹی کو دیکھتے رہے پھر آس پاس نظر ڈالی۔ ''نہ ہوا میرے پاس ریوالور، شوٹ کر دیتا اسی وقت۔''

وہ پھر بھی چپ کھڑی رہی۔

''وحیدہ بیگم اسے کہو گاڑی میں بیٹھے۔'' بلاواسطہ کلام ان کی حد درجہ ناراضگی ظاہر کر رہا تھا۔ ''میں خود اسے اس کے در پر چھوڑ کر آتا ہوں۔ جب وہ دس آدمیوں کی موجودگی میں اس کو تھپڑ مار سکتا ہے، تنہا گھر میں تو جو نہ کرے کم ہے۔'' انھوں نے گویا اس کو آنے والے وقت سے ہولایا بھی اور اپنی ''انا'' بھی دکھائی۔

وہ چپ چاپ گاڑی میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی...... وحیدہ بیگم اس اچانک بدلتی صورتِ حال پر حیران پریشان میاں کے ساتھ چپ چاپ بیٹھ گئی۔

اس وقت وہ اتنے خطرناک موڈ میں تھے کہ لَب کھولنا اپنی شامت بلانے کے مصداق تھا۔ حالانکہ وہ سخت اضطراری کیفیت میں پہلو بدل رہی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد گاڑی سخت دھچکے سے رُکی۔

''وحیدہ بیگم اس سے کہو اُترے۔'' انھوں نے ان ڈائریکٹ حکم صادر کیا۔

''اے ہے۔ غضب خدا کا! کیا کرنے جا رہے ہیں۔ اتنی عمر کہاں گنوا دی ہے؟ اس کی کیا رخصتی ہوئی تھی جو آپ رازی کی چوکھٹ پر پٹخ کر جا رہے ہیں؟ صرف نکاح ہی تو ہوا ہے۔''

''محترمہ! اصل چیز نکاح ہے۔ شادی ہزار آدمیوں کے پیٹ بھرنے کا نام نہیں ہے۔ یہ بے کار کے دھندے ہیں جن پر مذہب کا ٹھپّہ لگا کر اہم بنانے کی کوشش کی جاتی ہے، اسے کہو فوراً اتر کر اس کے گھر چلی جائے۔'' وہ غضبناک ہوئے۔ ''اس سے زیادہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔ اس نے ایک غیر انسان کو ماں باپ پر ترجیح دے کر ثابت کر دیا ہے کہ یہ ہمیں کیا سمجھتی ہے۔''

''پاپا!'' وہ گاڑی سے اتر کر ان کی طرف متوجہ ہوئی۔

وحیدہ بیگم نے بھی اترنے کے لیے پر تولے۔

''تمھیں اس کے ساتھ جانے کی کوئی ضرورت نہیں، اگر مجھ سے بحث کرو گی تو ہمیشہ اس کے ساتھ رہو گی اور اسی وقت سے میرا تمہارا رشتہ......''

وحیدہ بیگم تو بدک کر کھڑکی سے یوں پرے ہٹیں جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

''ائے ہئے غضب خدا کا! بڑھاپے میں سر میں خاک ڈلوائیں گے کیا؟ انسان کو غصے کے وقت کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔ میں کہہ رہی ہوں اس کی ابھی رخصتی نہیں ہوئی ہے۔''

''اگر تم مجھ سے مزید بحث کرو گی تو میں یہ گاڑی سامنے پول سے دے ماروں گا۔ دروازہ ٹھیک سے بند کرو۔'' جیسے ہی وحیدہ بیگم نے اَدھ کھلا دروازہ کھٹاک سے بند کیا، وہ گاڑی

تیزی سے آگے بڑھا گئے۔

یہ گھر سرفراز نے حال ہی میں خریدا تھا، وہ پہلے تو دم بخود سینے پر ہاتھ رکھے کھڑی رہ گئی۔ پھر مرے مرے قدموں سے سفید گیٹ کی طرف بڑھی اور کال بیل کا بٹن پُش کرنے لگی۔

بوڑھے ملازم نے گیٹ کھولا اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ (یہ ملازم بھی نیا تھا)

''سامنے سے ہٹیں بابا!'' وہ جھلا سی گئی۔ ویسے ہی ذہن میں آندھیاں چلنے لگی تھیں۔

''آپ کو کس سے ملنا ہے بی بی؟'' بوڑھا ملازم خود الجھ گیا، اس کا الجھا ہوا انداز دیکھ کر۔

''مجھے کسی سے نہیں ملنا ہے، گھر ہے میرا۔''

بوڑھا ملازم اسے یوں دیکھنے لگا جیسے اس کی ذہنی صحت پر شبہ ہو۔

وہ اندر کی طرف بڑھ گئی اور ٹی وی لاؤنج میں پڑی ایک آرام کرسی پر ڈھے گئی اور اپنے انتہائی قدم پر غور کرنے لگی۔

وہ اس کی بیوی قانونی اور شرعی ہر لحاظ سے تھی مگر ابھی وہ ان جرأتوں اور حوصلوں کی مالک نہیں تھی جو کسی لڑکی کو شوہر کے ساتھ بے تکلفی کا رّویہ اپنانے میں مدد دیتے ہیں۔ وہ اس خاص معاشرتی ''پروسس'' سے نہیں گزری تھی جس سے دو بول پڑھنے کے بعد تقریباً ہر لڑکی کی گزرتی ہے۔

اس کا نکاح محض دس افراد کی موجودگی میں ہوا تھا جن میں گواہ و وکیل بھی شامل تھے۔

وہ اپنے اندر ہی اندر طوفانوں کی زد میں تھی۔

یہ میں نے کیا کر دیا؟

صحیح ہے یا غلط...... وہ اس کے ساتھ کس طرح پیش آئے گا؟

اس نے پاؤں اٹھا کر کرسی پر رکھ لیے اور آنکھیں موند لیں۔

''آپ کس کی اجازت سے یہاں میرے گھر میں تشریف فرما ہیں اور کس خوشی میں؟''

اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں...... اتنا سخت اور اجنبی لہجہ۔

سارے مان یہاں وہاں گر کر چکنا چور ہو گئے۔

''میں پوچھ رہا ہوں آپ یہاں کس حیثیت سے تشریف لائی ہیں؟'' وہ بے حد غضبناک نظر آ رہا تھا۔

وہ خاموش نظریں جھکا کر اپنے ناخن تکنے لگی۔

''میں کچھ بک بک کر رہا ہوں محترمہ! یہ میرا گھر ہے، میری اجازت کے بغیر یہاں کوئی داخل نہیں ہو سکتا۔'' اس کا لہجہ بدستور غیظ و غضب کا اظہار کر رہا تھا۔

''میں کوئی نہیں ہوں۔'' بالآخر وہ بول پڑی۔

''خوب۔'' وہ تلخی سے مسکرایا۔ ''بابا......!'' اس نے زور سے ملازم کو آواز دی۔

''جی صاحب؟'' وہ تیزی سے ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوا۔

''ان محترمہ کو عزت کے ساتھ گیٹ سے رخصت کر کے آؤ اور آئندہ مجھ سے پوچھے بغیر کسی کو اندر داخل نہ ہونے دینا۔'' وہ پلٹ گیا۔

''آپ میری بات تو سن لیں۔'' وہ کھڑی ہو گئی۔

''تم نے اپنی بات سنانے کے لیے جو وکیل کیا ہے، بہت اچھا بولتا ہے۔ میں اب جو سنوں گا، اسی کے ذریعے سنوں گا۔'' وہ آگے بڑھ گیا۔

اسے چکر سا آ گیا۔

وہ دو مردوں کی ''انا'' کا مسئلہ بن چکی تھی۔ ایک مرد کی انا کتنی بڑی قیامت ہوتی ہے۔ کُجا کہ دو مردوں کی ''انا'' کا طوفانی سیلاب۔

جانے کیا کیا بہے گا؟

کیا کچھ تباہ ہو گا؟

''میں تو ازلی احمق ہوں شاید۔ مجھے آج تک فیصلہ ہی کرنا نہیں آیا۔ مجھے اہم اور غیر اہم کا فرق نکالنا ہی نہیں آیا آج تک۔'' اس نے خود کو موردِ الزام ٹھہرایا۔

ملازم ہاتھ باندھے منتظر کھڑا تھا۔ جسے ابھی کچھ دیر پہلے بڑے مان سے بتایا تھا کہ یہ میرا گھر ہے۔ وہ خجل سی ہو گئی۔

''میں جا رہی ہوں بابا! آپ امتحان میں نہ پڑیں...... لیکن یہ واقعی میرا گھر ہے، فی الحال جسے میں نے خود توڑنے کا احمقانہ فیصلہ کیا ہے۔ میں اپنے مستقبل کی تباہی کی خود ذمے دار ہوں۔'' اشک روانی سے بہہ نکلے۔

بوڑھے انسان کا دل مضطرب ہو گیا۔

مگر اس کا مقام یہ نہیں تھا کہ وہ اس سے سوالات کر سکتا اور حالات کی تہ تک پہنچتا۔

...........❁...........

''توبہ آپا جان۔ بس اسی کی کسر باقی تھی۔'' عطیہ بیگم نے ناگواری سے کہا۔

''ویسے دے کیسے دی؟ وہ تو خاندان میں گھلنا ملنا بھی پسند نہیں کرتے؟'' اب انھوں نے تعجب کا اظہار بھی کیا۔

ساجدہ خاتون خاموشی سے بیٹھی پان بناتی رہیں۔ ان پر جیسے بہن کے جملوں کا کوئی اثر ہی نہیں ہوا تھا۔

''صلاح الدین بھائی (دونوں کے مشترکہ بہنوئی) بھی کہہ رہے تھے کہ آپا جان تو اپنے گھر کو چڑیا گھر بنانے پر تلی ہوئی ہیں۔ پہلے ایک پرائی یتیم لڑکی کو بیٹی بنا کر گھر میں لے آئیں، پھر محمود بھائی کے بیٹے کو اپنا بیٹا بنا لیا۔ چلو خیر وہ تو ہے ہی ہمارا خون اور اس کا سہارا ہمارے آپ کے علاوہ بن بھی کون سکتا تھا؟ اب وہ وحیدہ کی بیٹی......''

''بس کرو عطیہ...... اس میں بُرا ماننے کی کون سی بات ہے۔ وہ بھی ہماری اپنی بچی ہے، زیادہ دور کا رشتہ تو نہیں ہے۔'' انھوں نے بہن کی طرف پان بڑھایا۔

''وحیدہ کی حالت تم دیکھتیں، مرتے مرتے بچی ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ ہے۔ چھوٹا سا کاروبار ہے۔ کہاں گزارا ہوتا ہے آج کل اتنے بچوں کے ساتھ اتنی تھوڑی آمدنی میں۔ پھر ماشاء اللہ وحیدہ کے اوپر تلے پانچ بیٹیاں ہو گئیں۔ اب میں بے اولاد، سونا گھر میرا، کیسی بہار ہے ان بچوں سے۔ اوپر سے اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ اگر مشکل میں انسان کسی کے کام آ جائے تو کیا برائی ہے؟ ان بچوں نے میری گود میں پلنا تھا۔ شاید اسی لیے قدرت نے میری گود خالی رکھی۔ اس کی حکمت کون سمجھ سکتا ہے؟ لوگوں کو شاید اس لیے برا لگتا ہے کہ کہیں یہ بچے میرے مال و دولت کے وارث نہ ٹھہریں۔ میں اپنے مال و دولت کی مختار ہوں، پاگل نہیں ہوں، اگر میری وجہ سے کسی کو آسانیاں مل جائیں تو میری زندگی کارآمد ہو جائے۔ ان بچیوں کا کیا ہے۔ کل کلاں کو یہ تو پرائی ہو جائیں گی۔ اپنی قسمت کا ساتھ لے جائیں گی۔ شاید ان کی قسمت سے خدا نے مجھے یہ سب کچھ دیا ہو۔'' وہ بڑی خدا پرست خاتون تھیں۔ ہر بات میں خدا کی مصلحت ڈھونڈ لیتی تھیں۔

''لیکن یہ بھی تو سوچیں۔ محمود بھائی کی اور عبید بھائی کی جنم جنم کی دشمنی چل رہی تھی۔ محمود بھائی نے ہمیشہ عبید بھائی کو غاصب سمجھا۔ وحیدہ کے پیچھے جو دشمنی چلی تھی اس نے کتنے موڑ لیے اور میں تو سمجھتی ہوں کہ اسی بات نے محمود بھائی کی جان لی تھی۔ اندر ہی اندر سلگتے رہے وہ۔

اسی ہر وقت کے جلنے کڑھنے نے انھیں کئی بیماریاں لگا دی تھیں۔'' عطیہ بیگم تلی بیٹھی تھیں کہ بہن کو احساس دلا ہی دیں کہ ان کا یہ اقدام سنگین غلطی ہے۔

''رات گئی، بات گئی، عطیہ۔ دشمنی عبید کی محمود کے ساتھ تھی۔ اللہ بخشے اسے، ہمارے ساتھ تو نہیں اور پھر بڑوں کی دشمنیوں کو ان کے بچوں کے کھاتے میں کیوں ڈالیں؟''

''مرضی ہے آپ کی۔ مگر مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کچھ اچھا نہیں ہوا۔''

''اب بدفالیں منہ سے مت نکالو، عطیہ! خدا نے چاہا تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔ دعا کرو ان بچوں کی خوشیاں دیکھوں۔ میرے آنگن کی بہاریں قائم رہیں۔ خدا مجھے توفیق دے، جو ذمے داریاں میں نے لی ہیں ان سے خوش اسلوبی سے عہدہ برآ ہو سکوں۔''

بہن کے کڑوے لہجے کے باوجود ان کا تحمل اسی طرح قائم تھا۔ ہر بات کا جواب بہت رسان اور ٹھنڈے انداز میں دے رہی تھیں۔

عطیہ بیگم کو احساس ہو چلا تھا کہ ان کی بہن ان کی ہر بات کو معمولی جان کر کوئی اثر قبول نہیں کریں گی۔ چپ چاپ پاؤں میں چپل ڈالنے لگیں۔

''ابھی سے جا رہی ہو۔ کھانا کھا کر جانا عطیہ! اس بھری دھوپ میں کہاں جاؤ گی؟''

''نہیں آپا جان! کھانا وانا تو تیار کر کے چلی تھی۔ پھر سہی۔''

انھوں نے چھوٹی بہن کے موڈ کا اندازہ کر کے مزید اصرار مناسب نہ سمجھا اور خاموشی سے چھالیا کترنے لگیں۔

نائلہ کی ماں تو موجود تھی مگر بیوگی کی زندگی مزدوری مشقت کر کے کاٹ رہی تھی۔ نائلہ کی ماں سے آپا جان کا کوئی خاندانی و قلبی تعلق نہیں تھا۔ بس اس سے کپڑے وغیرہ سلایا کرتی تھیں۔ برسوں سے وہ ان کے کپڑے سی رہی تھی۔

اس کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر، اپنی فطری خدا ترسی سے مجبور ہو کر اس کی بیٹی کو گود لے لیا تھا۔ گود کیا لیا تھا، اچھی بھلی پانچ برس کی بچی تھی، جب وہ اسے اپنے ساتھ لے آئی تھیں۔ انھوں نے تو اس کی ماں کو بھی اپنے گھر میں ایک کمرہ دینے کی پیشکش کی تھی۔ مگر وہ بہت خود دار عورت تھی اس لیے کڑے سے کڑے وقت میں بھی کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا تھا۔

آپا نے اس کے انکار کے بعد اس کی خودداری اور غیرت کو مزید امتحان میں نہیں ڈالا تھا۔ نائلہ کو بھی یہ کہہ کر اپنے ساتھ لائی تھیں کہ ان کی بڑی آرزو تھی کہ ان کی کوئی لڑکی ہوتی اور

وہ اسے اعلیٰ تعلیم دلاتیں، ہنر مند بناتیں، بڑے ناز سے پالتیں۔ نائلہ کی ماں نے شاید یہ سوچ کر ہامی بھر لی تھی کہ اس کی بیٹی کلفتوں سے دور خوش باش زندگی گزار سکے گی اور بدقسمتی کی آگ سے دور رہے گی۔ جس میں وہ خود برسوں سے جل رہی تھی۔ اپنی بیٹی کا خوشحال مستقبل اس کے سامنے تھا کہ وہ ساجدہ بیگم سے خوب واقف تھی اور اس بات سے بھی کہ سونی گود کا دکھ ان کی زندگی پر چھا کر رہ گیا ہے۔ اس نے اتنی بڑی قربانی بیٹی کے سُکھ کے عوض قبول کر لی تھی بلکہ وہ اسے اپنی بیٹی بنا رہی تھیں۔ عزت دے رہی تھیں، برابری دے رہی تھیں۔

سرفراز احمد تو ان کا اپنا سگا بھتیجا تھا۔ بھائی نے بڑی مختصر زندگی پائی تھی۔ شادی کے پانچ سال بعد تو ان کے ہاں کوئی اولاد ہی نہیں ہوئی اور جب سرفراز کی پیدائش کا وقت آیا تو وہ خود اس جانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ شاید یہ بیوگی کا دُکھ تھا جو سرفراز کی ماں کو بے ہمت اور کمزور بنا گیا۔ وہ سرفراز کی پیدائش کے چند منٹ بعد ہی اپنے شوہر سے جا ملی تھیں اور یوں وہ آنکھیں کھولنے سے پہلے ہی ساجدہ بیگم کی بانہوں میں آ گیا تھا۔

جب وہ سات برس کا ہوا تو ساجدہ بیگم کے گھر میں ایک نئے وجود کا اضافہ ہو گیا۔ یہ نیلوفر تھی۔ اس کا نام ساجدہ بیگم ہی نے رکھا تھا۔

ساجدہ بیگم کا دوستانہ وحیدہ سے بچپن سے تھا۔ وہ انھیں بہت پسند تھی۔ وہ دل سے اپنی سہیلی کو بھابی بنانا چاہتی تھیں مگر عبیدالرحمٰن نے درمیان میں آ کر سارا کھیل بگاڑ دیا۔ یہاں سے ان کے بھائی محمود اور عبیدالرحمٰن کی دشمنی کا آغاز ہوا اور ساجدہ بیگم پر یہ عقدہ کھلا کہ ان کا بھائی وحیدہ کو جنون کی حد تک چاہتا ہے۔ مگر عبیدالرحمٰن کی اس وقت کی خوشحالی جیت گئی۔

محمود کا موقف یہ تھا کہ عبیدالرحمٰن کیونکہ ان کا کزن تھا اس لیے دوستی بھی تھی اور وہ اس راز سے واقف تھا کہ وہ یعنی محمود، وحیدہ کو کتنی شدت سے چاہتا ہے۔ اس تمام صورتِ حال سے واقف ہونے کے باوجود اس نے وحیدہ کا طلبگار بن کر اس پر شب خون مارا ہے۔

اس دشمنی کا آغاز ہوا تو بڑھتی چلی گئی۔ حالانکہ محمود کی شادی بھی ایک خوبصورت لڑکی سے ہو گئی جو بہت معزز خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ مگر محمود کے دل کو قرار نہ مل کر دیا...... آئیڈیل پرست انسان یا تو آئیڈیل پا لیتا ہے یا مٹ جاتا ہے۔

وہ کوئی اتفاقی اور اچانک ملنے والی چیز کو برداشت نہیں کر پاتا۔

وہ خواب دیکھنے والا اور منصوبہ ساز ہوتا ہے۔

ہر کام مرحلہ وار کرتا ہے۔ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہے۔

ایسا ہی آئیڈیل پرست انسان شاید محمود بھی تھا۔

وہ اپنے خواب سے ہٹ کر کچھ پانے اور ملنے کی تمنا نہیں رکھتا تھا۔

دشمنی بڑھی اور نفرت و کدورت انتہا کو پہنچی۔

ایک دوسرے سے بدظنی کی بناء پر خود ساختہ اور بے بنیاد الزامات بھی لگائے جانے لگے۔ عبیدالرحمٰن ٹھیکیداری کرتے تھے۔

ان کو شکایت ہوئی کہ محمود اپنے پولیس آفیسر سالے کی بدولت انھیں معاشی بدحالی کی طرف لے جا رہا ہے۔ کیونکہ وہ خود داری ٹھیکیداری کرتا ہے اس لیے اثر و رسوخ کی بنا پر پہلے سے ہی ٹینڈر کے ''راز'' سے واقف ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اسے پہلے سے پتہ چل جاتا ہے کہ کم سے کم ٹینڈر کی حد کیا ہے۔ لہٰذا جو بھی ٹینڈر منظور ہوتا ہے، وہ محمود کا ہوتا ہے۔ جب عبیدالرحمٰن شدید معاشی بحران کا شکار ہوئے تو نفرت کبھی نہ مٹنے والی سیاہی بن کر ان کے قلب پر پھیل گئی۔

محمود کی نفرت کی وجہ ''وحیدہ'' تھی۔

اور عبیدالرحمٰن کی کدورت کا سبب ان کا معاشی بحران۔

دونوں طرف کے پلڑے متوازن ہو گئے اور رتی، ماشے کی بھی گنجائش نہ رہی۔ ہر چند کہ ساجدہ بیگم نے ''امن کے سفیر'' والے متعدد فرائض انجام دیے۔

عبیدالرحمٰن بھی ساجدہ بیگم کی بڑی بہن کی طرح عزت کرتے تھے۔ مگر عبیدالرحمٰن اور محمود کے دلوں میں بال برابر بھی نرمی کا اثر نہیں پایا گیا۔ اب وہ اٹل ہو چکے تھے۔ وہ تو شاید کسی طور پر اپنی نوزائیدہ بچی ساجدہ بیگم کے حوالے نہ کرتے کہ ان کے دشمن کا بیٹا بھی انہی کی چھت کے نیچے پل رہا تھا۔

مگر بیوی کی نقاہت اور شدید بیماری، چار بیٹیوں اور ایک معصوم بیٹے کا ساتھ پہلے سے تھا۔ پھر اس پر معاشی پریشانی بھی۔

جب ساجدہ بیگم نے بڑے پیار سے نیلوفر کو سینے سے لگا کر عبیدالرحمٰن سے اپنی بیٹی بنانے کی درخواست کی تو پریشانی میں یہی حل سوجھا کہ بچی ان کی گود میں دے دی جائے۔ وہ ساجدہ بیگم کی شخصیت اور پیار کو تسلیم کرتے تھے، بلکہ پورا خاندان ہی تسلیم کرتا تھا جس طرح وہ نائلہ اور سرفراز کو ناز و نعم سے پال رہی تھی، اس طرح تو خاندان میں دوسرے بچے اپنے حقیقی

والدین کے پاس بھی نہیں پل رہے تھے۔ سہولتوں سے مزین گھر تھا اور بہترین تعلیمی اداروں میں وہ تعلیم پا رہے تھے۔ اچھا کھاتے اور عمدہ پہنتے تھے۔ خوش رہتے تھے اور بلا کی خود اعتمادی کے مالک تھے جس کا اعتراف سبھی کرتے تھے۔

وحیدہ بیگم نے بھی شاید اسی لیے نیلوفر کو ان کی گود میں دے دیا کہ ان کی بچی بھی ساجدہ بیگم کے گھر میں آسودگی کی زندگی گزار لے گی کہ وہاں محض معاشی آسودگی ہی نہیں ہے بلکہ ساجدہ بیگم کی بے پناہ شفقتیں اور بے کراں محبتیں بھی ہیں۔ پھر انھیں یہ بھی ڈر تھا کہ ان کی شدید بیماریاں کہیں ان کی جان نہ لے لیں، بہتر یہی ہے کہ ان کی یہ معصوم بچی پہلے ہی محفوظ ہاتھوں میں ہو۔

اور یوں نیلوفر ساجدہ بیگم کی آنکھوں کی ٹھنڈک بن گئی۔

نائلہ اور سرفراز تو اسکول چلے جاتے تھے۔

اب نیلوفر ہی ان کی توجہ کا مرکز اور دل کا بہلاوا تھی۔ بقول عطیہ بیگم اور دوسرے لوگوں کے، آپا جان دوسری شادی کر لیتیں تو شاید خدا انھیں اولاد سے نواز دیتا۔

مگر وہ دوسری شادی پر کبھی آمادہ ہوئی تھیں، نہ ہوئیں۔ ان کا ایک جواب تھا۔

''بس جو میرا ساتھی تھا مل گیا تھا اور دل کا ساتھی بھی بن گیا تھا۔ اب کسی کی جگہ کسی اور کو دینے کو دل نہیں چاہتا اور وہ جو اتنی دولت میرے حساب میں چھوڑ گیا ہے، میں کسی غرض مند اور لالچی کے حوالے کیوں کروں؟ کیوں نہ اس سے اچھے کام کروں۔

ان کا خیال تھا، وہ لوگ جو کنوارے رشتے ان کے لیے لا رہے ہیں وہ سب مطلبی ہیں وگرنہ کیا ضرورت پڑی کسی کو بیوہ سے شادی کرنے کی۔ کیا دنیا میں کنواری لڑکیوں کا کال پڑ گیا ہے؟

ہمدرد چپ ہو گئے، پھر کبھی نہ بولے۔ چند ایک نے تب بھی دبی زبان سے کہا تھا تو کسی رنڈوے ہی سے کر لیں ویسے بھی تو اِدھر اُدھر کے بچے سمیٹ کر پال رہی ہیں۔ کسی ایک ہی کے پال لیں۔ مگر یہاں وہ ''دل'' کا معاملہ رکھ دیتیں کہ ان کے دل میں سوائے اپنے مرحوم شوہر کے کسی کے لیے گنجائش نہیں ہے۔

دراصل وہ دوسری شادی کرنا ہی نہیں چاہتی تھیں۔ اس کا اندازہ بھی ان کے ہمدردوں کو آخر کار ہو ہی گیا تھا۔

............❀............

ٹیلی فون کی بیل کب سے بج رہی تھی۔ وہ باتھ روم میں تھا اور بیڈ روم کا دروازہ بند تھا۔ وہ جلدی سے باتھ روم سے نکلا۔ گیلے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے وہ ٹیلی فون سیٹ کی طرف بڑھا۔

''ہیلو؟'' اس نے ریسیور اٹھا کر ماؤتھ پیس میں کہا۔

''ہیلو......سرفراز بیٹے؟'' دوسری طرف وحیدہ بیگم تھیں۔

وہ اُلجھ سا گیا۔ ''جی فرمائیے؟''

''بیٹے جلدی سے نیلی کو بلا دو۔ اس کے باپ اس وقت باہر گئے ہوئے ہیں۔ وہ ٹھیک تو ہے نا؟''

''جی!'' اس نے حیران ہو کر ریسیور کو گھورا۔

''بیٹے ٹائم نہیں ہے، جلدی سے نیلی کو بلا دو۔'' دوسری طرف شدید بے چینی تھی۔

''جی......؟ نیلی......؟ اچھا۔ اچھا......وہ اس وقت گھر پر نہیں ہے۔'' اسے فوری یہی جواب سوجھا۔

''کہاں چلی گئی؟'' دوسری طرف پریشانی تھی۔

اس نے آہستگی سے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

کہاں چلی گئی؟ اس نے خود سے سوال کیا۔ کل دوپہر کو تو اس نے اسے اپنے گھر سے نکال دیا تھا۔ وہ عبیدالرحمٰن کے ہاں نہیں گئی تو پھر کہاں چلی گئی؟ وہ بے حد پریشان ہو گیا۔

یہ کیا ہو گیا؟ وہ گرنے کے انداز میں پاس پڑی کرسی پر ڈھے گیا۔ عجیب لڑکی ہے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ خود ہی تو خلع مانگا پھر خود ہی آ گئی۔

کیا وہ اپنے ماں باپ سے تعلق توڑ کر آئی تھی؟ مگر کیوں؟

جب وہ عدالت میں اس کے مقابل آ گئی تھی پھر اس نے یہ سب کیوں کیا؟

اس کی نظروں کے سامنے تمام مناظر ماضی کی جھلکیاں دکھانے لگے۔

اس بے وقوف سی لڑکی کو اس نے ٹوٹ کر چاہا تھا۔ وہ جو اس سے بہت دور دور رہتی تھی۔ ڈری ڈری، سہمی سہمی۔ اس کے غصے سے تو سب ہی ڈرتے تھے مگر وہ تو کچھ زیادہ ہی خوف زدہ رہتی تھی۔ اس احمق لڑکی کو ادراک نہیں تھا۔ کوئی کتنی شدتوں سے اسے چاہا کرتا ہے۔

نائلہ کی شادی کے ہنگاموں میں آخر اس پر عقدہ کھل ہی گیا تھا۔ وہ جو اس سے دور

دور ڈری ڈری رہتی ہے۔ وہ خود اس کے سلسلے میں تقدیر سے ذرا ڈرا رہتا ہے۔

اس روز نائلہ آپا کی مہندی تھی۔ جب وہ مہمانوں کی بھیڑ سے پریشان ہو کر اس کا کمرہ خالی دیکھ کر وہ تیار ہونے چلی آئی تھی۔

مگر تھوڑی دیر بعد پریشان پریشان سی گھٹنوں کے بل جھک کر کچھ ڈھونڈنے لگی تھی۔ کبھی قالین پر ہاتھ مارتی، کبھی اپنا دوپٹہ پھیلا کر دیکھتی۔ کبھی اپنے جسم پر ہاتھ پھیر کر کچھ ٹٹولتی۔

''کچھ کھو گیا ہے؟'' وہ چپکے سے اس کے قریب آ کھڑا ہوا تھا۔

''آں...... ہاں۔'' وہ بے تحاشا چونک اٹھی تھی بلکہ گھبرا بھی گئی تھی۔

''جی میرا ایک سونے کا بُندہ گر گیا ہے۔ امی نے مجھے آج پہننے کے لیے سیٹ دیا تھا۔'' وہ روہانسی سی ہو گئی۔ ساجدہ بیگم کو وہ سب امی ہی کہتے تھے۔

''کہاں گرا دیا؟'' اس نے بھی زمین پر نظر ڈالی۔

''یہیں تھا...... میری مٹھی میں تھے دونوں بُندے۔'' وہ پریشانی سے بولی۔

''صرف بُندے ہی تھے مٹھی میں...... کسی سرفراز نام کے آدمی کا دل تو نہیں تھا مٹھی میں بُندوں کے ساتھ۔'' اس کا لہجہ شریر مگر دھیما تھا۔

''جی......؟'' اس کی پیشانی سے پسینا پھوٹ نکلا...... وہ اس غیر متوقع حملے کے لیے تیار نہیں تھی کہ جو اس سے سخت بیزار رہتا ہے...... اسے ناپسند کرتا ہے۔ وہ ابھی ابھی کیا کہہ گیا تھا۔ بات من چاہی تھی۔ وہ نظریں جھکا کر کھڑی رہ گئی تھی۔ بُندے وندے سب ذہن سے اڑنچھو ہو گئے...... اب تو وہ بھاگنے کا راستہ تلاش کرنے لگی تھی۔

اسے اس کی بے چارگی پر ترس آ گیا۔

''جب یہاں لائی تھیں تو یہیں ہو گا۔ جائے گا کہاں؟ آؤ ڈھونڈتے ہیں۔'' وہ صلح جو انداز میں بولا۔

تھوڑی دیر بعد وہ بیڈ کے پاس پڑا مل گیا۔ سرفراز نے اٹھا لیا اور ہتھیلی پر سجا کر اس کے سامنے پیش کیا۔

''ایک ذرا سے بُندے کے گم ہونے پر اتنی پریشانی؟ مجھے دیکھو دل گنوا کر بھی پریشان نہیں ہوا۔'' وہ اس کے بے حد قریب کھڑا تھا اور نیلوفر کی جان پر بن رہی تھی۔

وہ اس کی ہتھیلی سے بُندہ اٹھانے کی ہمت بھی نہیں پا رہی تھی خود میں۔ یہ اس پر اچانک کیسی اُفتاد آ پڑی تھی۔

''اگر اجازت ہو تو ڈال دوں کان میں؟ اگرچہ اناڑی ہوں مگر اب مجھے پریکٹس شروع کر دینی چاہیے۔'' وہ کتنا بدلا بدلا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ خاموش خاموش اور اکھڑ سا انسان۔ جس کا خشک چہرہ دیکھ کر اس کا سانس اٹکنے لگتا تھا۔

سبز بنارسی سوٹ میں دو چوٹیاں سینے پر پھیلائے، وہ ساکت سی کھڑی تھی۔ دوپٹہ دائیں شانے سے پھسل کر قالین پر جا پڑا تھا۔

اس نے آہستگی سے اس کے کان میں آویزہ ڈال دیا۔ نیلوفر کی تو حالت غیر ہو گئی۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن والی کیفیت اس پر غالب تھی۔

''کم از کم شکریہ تو ادا کر دو۔ اگر بُرا لگا ہے تو گالیاں ہی سنا دو۔''

''پلیز، مجھے جانے دیں۔''

''تو چلی جاؤ، میں نے تمھیں پکڑا ہوا تو نہیں ہے۔'' وہ مسکرا دیا۔ اس کی پریشانی سے بہت محظوظ ہو رہا تھا۔

''سامنے سے ہٹیں پلیز!''

''ہٹا دو چٹان تو نہیں ہوں۔ دن رات تمھارے عشق میں جل کر ویسے ہی کمزور ہو گیا ہوں۔'' وہ مزید شریر ہوا۔

اب تو مزید کھڑا رہنا دوبھر ہو گیا تھا۔ وہ سائیڈ میں جگہ پا کر بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔

سارے حواس، ساری چوکڑیاں وہ جیسے اس کمرے میں بھول آئی تھی۔

پھر سرفراز کی زندگی میں بہاریں آئی تھیں۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ بازی جیت چکا ہے۔ اسے ٹھکرایا نہیں گیا ہے......

مگر جب چند رومان پرور واقعات اور اس کی طرف سے یقین کر لینے کے بعد اس نے ساجدہ بیگم کے سامنے مدعا پیش کیا تو وہ پریشانی کے عالم میں سوچ میں پڑ گئی تھیں۔

پھر اس سے کہا تھا:

''بیٹے! یہ خوشی کی بات ہے کہ تم نے نیلوفر کا انتخاب کیا ہے۔ میری بھی یہی تمنا تھی۔ مگر تم جانتے ہو نیلو کے باپ کی تمہارے باپ سے کس قدر دشمنی تھی۔ مجھے پورا یقین ہے، وہ

کبھی بھی اس پر راضی نہیں ہوں گے۔ میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔"

"مگر نیلو کو تو آپ نے پالا ہے۔ آپ اس کی ذمے دار ہیں اور پھر" وہ ذرا جھجکا۔

"نیلو خود اس بات پر آمادہ ہے۔"

ساجدہ بیگم چونکیں۔ "ہیں! وہ اتنی چپ چپ سی لڑکی کس وقت یہ مدارج طے کر گئی؟" اگرچہ انھیں بھی یہ بات سن کر تقویت سی ہوئی تھی۔

"پھر بھی...... بیٹے! اس کے باپ سے پوچھنا بے حد ضروری ہے۔ اللہ رکھے وہ حیات ہیں۔ اور پھر نیلو سے بھی پوچھوں گی، اپنی تسلی کے لیے۔"

"اس کے والد کے بارے میں تو آپ اندازہ لگا ہی چکی ہیں۔ میرا خیال ہے، آپ صرف نیلو سے پوچھ لیں۔"

وہ بجھ سا گیا تھا۔ اسے ان کٹھنائیوں کا احساس نہیں تھا۔

"تم جی چھوٹا نہ کرو۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔" انھوں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑی شفقت سے کہا۔

اور پھر۔

وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ عبدالرحمٰن تو ہتھے سے اکھڑ گئے تھے۔

"آپ نے ایسا سوچا ہی کیوں؟ آپ نے اسے پرورش کیا ہے، آپ اس کی ذمے دار ہیں، اس پر آپ کا پورا حق ہے۔ اگر آپ اسے خاکروب سے بیاہ دیں گی تو میں اعتراض نہیں کروں گا۔"

انھوں نے ایک خاکروب کو سرفراز پر ترجیح دے کر انھیں معاملے کی سنگینی کا احساس دلا دیا تھا۔

ہر چند انھوں نے عبدالرحمٰن کو بہت سے دلائل دیے تھے کہ دشمنی اس کے باپ سے تھی، بچے کا کیا قصور مگر سب بے کار اور لاحاصل رہا۔

اور جب انھوں نے اپنے چہیتے بھتیجے کی بُری حالت دیکھی تو ان سے رہا نہ گیا۔ ایک شب وہ نیلوفر کے پاس گئیں اور اس کا عندیہ معلوم کیا۔ وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔

"بیٹی تمہاری چپ سے معاملہ طے نہیں ہوگا۔ تمہاری شادی کہیں نہ کہیں ہونا ہی ہے، نہ تمھیں سدا میرے ساتھ رہنا ہے نہ اپنے ماں باپ کے پاس۔ اگر تم راضی ہو تو میں تمہارا نکاح

کیے دیتی ہوں۔ جانتی ہوں، اس کے بعد تمھارے باپ کی دشمنی میرا مقدر ہوگی۔ مگر میں تم لوگوں سے بے پناہ محبت کرتی ہوں۔ میں ہر قیمت پر تمہاری خوشیاں چاہتی ہوں۔ تم عاقل و بالغ ہو۔ قانون اور شریعت دونوں تمھیں تمہارا حق دیتے ہیں۔"

اس نے ساری عمر ساجدہ بیگم کے ساتھ گزاری تھی۔ اسے صرف ان ہی سے محبت بھی تھی اور انسیت بھی۔ اسے صرف انہی کے فیصلوں سے دلچسپی تھی جنھوں نے اسے دنیا کے ہر عیش و آرام اور چاہت سے نوازا تھا۔

اور پھر بات اس کے اپنے دل کی بھی تھی۔ وہ جو اس کی خاموش پجارن تھی۔ جبکہ اسے تو اس کا احساس بھی نہیں تھا کہ وہ بھی اس کے لیے اپنے دل میں طوفان چھپائے بیٹھا ہے۔

اس نے خاموشی سے اپنی رضامندی دے دی۔

ساجدہ بیگم نے بڑا جرأت مندانہ قدم اٹھایا تھا۔ خاموشی سے نکاح ہو گیا۔ نکاح میں کل دس افراد تھے۔ نائلہ اور اس کا شوہر، نائلہ کی ماں، دو نیلوفر کی سہیلیاں اور دو سرفراز کے دوست اور ایک سرفراز کے ماموں، دُلہا دُلہن اور ساجدہ بیگم۔ انہی افراد میں سے دو دو گواہ دونوں طرف سے بن گئے تھے۔ انہی میں سے وکیل۔

اور یوں وہ ہمیشہ کے لیے ایک ہو گئے۔ خوش اور مطمئن دونوں تھے مگر یہ خوشی چند روزہ ثابت ہوئی۔ ساجدہ بیگم خون کے سرطان میں مبتلا ہو کر چند مہینوں میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔

اس اُفتاد پر سب ہی پریشان ہوئے۔ گھر کا نظام تلپٹ ہو کر رہ گیا۔ چہلم تک تو نائلہ گھر میں رہیں پھر وہ بھی چلی گئیں۔

اور عبدالرحمٰن اپنی بیٹی کو آ کر لے گئے۔ وہ اسے روکنا چاہتا تھا۔ روکنے کا حق رکھتا تھا مگر وقتی طور پر مصلحتاً خاموش ہو رہا کہ اب اس سے بندھن بہت پکا بندھ گیا تھا۔ سب واہموں کو جھٹک کر اس کو باپ کے ساتھ جاتا دیکھتا رہا۔

ہر چند کہ اس کے بعد وہ خاصا پریشان رہا کہ فون بھی نہیں کر سکتا تھا اور خط بھی نہیں لکھ سکتا تھا۔ وہ اسے جاتے ہوئے ہدایت کر گئی تھی کہ وہ عجلت میں کام نہ بگاڑ ڈالے، ساتھ ہی تسلی دی تھی کہ وہ بے فکر رہے، کچھ نہیں ہوگا۔

اور پھر جانے کے بعد اس نے موقع نکال کر سرفراز کو فون بھی کیا تھا اور تسلی دی تھی کہ

وہ ماں کو راز دار بنا کر معاملہ سلجھانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس نے ماں کو بتا دیا ہے کیونکہ وہ اس کے لیے آنے والا ایک پیغام منظور کر رہے تھے۔ امی کا ردِ عمل تو شدید نہیں تھا مگر وہ پاپا کی طرف سے فکر مند ہیں۔

اسے کچھ اطمینان سا ہوا تھا۔

پھر کافی دن گزرنے کے بعد اس کا فون آفس میں آ گیا تھا۔

وہ خاصی پریشان تھی اور کہہ رہی تھی کہ امی نے پاپا کو بتا دیا ہے کیونکہ صورتِ حال ہی ایسی ہو گئی تھی۔ پاپا سخت غصے میں ہیں اور آپ کے ابو کا کیا دھرا یاد کر رہے ہیں۔ مزید یہ کہ وہ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ ان کی معاشی بدحالی کے ذمے دار بھی محمود انکل تھے۔ جس کی وجہ سے انھوں نے اپنی زندگی کا قیمتی وقت سخت مصیبتوں میں گزارا اور بہت جدوجہد کے بعد اس عمر میں وہ دوبارہ خوشحالی حاصل کر سکے ہیں اور انھیں یقین ہے کہ محمود انکل نے ان کی زندگی برباد کی تھی۔ وہ کسی قیمت پر بھی آپ کو اپنا داماد قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔

وہ تو بے اندازہ پریشان ہو اٹھا تھا۔

ابھی وہ کوئی حل سوچ ہی رہا تھا کہ عدالت سے ''سمن'' آ گیا جس میں بتایا گیا تھا کہ مسماۃ نیلوفر خلع چاہتی ہے کیونکہ سرفراز کے ساتھ اس کا نکاح زبردستی کیا گیا تھا۔

اس کے سامنے تو زمین آسمان گھوم گئے۔

کسی طور یقین آ کر نہیں دیا کہ نیلوفر کی طرف سے یہ سمن آیا ہے۔

اپنے ہر شک کو مٹانے ہی وہ عدالت گیا تھا۔

مگر وہاں یقین کی سب جمع پونجی لٹ گئی تھی۔ جب نیلوفر نے اس کے سامنے کھڑے ہو کر کہا۔ وہ سرفراز سے نہ محبت کرتی ہے نہ اس کے ساتھ رہنا چاہتی ہے کیونکہ اس کا نکاح زبردستی کا نتیجہ ہے۔

اس کے اعصاب جواب دینے لگے تھے۔ وہ خود پر قابو نہ رکھ سکا تھا۔ محبت بھری نظریں بدل چکی تھیں۔ وہ اس سے نظریں چرا رہی تھی۔ اس کی کیفیت کیا تھی۔ سرفراز کو جذبات کے اس بھونچال میں کچھ نظر نہیں آیا تھا۔ اپنے جنون و جذبات کا اظہار اس نے یوں کیا تھا کہ اس کے رُخسار پر اپنی پانچوں اُنگلیوں کے نشان چھوڑ دیے تھے۔

اسی بنا پر اس نے نیلوفر کو گھر سے نکال دیا تھا۔

اور اب وحیدہ بیگم کا ٹیلی فون آیا تو ایک نئی مصیبت سامنے آ کھڑی ہوئی۔

آخر یہ سب چکر کیا ہے؟

اس نے میرے سامنے ہی تو بیان دیا تھا۔

پھر وہ اس کی جانب بھاگتی ہوئی کیوں آئی تھی؟

پھر وہ گھر میں کیوں چلی آئی تھی؟

اسے عبید انکل نے یہاں تک آنے ہی کیوں دیا تھا۔ وہ تو خود اس وقت عدالت میں موجود فاتحانہ نظروں سے اسے ذلیل ہوتا دیکھ رہے تھے۔

اور اب آخر وہ کہاں چلی گئی؟

کچھ کچھ معاملہ وہ سمجھ چکا تھا۔

وحیدہ بیگم کا یہ کہنا کہ اس کے باپ باہر گئے ہوئے ہیں، جلدی سے نیلی کو بلا دو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ سب عبید انکل کے جبر کا نتیجہ تھا۔

اور وہ ان کی مرضی کے خلاف شاید ان سے لڑ کر اس کے پاس آئی تھی۔ مگر یہ قدم اس نے پہلے کیوں نہیں اٹھایا؟

وہ از حد اضطراب کا شکار تھا۔

وہ تو اس کا سب کچھ تھی۔ اب اس کی وجہ سے ہی تو دربدر تھی۔ اس کی مشکل یہ بھی تھی کہ وہ حقائق سے وحیدہ بیگم کو بھی مطلع نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کا ذمے دار اب وہ خود تھا۔ کوئی پریشانی سی پریشانی تھی۔



پورے تین ہفتے گزر گئے تھے۔ اس نے کہاں کہاں کی خاک نہ چھان ماری تھی اور آج جب وہ گاڑی پورچ میں لے جانے کے لیے موڑ رہا تھا تو وہ سیاہ چادر میں برابر والی کوٹھی کا گیٹ کھول کر باہر نکلتی نظر آئی۔

پہلے تو اسے یقین ہی نہیں آیا تھا کہ نیلو ہی ہے مگر اسے یقین کرنا پڑا۔ وہ کار سمیت اس کے سر پر جا پہنچا۔

وہ چونک کر ایک طرف ہو گئی۔ پھر اس کی سمت نظر ڈال کر اس طرح آگے بڑھ گئی گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔

وہ دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکلا اور اسے جالیا۔

"اے محترمہ! کیا ڈراما ہے یہ؟"

"یہ ڈراما نہیں، حقیقت ہے۔" وہ ترشی سے کہہ کر پھر چل پڑی۔

"آپ اس گھر میں کیا کر رہی تھیں؟"

"پیٹ پال رہی ہوں اپنا۔ انسان ہوں۔ کھانا پینا بھی تو ضروری ہے جب تک زندگی ہے۔" وہ پھنکار بولی۔

"چہ خوب، اور وہ جو تمھارے والد بڑے ٹھسے سے تمھیں لے گئے تھے۔ چار دن روٹی بھی نہ کھلا سکے۔" وہ استہزائیہ بولا۔ "چلو گھر میں۔" اس نے حکمیہ کہا۔

"میرا کوئی گھر نہیں ہے۔" اس کی آواز رُندھ گئی۔

"دیکھو زیادہ..... گڑبڑ کرنے کی ضرورت نہیں۔ تین ہفتے ہو گئے ہیں نہ کھاتا ہوں، نہ پیتا ہوں، نہ سو سکا ہوں۔"

"کس خوشی میں؟" وہ زہر ہو رہی تھی۔

"خوشی میں نہیں، تمھارے غم میں۔" وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا بولا۔

"اب برائے مہربانی اندر گھر میں چلو۔ ورنہ تم سے زیادہ ڈراما کرنا آتا ہے مجھے۔ ہمسایوں پر اغوا کا مقدمہ دائر کر دوں گا۔ سمجھیں!" وہ دھمکی آمیز انداز میں بولا۔

"میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔" وہ اٹل لہجے میں بولی۔

"دیکھو زیادہ اکڑنے کی ضرورت نہیں۔ میں کوئی فلمی ہیرو نہیں ہوں جو تمھارے ساتھ سڑک پر نغمے گاتا پھروں..... روٹھنے منانے کے۔ دیکھو اگر تم میرے ساتھ نہیں چلو گی تو صبح اخبار میں میری خودکشی کی خبر پڑھو گی۔"

وہ از حد سنجیدہ ہو گیا۔

اس پر فوری اثر ہوا اور وہ چلتے چلتے رُک گئی۔ "آخر آپ کیوں مجھے عذاب میں ڈالنے پر تلے ہیں۔ آپ بھی اور بابا بھی۔" وہ گلوگیر آواز میں بولی۔

"اگر تم یہ سوال گھر کے اندر چل کر کرو تو میں جواب ایک ضمیمہ جتنا دوں گا لکھ کر۔"

وہ زچ سی ہو گئی اور واپس پلٹ پڑی۔

"پہلے تو یہ بتا دو کہ ساتھ والے گھر میں کیا کرنے آئی تھیں؟" اس نے راستے ہی

میں سوال داغ دیا۔

"میں ان کے بچوں کو پڑھاتی ہوں اور انھی کی انیکسی کے ایک کمرے میں بطور کرایہ دار رہتی ہوں۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"کیا، کچھ پوچھا نہیں ان لوگوں نے؟" وہ حیران ہوا۔

"انھیں میں نے سب بتا دیا ہے۔"

"گویا مجھے ذلالت کی انتہا پر پہنچا دیا ہے۔" وہ بولا۔

"یہ بھی آپ ہی کا کیا دھرا ہے۔ کیا آپ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے تھے کہ یہ سب بابا کی زبردستی کی وجہ سے ہو رہا ہوگا۔" وہ بیڈ روم میں پہنچ کر شکایتی انداز میں بولی۔

"اور تم یہ قدم پہلے نہیں اٹھا سکتی تھیں۔" اس نے بھی جواب شکوہ داغا۔

"میں خود میں باپ کے مقابل میں آنے کی ہمت نہیں پاتی تھی۔ پتہ نہیں رازی! لوگ اپنے جذبات اور انا کی بھینٹ بے قصور کو کیوں چڑھا دیتے ہیں۔ اپنی عارضی پریشانیوں سے تنگ آ کر اپنے بچے دوسروں کو کیوں دے دیتے ہیں۔ رازی! لوگ فرض نہیں پہنچانتے تو حق کیوں مانگتے ہیں؟ نفرتیں کرتے ہیں تو نشانہ غیر متعلقہ لوگوں کو کیوں بناتے ہیں؟ جذبات میں انصاف کے لمحے تسخیر نہیں ہوتے۔ ہمارے چاہنے والے اتنے خود غرض اور بے انصاف کیوں ہوتے ہیں؟ اپنی گم گشتہ دشمنیوں کے عوض بے گناہ کی پوری زندگی تاوان میں کیوں دے دیتے ہیں؟" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

"اگر میں اپنے والدین کا فرض تھی تو اتنے سالوں میں انھوں نے اپنے فرض سے غفلت کیوں برتی؟

اگر انھوں نے میری ذمے داری امی (ساجدہ بیگم) کو سونپی تھی تو ان کے فیصلے کو کیوں تسلیم نہیں کیا تھا۔

محمود انکل کا کیا یا پاپا کا کیا اگلی نسل کس جرم کی پاداش میں بھگتے؟

یہ لوگ ساری عمر دانائی کا منبع سمجھتے ہیں خود کو۔ اور نہیں جانتے کہ جذبات دانائی کا زنگ بھی بن جاتے ہیں۔

اور زنگ آلود دانائی انصاف نہیں کر سکتی۔

آپ کو کیا پتہ مجھے کس طرح اور کیا کیا کہہ کر عدالت تک لایا گیا۔ مگر آپ پر نظر

پڑتے ہی میں......

وہ میرے باپ ہیں۔ اگر وہ آپ کی مخالفت میں کوئی عقلی دلیل دیتے تو میں دے دیتی قربانی مگر محض ''باپ'' کی دشمنی کوئی دلیل نہیں تھی۔''

''اس کے باوجود بھی تم عدالت تک آ گئیں؟'' وہ رہ نہ سکا، کہہ گیا۔

''آپ ان حالات سے واقف نہیں ہیں جن کا سامنا میں نے کیا ہے۔'' اس نے اشک پونچھے۔ ''آپ کو کیا پتا جب حقیقی والدین سامنے ہوں اور محبتوں کو قرض کی صورت مانگ رہے ہوں۔ جنم دینے کا خراج طلب کر رہے ہوں تو کسی کی پوزیشن کیا ہو جاتی ہے؟ مگر جب عدالت میں آپ پر نگاہ پڑی تو مجھے یاد آیا کہ میں گزشتہ کئی مہینوں سے گھٹن کا شکار ہوں پھر بھی مجھ میں ہمت نہیں ہوئی۔ لیکن آپ کا طمانچہ...... جو آپ کی محبت اور جنون کی علامت تھا۔ اس نے جیسے میرے ہر سوئے ہوئے جذبے کو جگا دیا۔ میں آپ کے پاس چلی آئی کہ آپ میری بات ٹھنڈے دل سے سنیں گے مگر آپ......'' وہ اب ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔

وہ واقعی بہت نادم سا تھا اور خود کو بہت بڑا مجرم سمجھ رہا تھا۔

''واقعی ہم انسان جذبات میں روشنی جیسا واضح انصاف نہیں کر پاتے۔ خود پرستی اور محض انا کے گرداب میں پھنس کر اپنے سے وابستہ زندگیوں کو خواہ مخواہ سزا دیتے ہیں۔ وہ سوچ رہا تھا۔

''کیا عبید انکل نے تمھیں گھر سے نکال دیا تھا؟'' اس نے پوچھا۔

''وہ مجھے خود یہاں چھوڑ کر گئے تھے۔ یہ کہہ کر کہ آئندہ کبھی ان کے سامنے آنے کی کوشش نہ کروں۔''

''امی بھی تھیں؟''

''ہوں؟'' نیلو نے چادر کے کونے سے آنکھیں صاف کیں۔

''اور علیم؟''

''نہیں، بھائی جان نہیں تھے۔''

''اور تم برابر میں رہنے لگیں؟''

''ہاں، یہ یقین تھا کہ یہ غیر ہیں مگر مدد کریں گے۔'' وہ روٹھے روٹھے انداز میں بولی۔

''بالکنی سے مجھے دیکھنے کے لیے جھانکا تو کرتی ہو گی؟'' وہ شرارت سے مسکرایا۔

''کیا ضرورت تھی؟'' وہ ناراضگی سے بولی۔

اور فون کی طرف بڑھ گیا۔

وہ وحیدہ بیگم سے مخاطب تھا۔ تمام تفصیل سے آگاہ کر رہا تھا۔

''اگر نیلوفر کو کچھ ہو جاتا تو اس کے ذمے دار سراسر آپ لوگ ہوتے۔ اس کی حالت بے حد خراب ہے۔ آپ آنا چاہیں تو آ جائیں۔ کیسی باتیں کرتی ہیں آنٹی آپ، گھر ہے آپ کا'' پھر ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''اور آپ کی بیٹی کا۔'' مگر وہ اسی طرح خفگی کے انداز میں بیٹھی رہی۔

''میں انکل کو منانے کی ہر ممکن کوشش کروں گا...... آپ چھپ کر آ رہی ہیں؟ آ جائیں، بے فکر رہیں، انھیں پتہ نہیں چلے گا اور نہ علیم کو۔''

وہ چادر اتار کر باتھ روم میں منہ دھونے چلی گئی تھی۔

واپس آئی تو وہ وٹامن کی شیشی کھولے کھڑا تھا۔

نیلو دوبارہ مہمانوں کی طرح کرسی پر بیٹھ گئی۔

اس نے ایک ٹیبلٹ منہ میں ڈالی اور پانی کا گلاس منہ سے لگا لیا۔ وہ چوری چوری اسے دیکھ رہا تھا۔

''ناراض ہو اتنے دھواں دار مکالموں کے بعد بھی؟'' وہ گھونٹ بھر کر بولا۔

وہ چپ رہی۔

''دکھ درد ملے جس میں وہی پیار امر ہے۔''

اس نے رفیع کے انداز میں اونچے سُر سے نغمہ شروع کیا۔ انداز وہی شریر تھا جس سے صرف وہی آشنا تھی۔

اسے اس قدر ''بے سُرا'' پا کر نیلو نے بمشکل منہ پھیر کر مسکراہٹ چھپائی تھی۔



کاسۂ دل

جس طرح اندھوں میں کانا، راجا یا سردار کی حیثیت رکھتا ہے، بالکل اسی طرح اس محلے میں مولوی صاحب کی حیثیت تھی۔

مٹھی بھر داڑھی، پنج وقتہ نمازی اور صحاح ستہ کے نام ازبر ہونے کی بنا پر انھیں ''مولوی صاحب'' کے ٹائٹل یا خطاب سے سرفراز کیا گیا تھا۔ وہ امامت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے اور انھیں محلے کے ''محکمہ قضاۃ'' میں چیف جسٹس کی معتبر نشست بھی حاصل تھی۔ یوں مولوی صاحب کی مصروفیات اس ملک کے کسی بھی بڑے آدمی سے کسی طور کم نہ تھیں۔

شیخ معین الدین کے مکان میں انسانوں کا ایک انبوہ موجود تھا اور شور میں کوئی بھی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی سوائے اس کے کہ مولوی صاحب کب آئیں گے؟ باہر کھڑے ہوئے متعدد افراد بات کی تہ تک پہنچنے کے لیے ازحد بے چین تھے اور یہ بھی جاننا چاہتے تھے کہ ''خصوصی عدالت'' کا وقت کیا ہے؟

''پتا نہیں مولوی صاحب کہاں رہ گئے۔ وہ عصر کے فرض پڑھا کر نکلے تھے پھر جانے کس طرف چلے گئے۔ اب تو مغرب کی نماز کا وقت ہوا چاہتا ہے۔'' کسی نمازی نے مقدور بھر معلومات تشویش کے لفافے میں بند کر کے آگے بڑھائیں۔

''اے بٹی! خدا کے لیے روؤ مت۔ مولوی صاحب آتے ہوں گے، وہی طے کریں گے کہ تمھارے لیے کیا کیا جائے؟ اے ہے، کیا اندھیر ہے، ظالم لوگ کنواری لڑکی کو دھکے دے کریوں باہر نکال دیتے ہیں۔ ایمان تو دلوں سے اُٹھ گیا ہے۔ خوف خدا بھی نہیں رہا۔'' کسی بوڑھی عورت نے حالاتِ حاضرہ کی تصویر کشی کرنا ضروری خیال کیا۔

اسی وقت اذانِ مغرب شروع ہوئی۔ نمازیوں نے مسجد کی سمت قدم بڑھا دیے۔ مسجد میں مولوی صاحب پہنچ چکے تھے۔ لوگوں نے انھیں دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔ نماز ختم ہونے تک تو یہ واقعہ نمازیوں کے سینوں میں بند رہا لیکن نماز تمام ہونے پر لوگوں نے مولوی صاحب کو

گھیر کر آج کی تازہ خبر سنا دی۔

شیخ معین الدین کی بیٹھک میں بیٹھے حد درجہ باحیا مولوی صاحب ''محترمہ'' سے ضروری سوال کر رہے تھے۔ محترمہ بیٹھک کے دروازے کی اوٹ میں چند اور خواتین کے ہمراہ تشریف فرما تھیں۔

''بی بی! یہ درست، مان لیا اکثر سوتیلی مائیں اسی روّیے کے سبب بدنام ہو جاتی ہیں۔ لیکن تم نے بھی گھر چھوڑ کر سخت غیر عاقلانہ فیصلہ کیا ہے۔'' وہ بولے۔

''مولوی صاحب! گھر میں نے نہیں چھوڑا۔ مجھے زبردستی دھکے مار کر نکالا گیا ہے؟'' آواز پر سسکیاں غالب تھیں۔ ''میری سوتیلی ماں کا سلوک تو میرے والد کی زندگی ہی میں اچھا نہیں تھا۔ حالانکہ میں نے اپنی خدمت سے ان کا دل جیتنے کی بہت کوشش کی تھی۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد تو انھوں نے میرا جینا دوبھر کر دیا اور آج صبح ہی سے وہ میرے پیچھے پڑی ہوئی تھیں۔ دوپہر کو انھوں نے مجھے مار کر اور یہ کہہ کر نکال دیا کہ آئندہ اپنی منحوس صورت انھیں نہ دکھاؤں۔'' ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان بتایا گیا۔

''آہ۔ ہا۔'' کئی ٹھنڈی آہوں نے پنکھے کی کمی پوری کرنے کی کوشش کی۔

''لیکن بی بی! تمھیں انجان راستوں پر چلنے کے بجائے اپنے کسی رشتے دار کے ہاں چلے جانا چاہیے تھا۔'' وہ فطری سادگی و شائستگی سے گویا ہوئے۔

''میرا کوئی رشتے دار نہیں۔ پاکستان بننے کے بعد تمام خاندان میں سے صرف میرے والد نے پاکستان ہجرت کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ چار بہنوں کے اکلوتے بھائی تھے۔ میرے والد بتایا کرتے تھے کہ ان کے تمام خوشحال رشتے داروں نے ''آزادی'' سے زیادہ اپنی جائیدادوں اور چلتے کاروبار کو اہم سمجھا تھا۔ میرا اس ملک میں کوئی رشتے دار نہیں۔''

یہ سن کر اکثر رقیق القلب خواتین کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

''بات یہ ہے بی بی کہ آج کا زمانہ بہت خطرناک ہے۔ لوگ کیا ہوتے ہیں مگر کیا بن کر ملتے ہیں۔ اب یہ بتاؤ ہم اہل محلہ تمہاری کیا مدد کر سکتے ہیں؟ اگر تم پسند کرو تو ہمیں سوتیلی ماں سے ملواؤ۔ ہم انھیں سمجھانے کی کوشش کریں گے۔''

''خدا کے لیے مجھے اس عذاب میں دوبارہ ڈالنے کا سوچیے گا بھی نہیں۔ اس سے بہتر ہے کہ میں سمندر میں کود کر جان دے دوں۔'' وہ خوفزدہ انداز میں بولی۔

''معاذ اللہ!'' مولوی صاحب کا معصوم دل کانپ کر رہ گیا۔ اس مبینہ ''اعلانِ خود کشی'' پر چند لمحے انھیں اپنا دل سنبھالنے میں لگ گئے۔

''تو پھر بتاؤ تم نے اس '' کچی بستی'' میں پناہ لینے کا ارادہ کیا سوچ کر کیا؟ ہم غریب لوگ ہیں یہاں کوٹھیاں ہمارے پاس نہیں کہ ہمیں گھریلو ملازمین کی ضرورت پیش آئے۔ جیسا کہ شیخ صاحب نے بتایا کہ تم گھریلو ملازمہ کے طور پر کام کرنے کی خواہش مند ہو۔ یہاں تو ان بے چاروں کو اپنے پیٹ کی فکر سے ہی فراغت نہیں۔ تمہاری کیا مدد کر سکتے ہیں؟''

''مولانا صاحب!'' لڑکی کی ٹھہری ہوئی آواز آئی۔ ''اگر اس محلے میں کوئی گھر ایسا ہے جس میں بوڑھے میاں بیوی رہتے ہوں تو میں ان کی خدمت کر کے خوشی محسوس کروں گی۔''

دو بہوؤں کی ساس کو یک دم اپنا بڑھاپا اور اولاد کی بے توجہی یاد آ گئی جو اسے چھوڑ کر جا چکی تھیں، اس نے جھٹ خود کو پیش کر دیا۔

کچی آبادی کے ان سیدھے سادے لوگوں کو مزدوریوں اور بیماریوں سے لمحے بھر کی فراغت نہیں تھی۔ انھوں نے جیسے جہالت کے اندھیروں سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ ان کے بچے البتہ پڑھ رہے تھے مگر وہ بھی جبراً۔ نہ انھیں تحقیق کے انداز آتے تھے۔ نہ انسانوں کی سمجھ بوجھ تھی۔

ان ہم درد، غمگسار اور محنت کش لوگوں میں صرف ایک مولوی صاحب ہی تھے جو پرائمری اسکول میں سینئر استاد ہونے کے ساتھ ساتھ بستی کی ہمہ صفت اور قابل احترام شخصیت تھے، انھوں نے فیصلہ سنا دیا:

''بی بی تم اس بوڑھی خاتون کے پاس رہ سکتی ہو۔ لیکن سراسر اپنی ذمے داری پر۔ اس شہر میں بے سہارا عورتوں کی فلاح و بہبود کے لیے کئی مراکز بھی ہیں۔ اگر تمہارا ارادہ ہو تو ظاہر کر دینا، میں تمہاری مدد کر کے انسانیت کے ناتے، بہت خوشی محسوس کروں گا۔''

❀

عدالت، برخواست ہوگئی، اہل محلہ کے لیے اس نو وارد لڑکی کا وجود کسی نعمت سے کم نہ تھا۔ وہ ہنر مند تھی، ان کے اچھے اچھے کپڑے سی دیا کرتی۔ انتہائی کم قیمت کپڑے استعمال کرنے والوں کے ملبوسات کی ایسی ڈیزائننگ کرتی کہ انھیں بھی اچھا لباس میسر آ جاتا۔ اسکول جانے والے بچے شام کو اس کے پاس پڑھنے چلے جاتے۔ بڑی بی کے اجاڑ گھر میں خوب رونق لگی رہتی۔ خوبصورتی و حسن تو بجائے خود روشنی ہوتا ہے۔ اس ضعیفہ کے گھر کے در و دیوار جگر جگر کرنے

لگے تھے اور بوڑھے ناتواں وجود کو آرام بھی میسر آ گیا تھا۔

وہ لڑکی اپنا تعارف پہلی ملاقات ہی میں کرا چکی تھی۔ اب لوگوں کے پاس کھوجنے کو کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ جب کبھی کوئی خاتون بات کرنا چاہتی تو سوتیلی ماں کا حوالہ خوب تھا۔ عموماً محلے کی خواتین اس کی سوتیلی ماں کے ذکر سے گفتگو کا آغاز کرتیں یا پھر ہندوستان میں مقیم اس کے رشتے داروں کے جنموں میں کیڑے ڈالتیں۔ جنھوں نے پلٹ کر اس کی خبر نہیں لی تھی۔

اس کے ہاتھ میں بلا کا ذائقہ تھا۔ عام اور سادہ سا کھانا بھی بہت مزیدار محسوس ہوتا تھا۔ اب محلے کی بزرگ خواتین و حضرات کو ایک سوچ مستقل لگی تھی کہ اس بے سہارا لڑکی کا گھر آباد کر دیا جائے۔ انھوں نے اس کے لیے بَر ڈھونڈنا چاہا تو وہ اتنی مصفا اور پاکیزہ نظر آئی کہ اس کے سامنے محلے کا ہر شخص گندا اور جاہل نظر آنے لگا۔ محلے کی خواتین ایسی سگھڑ، سیانی کے ساتھ کوئی ظلم یا ناانصافی نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ بہت ہاتھ پاؤں مارے گئے۔ آخر کار نظر تھک کر مولوی صاحب پر آ ٹھہری، مضبوط کاٹھی کے سیاہ داڑھی والے، انکسار و حیا کے سبب گردن جھکا کر چلنے والے جب محلے کے سب سے معمر اور سب سے ناخواندہ شخص کے ذریعے ان تک یہ بات پہنچی تو وہ نہایت حلیم انداز میں گویا ہوئے۔

''میاں صاحب! ان کے لیے خدا کوئی اچھا بندوبست ضرور کرے گا انشاء اللہ۔ میں ان کے لائق نہیں ہوں۔ وہ بہت کم عمر ہیں۔'' پینتیس، اڑتیس سال کے مولوی صاحب نے واضح انکار کر دیا۔ حالانکہ انھیں باور کرایا گیا تھا کہ لڑکی کو چنداں اعتراض نہیں ہے مگر کسی کی ہمت نہیں تھی کہ وہ مولوی صاحب سے اصرار کر سکتا۔ ناچار لوگ چپ ہو گئے۔

ہر جمعرات کو لوگ کوئی میٹھی چیز پکوا کر مولوی صاحب کے حضور پیش کیا کرتے، یہ عمل مولوی صاحب کو پسند نہیں تھا۔ مگر انھیں ناچار سادگی کے مارے عقیدت مندوں کا دل رکھنا ہی پڑ جاتا۔ بڑی بی ہر جمعرات کو گوشت پکاتی تھیں اور مولوی صاحب کو کھانا ضرور بھجواتی تھیں جبکہ مولوی صاحب نے بارہا انھیں اس ''نیک عمل'' سے باز رکھنا چاہا۔ مولوی صاحب کے ذمے اس محلے کے اور بھی بہت سے کام تھے، کسی کے گھر ختم کا نیاز ہے تو مولوی صاحب کی ذمے داری، کسی کے بچے کو نظر لگ جانے کا شبہ ہوا تو وہ دوڑا ہوا چلا آیا۔ دم کرانے، کسی کے چکر رکنے کا نام نہیں لے رہے تو پانی پڑھ کر دینا مولوی صاحب کا کام۔

شاید کھانے پینے کی اشیاء انھیں بطور اعزاز پیش کی جاتی تھیں جو انھیں محجوب کرتی

تھیں۔ آسودہ نہیں مگر یہ ناخواندہ لوگ مقابل کی ''انا'' کا ادراک نہیں رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ سب مولوی صاحب کا ''حق'' تھا۔

آج جمعرات تھی۔ بڑی بی نے ''ہفت روزہ'' گوشت پکایا تھا۔ بلکہ کلثوم نے پکایا تھا۔ اس نووارد لڑکی نے اپنا نام اُم کلثوم بتایا تھا لیکن اہل محلّہ اسے صرف کلثوم کہتے تھے۔ بڑی بی کو کل رات سے بخار تھا لہٰذا وہ بڑی بی کی اجازت سے مولوی صاحب کے ہاں خود کھانا لے کر آئی تھی۔ اس نے بوسیدہ چوبی دروازے پر پڑی زنجیر ہلائی تو لمحاتی توقف کے بعد مولوی صاحب آ موجود ہوئے مگر ملگجی چادر میں لپٹی کلثوم کو دیکھ کر تھوڑا سا گھبرائے اور دروازے کی اوٹ میں ہو گئے۔

''جی بی بی! فرمایئے۔'' بلا کا شائستہ لہجہ تھا۔

کلثوم تو آخر کار لڑکی تھی، مردانہ حجاب پر اُلٹی شرمندہ ہوگئی۔ ''کھانا لائی تھی مولوی صاحب!''

''آپ نے کیوں زحمت کی؟ امید ہے آئندہ آپ۔'' انھوں نے ہاتھ بڑھا کر ٹرے تھامی اور دروازہ بند کرلیا۔ کلثوم الٹے پاؤں واپس ہوگئی۔

مولوی صاحب کے بچے کھچے اہل خانہ کسی دور افتادہ گاؤں میں بستے تھے۔ کبھی کبھار ان کے بڑے بھائی اور بھابی آ جایا کرتے تھے۔ مولوی صاحب اپنی سرکاری ملازمت کے باعث اس شہر کی اس کم مایہ کچی بستی میں رہنے پر مجبور تھے۔ ان کا اسکول بھی یہاں سے نزدیک تھا۔ وہ اس بستی میں اپنی رہائش پر مطمئن تھے۔ آج کل پھر ان کے بھائی بطور مہمان ان کے ہاں آئے ہوئے تھے۔ اس مرتبہ مولوی صاحب کی بھابی، مولوی صاحب کی شادی پر سخت مصر تھیں کہ وہ اب ان کا نکاح پڑھوا کر ہی جائیں گی۔ اہل محلّہ ان کے اس ''مشن'' پر مسرور تھے اور اپنی نیک خواہشات کا اظہار کر رہے تھے۔

جب اہل محلّہ نے بھاوج کی توجہ کلثوم کی سمت مبذول کرا کر یہ بتایا کہ وہ رشتہ اپنے طور پر مولوی صاحب کے سامنے پیش کر چکے ہیں لیکن اس مرتبہ انھوں نے نکاح سے یہ کہہ کر معذوری ظاہر کی ہے کہ لڑکی بہت کم عمر ہے۔ مولوی صاحب کی بھاوج اللہ کی ایسی شان دار نعمت سے منہ موڑنے پر اپنا سر پیٹ کر رہ گئیں اور نئے سرے سے ان کے پیچھے پڑ گئیں کہ لڑکی تو تمھارے ساتھ نکاح پر راضی ہے۔ اس پر کوئی زبردستی تو نہیں کر رہا ہے اور بالآخر انھوں نے اس

مرتبہ یہ مہم سر کر ہی لی۔

نکاح سادگی سے ہوا۔ چھوہارے اور شربت سے مہمانوں کی تواضع ہوئی اور مولوی صاحب کا مکان ''گھر'' بن گیا۔

اس دن کلثوم رو رو کر تین مرتبہ بے ہوش ہوئی تھی۔ اس کا اس طرح بے حال ہونا سمجھ سے بالاتر تھا۔ روتے روتے اس نے کئی مرتبہ ہذیان بھی بکا تھا۔ عورتیں آخر کار یہی سمجھیں کہ اس اہم موقع پر اسے اپنے یاد آ رہے ہیں۔

اس کے حافظے میں گزرے وقت کا لمحہ لمحہ روشن تھا۔ اسے یاد تھا کہ بچپن سے لے کر آج تک کبھی ایسی خوش بخت گھڑی نہیں آئی تھی، جس میں انھوں نے یعنی کلثوم کے بھائیوں نے اور استانی جی کے اکلوتے لیکن لے پالک بچے نے ایک دوسرے کو دوستانہ نظر سے دیکھا ہو۔

اسے یاد تھا کہ جب اس کے بھائی ''زمانۂ طفلی'' میں تھے، اس ''لے پالک'' کے ساتھ یادگار لڑائیاں لڑی گئی تھیں۔ یادگار اس لیے کہ ہر لڑائی کے بعد کسی نہ کسی کے وجود یا چہرے پر زخم کا نشان ضرور لگا تھا۔ جس نے اس لڑائی کو یادگار بنا دیا تھا۔

اس زمانے میں وہ بہت ہی معصوم تھی، منصفانہ حِس سے یکسر بے بہرہ لیکن جب ہوش کی دنیا اس پر روشن ہونا شروع ہوئی تو اسے یہ اندازہ لگانے میں قطعی دشواری پیش نہ آئی کہ دراصل اس کے بھائیوں کے وجود میں خون کی جگہ شرارت دوڑتی ہے اس لیے کہ وہ خود بھی بارہا ان کی شرارتوں کی زد میں آئی اور بُری طرح آئی۔ اس کے بھائیوں کو خواہ مخواہ اس کی اکلوتی گڑیا سے بہت زیادہ چڑ تھی۔ بے چاری کی ٹانگ توڑ کر جب تک اسے اپاہج نہ بنا دیتے، انھیں چین ہی نہ آتا۔ کبھی وہ اس کے پسندیدہ کپڑے چھپا دیتے اور کبھی آتے جاتے اس کے چٹکی لینا بہت ضروری سمجھتے، اپنے بھائیوں کی ان حرکتوں سے وہ اندازہ لگا چکی تھی کہ محلے بھر سے لڑائی مارکٹائی کی جو خبریں آتی ہیں، ان کا نقطۂ آغاز اس کے دونوں بھائیوں کی ذات ہوتی ہے۔

اس نے بلا کی غیر جانبدار طبیعت پائی تھی، اسے بھائیوں کی شرانگیزیاں اور سونے پر سہاگا، ماں کی حمایت ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں، مگر تب وہ بہت چھوٹی تھی کون اس کی سنتا؟ پہلی بار اس نے تب احتجاج کیا تھا جب اس کے بھائیوں نے اسے استانی جی کے ہاں ''سیپارہ'' پڑھنے سے روکا اور ماں سے کہا کہ وہ اس کے لیے گھر پر ہی کسی قاریہ، قاری یا حافظ کا انتظام کر دیں گے۔ تب اسے بُری طرح غصہ آ گیا تھا۔ استانی جی کا گھر کون سا دور ہے؟ دیوار سے دیوار ملی

ہے اس کی ساری سہیلیاں وہیں قرآن مجید پڑھتی ہیں۔ گاہے گاہے اُٹھ کر استانی جی کے کام کرتی ہیں اور جان بوجھ کر کام دیر سے کرتی ہیں۔ ٹھٹھے لگاتی ہیں۔ گرمیوں میں استانی جی چھت پر کچے آم، ہلدی نمک لگا کر سکھانے کو ڈالتی ہیں تو وہ کپڑے اتارنے کے بہانے اوپر جاتی اور دو چار ہلدی نمک لگی کچی پھانکیں ہضم کرتی ہیں۔ بعد کو استانی جی سوچتی رہ جاتی ہیں کہ اس مرتبہ دس سیر آم بہت ہی سوکھ گئے۔ پار سال بھی اتنے ہی آموں کا اچار ڈالا تھا مگر وہ تو اتنے نہیں سوکھے تھے۔

اب اس کے بھائی اس سے زندگی کی یہ خوبصورت رونق چھین لینا چاہتے ہیں۔ ابھی وہ بہت چھوٹی تھی۔ بہت سی ''بے جا'' ضدیں بھی اسے جائز ہو جاتی تھیں۔ لہٰذا اس نے اعلان کر دیا کہ وہ قرآن پڑھے گی تو صرف استانی جی سے ورنہ کسی سے نہیں پڑھے گی۔

ماں کے سمجھانے پر بھائی رضامند تو ہو گئے، مگر اسے گھورا بہت تھا۔ تب اس نے ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کے منہ بسور کر کہا تھا۔

''امی! آصف بھائی اور چھوٹے بھائی، انعام بھائی سے لڑتے ہیں، میں تو نہیں لڑتی، پھر میں کیوں استانی جی کے ہاں نہ جاؤں؟''

''نہیں نہیں بیٹی! تمھیں کیوں منع کریں گے استانی جی کے ہاں جانے سے، وہ تو بہت اچھی اور مہربان عورت ہیں۔ پھر میری بیٹی سے پیار بھی کرتی ہیں۔ آصف، ماجد تو پاگل ہیں، زمانے بھر کے شرارتی۔'' ماں کے خیالات سے اسے یک گونہ اطمینان حاصل ہوا۔ اس کا استانی کے ہاں بے خوف وخطر جانا آنا بدستور رہا۔ یہاں تک کہ تیسوں پارے عمر کی گیارہ منزلوں تک آتے آتے اس نے پڑھ ڈالے۔

''انعام اللہ'' یہ نام استانی نے اپنے اس لے پالک بیٹے کا چاہتوں کے ساتھ رکھا تھا۔ بیوگی کی تازہ فصل پر عمر کی درانتی چلا رہی تھیں کہ کسی دور پار کے عزیز نے انھیں اللہ کا یہ ''انعام'' پہنچایا تھا۔ انعام اللہ دو ماہ کا تھا۔ جب استانی جی کے بازوؤں میں آیا تھا اور انھوں نے اپنی پسند سے یہ نام رکھا تھا۔ سنا تھا کہ بچے کی ماں زچگی کے چند گھنٹے بعد ہی اسے تنہا چھوڑ گئی تھی مگر استانی جی نے اسے بہت پیار سے پالا تھا۔ بچپن کے برعکس جب وہ آصف اور ماجد کے ساتھ برسرِ پیکار رہتا تھا۔ بڑا ہو کر وہ بہت سلجھا ہوا نکلا تھا۔ بہت کم لوگ یہ بات جانتے تھے کہ وہ ''جارح'' نہیں تھا۔ اس کی جنگ ہمیشہ دفاعی ہوتی تھی۔ بے غیرتی و بے حمیتی اس کی مٹی

میں نہیں تھی۔ وہ خاموشی سے ظلم سہنے والوں میں سے بھی نہیں تھا۔ اس کا ڈیل ڈول آصف و ماجد دونوں سے مضبوط اور نکلتا ہوا تھا۔

متوسط طبقے کی اس کالونی میں جہاں بھانت بھانت کے لوگ بستے تھے۔ سب ایک دوسرے کے دوست تھے۔ علاوہ ان تینوں کے، یہ آج بھی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ ان کے سینوں میں انتقام کے الاؤ دہکتے رہتے تھے۔

اسکول ایک رہا جہاں سے کئی بار ''معرکہ رپورٹ'' گھر آئی، پھر ان کا کالج ایک رہا۔ یہ اتفاق تھا کہ وہاں قائم ''پارٹی بازی'' سے ان کے چوبارہ الگ ہو گئے۔ تینوں نے ایک دوسرے کی حریف مخالف پارٹی سے تعلق قائم کیا۔

ان کی دشمنی دیکھ کر اس کے اعصاب شل ہو جاتے اور دل وحشت زدہ، پھر کالج میں پکڑے جانے والے لڑکوں میں آصف کا نام بھی دیکھا گیا تو گھر والوں کو سانپ سونگھ گیا۔ باپ بے چارہ کہاں کہاں خوار نہ ہوا۔ آصف دو دن سرکاری مہمان کیا بنا کہ اس کے تو اطوار ہی بدل گئے۔ اب تو اسے یہ ناز بھی تھا کہ وہ حوالات کی ہوا کھا کر آ چکا ہے۔ آخر پٹھان خون ہے کسی بزدل کا نہیں۔

وہ استانی جی کے ہاں کم جاتی تھی اور انعام سے سامنا بھی کبھی کبھار ہی ہوتا تھا۔ مگر وہ اس پر کبھی اچٹتی نظر بھی نہیں ڈالتا تھا اس لیے نہیں کہ وہ کم رو تھی بلکہ اس لیے کہ قرآن پڑھنے کے لیے آنے والے بچوں کے شور سے وہ بہت گھبراتا تھا اور زیادہ تر گھر سے باہر ہی وقت گزارتا تھا۔ ایک روز جب وہ کالج سے تھکا ہارا گھر آیا تو ''قاری بچوں'' کے بے ترتیب جوتوں، چپلوں سے الجھ کر گرتے گرتے بچا اور بھنا کر رہ گیا۔

''اماں جان! کم از کم ان بچوں کو جوتے اتارنے اور رکھنے کی تمیز تو سکھا دیں۔''

''جوتے ہمیشہ اسی جگہ پائے جاتے ہیں اور اسی انداز میں۔ یہ خیال آپ کو پہلے کیوں نہیں آیا کہ بچوں کو ''تمیز'' سکھانا چاہیے؟'' وہ اسے گرتے گرتے سنبھلتا دیکھ کر بے ساختہ کہہ اٹھی تھی۔

انعام نے چونک کر اس ''شرانگیز'' آواز کی سمت دیکھا۔

''تسلیم!'' وہ بولی۔

اس نے غور سے دیکھا جو واقعتاً سرتاپا تسلیم و نیاز نظر آ رہی تھی۔

"اے ہاں یہ تسلیم ہی تو ہے، بڑی سمندر پار سے آئی ہے جو پہچانی نہیں جا رہی۔
ارے یہ تو بہت چھوٹی سی تھی تب سے آ رہی ہے؟"

ماں کے ان جملوں پر اس نے بہ غور اس کے "نیاز" حاصل کیے۔ دراصل جب سے اس نے قرآن مجید ختم کیا تھا، اس کا استانی جی کے ہاں کم ہی آنا ہوتا تھا۔ وہ بھی بہ مشکل کسی بہانے سے جیسے کہ آج آ گئی تھی۔ "کونتوں" کا ہدیہ لے کر، اور جب وہ آتی تھی تو انعام اسکول، کالج یا میچ وغیرہ کھیلنے گھر سے باہر ہوتا تھا۔

یہ عجیب لیکن اچھی بات تھی کہ بچوں کی اکثر اوقات کی چشمک کے باوجود دونوں گھروں کے بڑوں کا رویہ ایک دوسرے کے ساتھ نارمل تھا۔ جس پر دونوں طرف کے بچے اپنے بڑوں سے نالاں تھے اور چاہتے تھے کہ دونوں گھرانے آپس میں عام سی صاحب سلامت بھی نہ رکھیں۔

انعام، اسے واقعی اللہ کا انعام لگا تھا۔ وہ جو مہینے بھر تک استانی جی کے دروازے کو دور سے تکا کرتی تھی، اکثر استانی جی کے کام کرتی نظر آنے لگی۔ میٹرک کے امتحانات کے بعد فراغت تھی۔ عموماً اپنی سلائی کڑھائی کا سامان لے کر ان کے ہاں آ جاتی۔ اسے خود یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے؟ کیا اسے "کچھ" اچھا لگا ہے؟ اور بات یہ ہے کہ جو شے اچھی لگتی ہے، بغیر دلیل کے بھی اچھی لگتی ہے۔ اچھے لگنے کا کوئی پیمانہ نہیں ہے۔ پہلے چیز بے ساختہ اچھی لگتی ہے پھر انسان اپنے دل سے دلیل طلب کرتا ہے کہ "یہ" اسے کیوں پسند آئی؟ اور دل، دلیل کا گھر نہیں ہے۔ دلیل کا ٹھکانہ عقل ہے جو کب کی منہ بسور کر، کواڑ پھیر کر بیٹھ چکی ہوتی ہے لہٰذا وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی۔ اُدھر وہ بھی انجان نہیں تھا۔ محتاط تھا۔ پارسا تھا اپنے وقار کے لیے بے پناہ حساس تھا۔ اس لیے خاموش تھا۔

نئے سال کے چند ماہ گزرے تھے کہ قدرت نے تسلیم کو یتیمی کے امتحان اور بھائیوں کی حاکمیت کے عذاب میں ڈال دیا تھا۔ اس کے سر سے مضبوط سائبان مٹ گیا تھا۔ جب ماں ہی ٹوٹی ہوئی نظر آئی تو اس کا کیا سوال۔ وہ تو محض اپنے وجود ہی میں قید ہو کر رہ گئی۔ دل کے چور نے علیحدہ اس کی "مشکیں" کس دی تھیں۔ اسے بھائیوں کی خونخوار اور سخت نظریں اپنا آپ پڑھتی محسوس ہوتیں۔

اور جب وہ ایک عرصے بعد مرحوم کی عزت کا ادراک کر کے استانی جی کے گھر آئی تو وہ اسے سامنے ہی مل گیا۔ بیٹھا جوتوں کے تسمے کس رہا تھا۔ صحن میں بچوں کا مخصوص شور تھا۔ اس

نے سر اٹھا کر اس کی سمت دیکھا اور مسکرا دیا۔

"کہاں تھیں؟"

ساری اولوالعزمی یہاں وہاں کہیں بہہ گئی اور اس نے سوچا۔ "وہاں جہاں تم آج تک نہیں پہنچے۔"

گویا وہ اس کی آمد کو محسوس کرتا رہا ہے، وہ تو سمجھ رہی تھی کہ وہ اس پر ایک اچٹتی نظر بھی نہیں ڈالتا۔ وہ جواب دیے بغیر آگے بڑھ گئی۔ مگر اس کے چہرے پر بڑا حوصلہ افزا تاثر تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک بار اس نے اتفاق سے ماں کی وہ ایک بات سن لی تھی۔ وہ اس کے بھائیوں سے کہہ رہی تھی۔ "استانی جی تسلیم کو بہت زیادہ پسند کرتی ہیں۔ کئی بار اشارتاً کہہ چکی ہیں کہ وہ اسے اپنی بیٹی بنانا چاہیں گی۔"

"اوقات دیکھی ہے بڑھیا نے؟ اور کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں اس کے اس زبردستی کے بیٹے میں؟" آصف کا طرز تخاطب اس گھر کے ذکر پر پستیوں کی انتہا کو جا پہنچا تھا۔

"اور اگر اس طرّم خان نے ایسا سوچا ہو گا تو جان سے مار کر چوک پر لٹکا دوں گا۔" ماجد بولا۔

"اس قدر آپے سے نکلنے کی کون سی بات ہے؟" ماں نے جھڑک دیا۔ "ایک بات ہو رہی تھی۔ آج بھی کل کے ننھے بچے بنے ہوئے ہیں۔ توبہ ہے۔" ماں نے مزید لعن طعن جاری رکھی اور وہ ایک نئے کرب سے آشنا ہو گئی۔ ناممکن کو ممکن بنانے کی صلاحیت نہ ہو اور احساسِ بے بسی کی انتہا ہو تو خواہش جنون بھی بن جاتی ہے۔ پابندی ازل سے حوا اور آدم کے تجسس اور شوق کو بھڑکاتی آئی ہے۔ اسے خونی رشتے سانپ بن کر ڈسنے لگے تھے۔

تسلیم اب بھی آنکھ بچا کر وہاں ہو آتی تھی مگر وہ ہمیشہ کی طرح اسے انجان بن کر ہی ملا۔ جوت جلی اور بجھ بھی گئی۔ تھوڑی سی توجہ کے بعد شدید بے توجہی سے قرار ہی لٹ گیا۔

ایک روز جب استانی جی بخار میں پھنک رہی تھیں اور تسلیم برف کی پٹیاں ان کی پیشانی پر رکھ کر ان کے وجود کی آنچ کم ہو رہی تھی کہ وہ بہت پریشان و بے قرار نظر آیا اور اسے اشارے سے باہر بلایا۔ تسلیم ہمکتے دل کو سنبھالتی جب اس کی بات سننے باہر آئی تو وہ بے دھڑک بولا۔

"تسلیم! میرا انجان بنا بھی کسی کام نہیں آیا۔ تم بالکل نہیں بدلیں۔ میں سب سمجھتا ہوں۔ یہ سب ناممکن ہے۔ قطعی ناممکن، براہِ مہربانی تم میرے گھر نہ آیا کرو۔ میں امتحان میں پڑ

جاتا ہوں۔"

تسلیم نے کانپتا دل سنبھالا، اس کی سمت دیکھا اور سوچا۔ "غافل! تجھے اتنی دیر میں سوجھی۔" پھر وہ بولنے کی کوشش کرتی رہی مگر آنسوؤں کا سلسلہ نہ تھما اور لفظ اس کے ہونٹوں پر نہ اتر سکے۔ بالآخر وہ بولا۔

"آخر ہم کر بھی کیا سکتے ہیں؟ یا تو یہ کہ ہم کورٹ میرج کر لیں اور بعد میں اعلان کر دیں پھر کیا کر سکیں گے تمھارے بھائی؟ مگر مجھے لگتا ہے پھر بھی تم ہارو گی، اس لیے کہ وہ جلد ہی تمھیں بیوہ کر دیں گے۔" اسے بھی اس کے بھائیوں ہی سے خطرہ تھا۔

"کورٹ میرج۔" "میرج" سے لجانے والی کورٹ میرج کی بات سن کر چکرا سی گئی۔ "نن۔نہیں۔" اتنا کہہ کر وہ واپس استانی جی کے کمرے میں آ گئی تو ان کے سرہانے کھڑی ہو گئی۔ منزل کس قدر قریب تھی اور کس قدر دور بھی۔ پھر وہ بڑی طرح اُلجھ کر گھر آ گئی تھی۔

انعام اللہ کو گریجویشن کے بعد محکمہ جنگلات میں سروے آفیسر کی جاب مل گئی تھی۔ اب اسے کسی دوسرے شہر جانا تھا۔ استانی جی اس کے بنا نہیں رہ سکتی تھیں۔ ناچار وہ بھی اس کے ہمراہ جا رہی تھیں۔ محلے کی تین نسلوں نے جدائی کے لمحوں کے کرب سمیٹے تسلیم سکتے کے عالم میں خالی الذہن رہ گئی۔ کس قدر بے درد تھا وہ گئی تو اس نے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

ماہی بے آب کی طرح تڑپ کر اس نے وداع کے لمحوں کا سامنا کیا اور چلا گیا۔ وہ محض سوچتی رہ گئی کہ اب وہ کیسے رہے گی؟ کیوں کر جیے گی؟ اسے اپنے بھائیوں کی صورت سے وحشت ہونے لگی۔ عورتیں اکثر اس کی ماں کے پاس بیٹھ کر استانی جی کو یاد کیا کرتیں مگر تسلیم صرف اسے، اگر وہ مہندی رنگے بالوں والی خوبصورت بوڑھی عورت کبھی یاد بھی آئی تو اس کے حوالے سے، سرکتے دنوں نے اچانک اسے تحفے کی صورت اس کی آمد کی اطلاع دے کر کروٹ بدلی۔ پتا چلا، کچھ ضروری سامان لینے آیا ہے جو گھر میں رہ گیا تھا۔ وہ دو دن کے لیے آیا تھا۔ پورا محلہ اسے گھیرے بیٹھا تھا۔ سب اس سے اپنی استانی جی کی بابت پوچھ رہے تھے۔ مگر اس کے بھائی حسب سابق جل بھن کر خاک ہو رہے تھے۔ آخر رات کو اس نے انعام اللہ کا دروازہ بجا دیا۔ وہ اسے دیکھ کر پہلے تو حیران ہوا پھر مسکرا دیا۔

"کسی نے دیکھا تو نہیں؟"

"نہیں۔" وہ تیزی سے اندر آ گئی۔

"مجھے اپنی فکر نہیں ہے، صرف تمہاری ہے۔ تمھارے بھائی۔"

"مت کرو ان کا ذکر جنھوں نے مجھے زندگی کی سب سے بڑی خوشی سے محروم کیا ہے۔"

"ان کی کیا مجال؟ اگر انسان خود ہی نہ چاہے تو!" وہ نہ جانے کیا کیا کہہ گیا۔

وہ اس کے بہت قریب کھڑا تھا۔ کیا پھر دور ہونے کے لیے؟

"استانی جی کیا کہیں گی؟" آخر کار اس نے کہا۔

"انھیں تمام صورت حال کا علم ہے۔"

اگلے روز بلکہ اگلی شب وہ ٹرین کے سلیپر میں بیٹھے۔ آئندہ پیش آنے والے مراحل کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ حیدرآباد اسٹیشن پر وہ تسلیم کو چائے دے کر جو اس نے چھوٹے سے تھرماس میں بھر لی تھی۔ کچھ چیزیں لینے کے لیے نیچے اتر گیا تھا۔ چائے کے آخری گھونٹ نے تسلیم پر غنودگی طاری کر دی تھی۔ نہ جانے کتنی دیر بعد وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ تیز چمکتی دھوپ کھڑکی کے راستے اندر آ رہی تھی۔ گاڑی جانے کن بیابانوں کا سینہ چیرتی گزر رہی تھی۔ دور دور تک ویرانی پھیلی ہوئی تھی اور اس کا دل گویا پسلیاں توڑ کر باہر آیا چاہتا تھا۔ اس کے حواس کام کرنا بھول گئے۔ اسے شدت سے احساس ہوا کہ وہ بالکل تنہا ہے۔

ٹرین کی رفتار کا شور اس کے اعصاب پر ہتھوڑے کی ضربیں بن کر لگ رہا تھا اور ہر ضرب کے ساتھ ایک نیا سوال گونجنے لگتا تھا۔

"وہ کہاں ہے؟"

"وہ کہاں گیا؟"

"کیا میں اتنی دیر سوتی رہی؟"

وہ بہ مشکل اٹھ کر باتھ روم تک گئی۔ وہ خالی تھا۔ اسے چکر آ گیا۔ "انعام اللہ!" اس نے یوں آہستگی سے پکارا، گویا وہ اس کے دل میں ہو، اور جیسے پکار کا جواب دے گا۔

"یہ کیا ہے انعام اللہ!"

معاً اسے اپنا ہینڈ بیگ یاد آیا جس میں خاصی رقم اور سونے کے دو تین زیور تھے۔ اس نے تیزی سے چادر سیٹ سے کھینچ کر ایک طرف کی، ہینڈ بیگ موجود تھا۔ اس نے جلدی سے کھول کر اپنی چیزیں دیکھیں۔ رقم بھی موجود تھی اور زیور بھی۔ ان کے علاوہ خاکی کاغذ کا لفافہ بھی تھا۔ اس نے فوراً کھول کر دیکھا۔ ایک سفید تہہ شدہ خط میں سو سو کے چار نوٹ رکھے تھے۔ وہ جو اس

تمام صورتِ حال سے انتہائی دل برداشت نظر آ رہی تھی، ایک دم مستعدی سی ہو گئی اور خط پڑھنے لگی۔

''تسلیم صاحبہ!''

گاڑی حیدرآباد کے اسٹیشن پر کافی دیر رکتی ہے۔ میں یہاں تمھارے سامنے اتروں گا اور دوسری گاڑی میں بیٹھ جاؤں گا۔ تم نے چائے پی؟ ذائقہ کیسا لگا؟ یقیناً تمھیں آٹھ گھنٹے کے اندر ہوش آ گیا ہوگا۔ تم دوسری گاڑی سے گھر واپس چلی جانا میں بس اتنا چاہتا تھا کہ تمھارے بھائی کی گالی کا جواب، تمھارے ذریعے دوں۔ تین سال قبل تمھارے بھائی نے کالج میں بیسیوں لڑکوں کی موجودگی میں مجھ سے کہا تھا۔

''نہ جانے کس گندی عورت کا انعام ہے جسے استانی جی نے ترس کھا کر پالا ہے۔ اسے تو اپنے باپ کا نام بھی نہیں معلوم۔'' ''میری حقیقت کیا ہے، مجھے معلوم ہے لیکن تمھارے بھائی نے مجھے سر اٹھا کر چلنے سے روکا تھا۔ بات ہے غیرت کی۔ اگر مجھے گالی سننا آتا ہے تو اسے لوٹانا بھی آتا ہے۔''

''تم اذیت ضرور اٹھاؤ گی مگر تمہاری ماں زندہ ہے وہ تمھیں مرنے نہیں دے گی کہ تم اس کی اکلوتی بیٹی ہو۔ میں نے تمھارے بھائیوں سے انتقام نہیں لیا۔ بلکہ ان کو اپنے برابر کرنے کی کوشش کی ہے۔ شاید یہ سب نہ ہو پاتا اگر تمہاری نظر مہربان نہ ہوتی۔ بہت شکریہ تمہارا اور میرا ایک گلی سے ایک رات اکٹھے غائب رہنا یہی میرا تمہارے بھائیوں کو جواب ہے، ہو سکے تو یہ خط بھی اپنے بھائیوں کو دکھا دینا۔ واپسی کے اخراجات کے لیے کچھ رقم رکھ دی ہے۔''

انعام اللہ

محبت کی یہ صورت کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

اسے اپنی زندگی خطرے میں نظر آنے لگی۔ ماں زندہ ہے مگر ''معزول ملکہ'' ہے۔ ''یہ تم نے کیا کیا انعام اللہ؟'' اس نے سوچا۔ اتنی بھگدڑ مچی ہوگی۔ ایک زمانہ اسے ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوگا۔ اس کے بھائی، اس کا قیمہ کرنے کو بے تاب کھڑے ہوں گے۔ صرف اس کا ہی نہیں بلکہ انعام کا بھی۔ یہ سب کیا ہو گیا، یہ تم نے کیا کر ڈالا انعام؟ کیسے مرد ہو تم انتہائی پارسا کہ مجھے کبھی چھوا ہی نہیں اور انتہائی...... رذیل بھی کہ مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔''

اس کی ماں نے اسے بچپن میں ایک کہانی سنائی تھی، جس میں ایک خوفناک اژدھے کا ذکر تھا۔ اس اژدھے کی پھنکاریں اتنی طاقتور تھیں کہ ہزاروں گز کے فاصلے پر کھڑے شخص

کو اپنی جانب کھینچ لیتی تھیں۔ وہ پھنکاریں شاید کسی کینہ پرور کے انتقام کا بھیس ہوں گی جھلسا کر راکھ کر دینے والے منتقم کا بھیس جو اژدھے کے وجود کو کمین گاہ بنائے ہوئے تھا۔

''میری خطا کیا تھی انعام؟ محض آصف کی بہن ہونا میرا سب سے بڑا جرم ٹھہرا۔''

اس نے خود کلامی کی پھر اس کی تمام حسیں جاگ اٹھیں۔ اب وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔'' اتنی شدت سے کہ اس پر ناتوانی طاری ہو گئی تھی۔

جہاں گاڑی خالی ہوگئی۔ وہ بھی اتر گئی۔ اس کا سب کچھ سلامت تھا پھر بھی وہ سرتاپا لٹ چکی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ کراچی جانے والی ایک ٹرین میں بیٹھ گئی۔ اس کی قوت فیصلہ اب بھی مفلوج تھی۔ اس کے ذہن پر بس ایک خیال دستک دیے جا رہا تھا کہ کسی اور کا ذہن کسی نقطے پر ٹھہرا ہو یا نہ ٹھہرا ہو مگر اس کے گھر والے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں معاملے کی تہ تک پہنچ گئے ہوں گے کہ وہ انعام کے ساتھ فرار ہو گئی ہے۔ وہ کیوں کر یقین دلا پائے گی کہ اس کا کچھ۔

جب وہ کراچی کینٹ پر ہینڈ بیگ سنبھال کر اتری تو سہ پہر ہو چکی تھی۔ خیالات کی یلغار اب اس کے ذہن پر حملہ آور تھی۔ وہ کیوں کر اور کس منہ سے اس گھر میں جائے جس کا ایک ایک چراغ چکنا چور کرنے کے بعد وہ تاریکی اوڑھ لپیٹ کر باہر نکلی تھی۔ اس نے چشم تصور سے اپنے گھر کی دہلیز پر اپنے وجود کے ٹکڑے خون میں لت پت بکھرے دیکھے کہ اس کے ذہن کو اپنے غیرت مند بھائیوں کے مزاج کا ادراک تھا۔ پھر اس نے اپنے بھائیوں کے خون آلود ہاتھ ہتھکڑیوں سے بوجھل دیکھے، انھیں قید بامشقت کاٹتے ان کی سفید داڑھیوں کو آنسوؤں سے تر دیکھا۔ اور اسی لمحے اس نے خود اپنی زندگی پر فاتحہ پڑھ لی، سوچ اور سفر دونوں کا رُخ بدل دیا اور اس کچی بستی میں چلی آئی جو بہت ہی پس ماندہ، دور افتادہ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اسے ہر جگہ ڈھونڈا جائے گا حتیٰ کہ بے سہارا عورتوں کے مراکز تک میں بھی۔ تسلیم کو اس نے کراچی کینٹ میں دفن کر دیا۔ اور آج وہ ام کلثوم بنی مولوی صاحب کی منکوحہ تھی۔

مولوی صاحب اس بے سہارا، خوبصورت، خوش اطوار بیوی کے بڑے قدردان تھے، ہمہ وقت اسکی دلجوئی کرتے رہتے خاص طور پر انھیں اس کے ہاتھ کے کھانے بہت پسند تھے۔ وہ اسے بتاتے کہ وہ کہیں بھی کھانا نہیں کھاتے، خواہ کوئی کتنا ہی مجبور کرے کہ وہ اس کے ہاتھ کے پکے کھانے کو بہت بڑی نعمت سمجھتے ہیں۔

انہی دنوں بستی میں ایک سانحہ ہو گیا۔ بنّن حلوائی کی بیٹی رشیدہ کرم دین رکشا ڈرائیور

کے ساتھ بھاگ گئی۔ اس کی ماں مولوی صاحب کے پاس اس کی واپسی کے لیے دعا کرانے آئی۔ ام کلثوم نے اس میں اپنی ماں کی تصویر دیکھی تو دل کانپ کر رہ گیا۔

آخر کار بستی والوں کی بھاگ دوڑ کام آئی، رشیدہ اور کرم دین بازیاب ہو گئے۔ باہمی مشورے سے دونوں کا نکاح پڑھا دیا گیا۔ اور ساتھ ہی رشیدہ سے یہ بھی کہہ دیا کہ آج سے اس کا کوئی میکا نہیں۔

یہ سب باتیں کلثوم کے زخموں پر نمک پاشی کا کام کر گئیں۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی رشیدہ سے ہمدردی کر بیٹھی۔ اپنائیت کے احساس سے اس ”راندۂ درگاہ“ کا دل بڑھاتی۔ اس کے کام آتی جس پر بستی والوں کو بھی اعتراض تھا۔ مگر مولوی صاحب کے احترام کی وجہ سے وہ منہ سے کچھ نہ کہتے۔

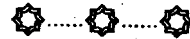
آج جمعرات تھی۔ رشیدہ منت کی کھیر اس غمگسار کے ہاں لائی تھی جو اس نے مولوی صاحب کو کھانے کے ہمراہ پیش کر دی کیونکہ وہ میٹھے کے بہت شوقین تھے، کھانے کے بعد جب وہ کھیر کھانے لگے تو ایک لمحے کے لیے رُک گئے۔

”یہ کھیر کس کے گھر سے آئی ہے کلثوم؟“

”رشیدہ لے کر آئی تھی۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”لاحول ولا قوۃ۔“ انھوں نے پیالہ رکھ دیا۔ ”میں کسی بھگوڑی کے ہاتھ کا پکا کھانا کھانا کفر سمجھتا ہوں۔“

نہ جانے کلثوم کا کلیجہ کیوں کانپا تھا بھائی عقب سے نشانہ باندھے ہوئے تھے، کوئی بات نہیں لیکن مولوی صاحب کے تیر کا رخ اس کے دل کی سمت تھا۔ کھیر کا پیالا اٹھا کر کمرے میں چلی آئی تا کہ مولوی صاحب اس کی پلکوں پر لرزنے والے آنسو نہ دیکھ سکیں۔



اِک حرفِ ملامت بھی نہیں

اس نے برقعہ اتارا۔

پسینے سے بُری طرح بھیگ رہی تھی۔ پسینہ بھی حَب کی پائپ لائن کی طرح جانے کہاں سے پھوٹ پھوٹ کر نکلا تھا؟ لٹیں پیشانی اور رخساروں پر بھیگ کر چپکی ہوئی تھیں۔

جبکہ بڑی پھوپھو کب کی چادر پھینک پھانک پنکھے کے نیچے تعظیم سے سر جھکا کر بیٹھ چکی تھیں، مطلب یہ کہ کمر پر ہوا لے رہی تھیں۔

”اس قدر بلا کی گرمی توبہ۔ کوئی مجھے لاکھوں دیتا تو نہ میں گھر سے نکلتی۔“ ہوا سے ٹھنڈک کا احساس ہوا تو پھر نئے سرے سے بڑی پھوپھو کو راستے کی گرمی یاد آ گئی۔

جبکہ اس گھر میں مقیم تینوں چاروں کنبوں کے بچے (محاورۃً) چند ایک نکال کر سب موجود تھے۔ بہت تعجب سے اس پسینے سے تر بتر لڑکی کو بغور دیکھ رہے تھے۔

آخر حرا آپی نے اس کی جھجک کو محسوس کر کے اس سے بات کرنے میں پہل کی۔

”ادھر پنکھے کے نیچے آ جاؤ پتا۔“

پتا نے نظر اٹھا کر چاروں طرف دیکھا، پھر حرا کا کہا مان لیا اور مزید آگے بڑھ آئی۔

عجیب بے ترتیب منظر تھا، فولڈنگ چیئرز اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں، جن پر گھر بھر کی لڑکیاں اور خواتین براجمان تھیں۔ جن کو جگہ نہیں ملی وہ قالین پر پسر گئی تھیں۔

اس گھر میں اس قسم کے اجتماعات عام سی بات تھے، بالکل کھانے پینے اور چھینکنے کی طرح کے عام معمولات۔

اس لیے جب میں اندر داخل ہوا تو معمول کے انداز میں اپنے کمرے کی طرف بڑھا تھا۔ مگر جاتے جاتے شرارت سے رُکا، کوئی جملہ پھینکے بغیر تو بقول امی میرے حلق سے نوالہ نہیں اترتا۔

”کیا آج پھر ”غیبت اسٹال“ لگا ہوا ہے؟ اور ہاں یہ بتایئے آج سب سے زیادہ کون ”بھرا“ ہوا ہے؟ اب میں فارغ ہوں، وہ چاہے تو میرے سامنے جی ہلکا کر سکتا ہے۔“

"یہ بڑے جنتی بہشتی ہیں۔" ذرا سے چھوٹی ندا بھڑک کر مڑی کیونکہ سب سے زیادہ اِدھر کی اُدھر کرنے میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی اور مجھے اسی کو چھیڑنے میں بہت مزا آتا تھا۔

میں کمرے میں جانے کا ارادہ ملتوی کر کے اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"ایک دفعہ کی بات ہے، چوریاں بہت ہو رہی تھیں، چور پکڑا نہیں جا رہا تھا۔ مالک نے اپنے تمام نوکروں کو بلایا اور تفتیش شروع کی، بڑا ہوشیار آدمی تھا کہنے لگا کہ میں ایک نشانی چور کی پہچانتا ہوں، بلکہ پہچان رہا ہوں، وہ یہ کہ اس کی داڑھی میں تنکا لٹک رہا ہے۔ سب اسی طرح کھڑے رہے، جو چور تھا، اس نے گھبرا کر اپنی داڑھی پہ ہاتھ پھیرا اور یوں چور پکڑا گیا۔ وہی حرکت تم نے اس وقت......"

میں اٹک گیا۔ جانتا تو تھا میں، اس بے وقوف لڑکی کو...... آتی رہتی تھی وہ یہاں...... مگر اس وقت اس کی موجودگی اور میری شوخی کے باوجود، حاضرین اس طرح گم صم حالت میں تھے، گویا مراقبے میں بیٹھے ہوں۔

"اور بھابی جان! دوسری بات یہ کی بچی اللہ نہ کرے یتیم یسیر نہیں ہے۔ میں نے دیور کے ساتھ ہمدردی کی تھی۔ بیٹی اس کی جھولی میں ڈالی تھی۔ میرے منہ میں خاک، فاتحہ نہیں پڑھ لی تھی اس پر۔ اس نے تو مجھے کچھ بتایا نہیں کبھی۔ وہ تو ایک دو باتوں سے میں نے خود ہی اندازہ لگا لیا کہ کس طرح کاٹے ہوں گے میری بچی نے دن۔ جب تک گود خالی رہی، کیا کیا ناز اٹھائے۔ پاسے کے سونے کی پازیب تک پہنائی۔ جب گود میں اپنی بیٹی آ گئی تو یہی آنکھوں کی ٹھنڈک آنکھوں کی جلن بن گئی۔ ہونہہ......"

"جلن بن گئی تھی تو کہہ دیتے اپنی بچی لے آتے ہمیں بھاری ہے؟ ماشاء اللہ کنبہ بھرا پڑا ہے، چولہے ٹھنڈے نہیں ہوتے اس گھر میں۔" چھوٹی چچی نے بھی اضافہ کرنا ضروری خیال کیا۔

"اے ہاں۔ اور کیا کس چیز کی کمی ہے اس گھر میں؟"

"بات یہ ہے زرینہ بیٹی کی اٹھان دیکھ کر ہول رہی ہوں گی کہ اب شادی کے اخراجات بھی اٹھانے پڑ جائیں گے۔ یوں اور جان جلی رہتی ہوگی۔" اب میری امی نے گرہ کھولی اور کہا۔

"یہ تو خیر میں بھی سمجھتی ہوں۔ ان کے باپ کو یقین نہیں آتا، دودھ کے دانت نہیں ٹوٹے ابھی ان کے بھائی بھاوج کے، اتنا معصوم سمجھتے ہیں۔ چاہے ذکر کر کے دیکھ لیجیے گا۔ ہلدی

کی طرح پیلی ہو رہی ہے بچی۔ مگر مجال ہے جو وہ یہ مان لیں۔ بڑا غل مچانے لگیں کہ ہماری بچی ہے بڑی عزیز ہے۔ ہونہہ...... وہ تو میں نے خود دیکھ لیا اسے کونے میں روتے ہوئے۔ میں نے کہا بس جی۔ کہیں اور زیادہ عزیز ہو گئی تو جان ہی نہ چلی جائے بچی کی۔"

بڑی پھپھو اپنے دل کا غبار نکال رہی تھیں۔ سب ہمہ تن گوش تھے گویا آج کا سب سے ضروری کام یہی ہو۔

"میں نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ...... فوراً کہا چلو، فوراً چادر اوڑھو......"

"برقعہ" بڑی پھوپھو...... مجھ سے چھوٹی تانیہ نے تصحیح کی۔

"اے ہاں وہی...... بڑے دیندار بنتے ہیں۔ چار سو بیس لوگ۔ روکتی رہ گئیں۔ میں نے بھی ایک نہیں سنی۔ کہہ دیا بل بنا کر بھیج دینا، جتنا خرچہ کیا ہے۔ یہ جو جوڑا پہن کر جا رہی ہے وہ بھی بھجوا دوں گی۔"

"اور برقعہ بھی......" تانیہ نے پھر ٹکڑا لگایا۔

بڑی پھوپھو نے اسے گھور کر دیکھا۔ وہ سہم کر (بناوٹ سے) امی سے لگ گئی۔ میں مسکراہٹ پر قابو نہ رکھ سکا۔

ایک نظر میں نے پنّا پر ڈالی جو بے حد خاموشی سے اور بے تاثر انداز میں سر جھکائے اپنی ماں کے "اقوالِ زریں" سن رہی تھی۔ بیٹھی تو واقعی وہ اس انداز میں تھی۔

"تم کیوں برقعہ، برقعہ کرنے لگ جاتی ہو بیچ میں...... دیکھ نہیں رہیں بڑی پھوپھو کا کنکشن ٹوٹ جاتا ہے اور وہ بھول جاتی ہیں کہ کیا کہہ رہی تھیں۔"

میں نے تانیہ کو شرارت آمیز سرزنش کی۔

"میاں...... تم کیا بیچ رہے ہو یہاں؟ عورتیں اپنی باتیں کر رہی ہیں۔" چھوٹی چچی تنک کر بولیں۔

"کاش ایسا ہوتا...... عورتیں اپنی باتیں کیا کرتیں۔ یہی تو بے چاری عورتوں کا مسئلہ ہے کہ دوسروں کی باتوں سے فرصت نہیں ملتی۔"

میں یہ کہہ کر جلدی سے کھسک گیا ورنہ شامت ہی آ جاتی۔

چار سو گز کے قطعہ اراضی پر بنایا ٹرپل اسٹوری یعنی سہ منزلہ گھر اپنے اندر رنگا رنگ انسان بسائے محو حیرت کھڑا تھا کہ ہر دیوار کی طرح اس گھر کی دیواروں کے کان بھی تھے اور آنکھیں بھی۔

اس گھر میں چار خاندان آباد تھے، تین بھائی اور ایک بہن۔

سب سے بڑے میرے والد محترم، سلیم احمد۔

پھر بڑی پھوپھو، ان کی دو بیٹیاں بشمول پنّا اور ایک بیٹا تھا۔

ان سے چھوٹے چچا کے چار بیٹے تھے، ان چچا کا نام نعیم احمد تھا اور اسی قافیے پر ان کے چاروں بیٹوں کے نام تھے۔ سب سے بڑا علیم تو میرا ہی ہم عمر تھا تقریباً۔

ان کے بعد ایک اور چچا تھے عظیم احمد، تین بیٹے اور دو بیٹیاں ان کی اولاد تھیں۔

پھر ان سے چھوٹے چچا کلیم احمد، ان کی دو بیٹیاں تھیں، بیٹا کوئی نہیں تھا۔

چھوٹی پھوپھو مستقل ریاست عمان میں مقیم تھیں۔ سالوں بعد ہی آیا کرتی تھیں۔

کیونکہ اس گھر کے مرد کانوں کے کچے نہیں تھے، بردبار، حلیم اور تعلیم یافتہ تھے، اس لیے گھر کا ماحول کبھی قابو سے باہر نہیں ہوسکا۔ پہلے میرے دادا جان سب کو سمیٹے بیٹھے تھے۔ ان کے بعد میرے ابا جان یہ فریضہ انجام دے رہے تھے۔

ہاں تو میں دراصل آپ سے پنّا کے بارے میں بات کر رہا تھا۔

یہ تو آپ جان ہی چکے ہیں کہ موصوفہ میری فرسٹ کزن یعنی زرینہ پھوپھو کی بڑی صاحبزادی ہوتی ہیں۔

اس گھر کا ہر بچہ میرے عتاب وشفقت اور شرارت سے نمٹے بغیر بڑا نہیں ہوا، لیکن یہ وہ واحد لڑکی ہے جس سے میرا نہ شرارت کا رشتہ رہا نہ سنجیدگی کا۔

اور رہتا بھی کیونکر۔ اس کے دیندار چچا نے غالباً محرم و نامحرم کی تلقین اسے گھول کر پلائی تھی۔ صرف مجھ سے ہی نہیں، وہ ہر ایک مذکر سے پرہیز کرتی تھی۔ از خود بات کرنا تو دور کی بات، انتہائی ضروری بات کا جواب بھی وہ ہاں اور نہ میں دینا بہت خیال کرتی تھی۔ کبھی کبھار رہنے آتی تھی تو اندازہ ہوگیا تھا اس کی طبیعت کا۔

اب یہ جان کر کہ موصوفہ مستقل آ گئی ہیں۔ مجھے اس خبر سے نہ خوشی ہوئی نہ غم ظاہر ہے، وہ اپنے والدین کے پاس آئی تھی کہیں اور تو نہیں۔ میرے لیے یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔

ان کے چچا کے ہاں گیارہ سال تک کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ سونے آنگن میں رونق کی غرض سے انھیں اپنایا گیا تھا۔ مجھے خاص یاد نہیں، سنا ہے بڑے نازوں سے پالا جا رہا تھا کہ خدا نے چچا موصوف کو اپنی ''ذاتی'' اولاد سے نواز دیا۔

بڑی پھوپھو کئی برس تک یہی کہتی رہیں کہ ان کی دیورانی دونوں بچیوں میں کوئی فرق

نہیں کرتیں۔

پھر پتا نہیں کیا ہوا۔ خبریں آنے لگیں کہ چچی ہی نہیں چچا بھی بدلے بدلے نظر آتے ہیں۔

ماں ہونے کے ناتے بڑی پھوپھو کے یقیناً کان کھڑے ہوئے اور انھوں نے اپنے نمایاں اوصاف میں وصفِ سراغ رسانی کا بھی اضافہ کیا اور اپنی انٹیلی جینس سروس کی داغ بیل ڈالی۔ انٹیلی جینس کی سرکردہ رہنما یعنی بڑی پھوپھو کے علاوہ اس تنظیم کے کارکنان اور کون کون تھے اس سے میں لاعلم ہی رہا کیونکہ مصروف انسان ہوں، دوئم پنّا سے مجھے کوئی قلبی تعلق اور وابستگی بھی محسوس نہیں ہوتی تھی، کیونکہ وہ منظر سے غائب ہی رہی تھی۔ مگر میری مصروفیات میں اس گھر کا کچھ حصہ تھا ہی اس لیے اُڑتے پڑتے کوئی نہ کوئی بات کان سن ہی لیتے تھے۔ اس لیے پنّا کے چچا چچی کے بدلتے موسم جیسے رویے کی بھنک مجھے بھی مل گئی تھی، اس سے قبل کہ میں اس موضوع پر اظہارِ خیال کر کے خاندان سے ہم آہنگ ہونے کا ثبوت دیتا۔ پنّا گھر میں نظر آ گئی۔

میں خاصا ''تہلکہ خیز'' قسم کا انسان واقع ہوا ہوں (ویسے یہ گھر والوں کی رائے ہے) سب کا خیال ہے کہ میری ''ہڈی'' کو چین نہیں۔ ویسے پتا نہیں میں اس قدر مصروف کیوں رہتا ہوں۔ کسی نہ کسی کام کی دُھن مجھ پر ہر دم سوار رہتی ہے۔ جب کوئی کام نہیں ہوتا تو اپنے کزنز، بشمول مونث، مذکر کی، چھیڑ چھاڑ میں مصروف ہو جاتا ہوں، حتیٰ کہ بروقت اگر کزنز دستیاب نہ ہوں یا بہن بھائی مجھ سے بھی زیادہ مصروف ہوں تو میں اس سہ بالا عمارت کے بزرگوں کو اپنا ٹارگٹ بنالیتا ہوں، یہ ان کی شفقت ہے کہ وہ مجھے برداشت کرتے ہیں۔

ایک اور خوبی ہے مجھ میں، جو ننانوے فیصد متعلقین نہیں جانتے وہ ہے، میری رومانوی طبیعت۔ میرا اپنا ذاتی خیال ہے کیونکہ میں خاصا خوش شکل واقع ہوا ہوں، اور اس رعایت کا فائدہ بھی اٹھالیتا ہوں کہ مجھے ہر موڑ پر نسوانی توجہ ضرور ملتی ہے۔

''تو پھر کیا مضائقہ ہے؟''

خاندان میں تو خیر کوئی بھی مجھے اس انداز میں نہ مل سکا، کہ اس پر میری یہ اضافی خصوصیت آشکارا ہوتی، ایک مرتبہ اپنی خالہ زاد کو دیکھ کر میرا دل بے اختیار ہو چلا تھا۔ وہ تھی بھی بڑی دلکش وطرح دار، یقین کریں، میں اس کے لیے ازحد سنجیدہ ہو گیا تھا۔

لیکن یہ سوچ کر جرأت نہ ہوتی تھی کہ وہ ٹھکرا نہ دے، اور میں جو سب کا مذاق بنایا کرتا ہوں، ہمیشہ کے لیے مذاق کا نشانہ بن جاؤں اور میرے ہاتھوں کے ستائے ہوئے لوگ

گن گن کر بدلے لینا شروع کر دیں۔ آخر غیرت مند مرد ہوں، اس سے بڑا تازیانہ میرے لیے کیا ہوسکتا تھا؟

بہرکیف میرے ذہن میں تجویز آئی کہ کیوں نہ تنہائی میں ''خالہ زاد'' کے خیالات معلوم کرلیے جائیں۔

ایک مرتبہ گھر میں چھوٹے پیمانے پر کوئی گھریلو سی تقریب تھی، میں نے اپنی خالہ زاد کو بڑے سرسری سے انداز میں کہا کہ میں اسے ایک بات بتانا چاہتا ہوں، دورانِ تقریب وہ دادا جان کے کمرے میں دو منٹ کو میری بات سن لے۔ اس نے مسکرا کر بات سننے پر آمادگی ظاہر کردی۔

میں بڑے اہتمام و تیاری کے ساتھ خود پر قابو پاتا ہوا مقررہ وقت پر دادا جان کے کمرے میں داخل ہوا۔ جیسے ہی میں نے اندر قدم رکھا، دروازے کے پیچھے سے کئی ''ہاؤ'' ابھرے، ایسی طبیعت مکدر ہوئی اس ''تحریک نسواں'' کے بعد کہ خدا جانتا ہے۔ خاندان کی ایک ایک لڑکی کا نام لے کر لعنت بھیجی۔

وہ سب مجھے گھیرے میں لے کر گانے لگی تھیں۔

لال میری پت رکھیو بھلا جھولے لالن

سب سے آگے میری اسی خالہ زاد نے ''دھمال'' ڈالی تھی۔

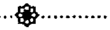
اس دن کے بعد مجھے محسوس ہوا گویا میری رومانی جس کا لاشہ دہلیز پر پڑا ہو، اور وہ سب اس پر دھمال ڈال رہی ہوں۔

اور میں زاہد خشک ہو چلا ہوں، اس دن کے بعد میں نے کانوں کو ہاتھ لگالیا، اگر مجھے کروڑوں کی پیشکش کے ساتھ بھی کسی کزن کا رشتہ دیا گیا تو میں قسم کھا کر بہن بنالوں گا۔

میری مردانہ غیرت پر یہ ضرب کاری تھی۔

اب وہ خالہ زاد شادی شدہ ہے باقاعدہ، گود میں معصوم بچہ بھی ہے۔ جب بھی وہ گھر آتی ہے، میں اس کے سامنے اس کے بچے سے کم از کم تین بار ''ماموں'' ضرور کہلواتا ہوں۔

شاید اس دن کی خفت میرے لیے ہمیشہ کا عذاب بن گئی ہے۔



یونیورسٹی کے عہد میں تو ایک دو قابل ذکر رومان مجھ سے سرزد ہوئے۔ یہ میری طرف سے شروع نہیں ہوئے بلکہ بطور ''جوابی حملے'' کے سرزد ہوئے۔ اب آپ جانیں مکمل نسانیت اور حسن بے پناہ سامنے ہو تو کوئی کافر دامن بچا سکتا ہے اور پھر اس کے لیے تو اور بھی مشکل جو

''رومان'' چھینکتا ہو اور رومان ہی کھانستا ہو۔

مگر ہوا یوں کہ وہ بھی شوہروں کو پیاری ہوگئیں۔ کوئی عشق تو تھا نہیں کہ جان کا روگ بن جاتا۔

اب سچ کہوں گا تو آپ میں سے بہت سی خواتین برا مان جائیں گی۔ مگر یہ حقیقت ہے۔ میرا ہر رومانس جوابی تھا، میں تو ''ان'' سے دوستانہ اسٹائل میں ملتا تھا۔ وہ ہی جب نظر التفات سے مجھے شکار کرنے کے درپے ہوتیں تو میں کیسے نظر بچا سکتا تھا؟

لیکن یہ حقیقت تھی اس دن کے بعد میں نے کسی کزن کو لفٹ نہیں کرائی۔ جب ایک فرم میں ایک اعلیٰ عہدے دار کی حیثیت سے میرا تقرر ہوا تو خاندان میں میری حیثیت ہزار گنا نمایاں ہوگئی اور میں بدلتے انداز پہچاننے لگا۔ مگر میں نے فوراً ہی اعلان کر دیا تھا کہ میں ہرگز ہرگز خاندان میں شادی نہیں کروں گا۔ اگر مجھ پر زور ڈالا گیا یا زبردستی کی گئی تو میں کسی غریب اور ایک درجن بچوں کی حامل ''بیوہ'' سے نکاح پڑھوا کر ثوابِ دارین حاصل کروں گا۔

امی تو اس دھمکی سے ایسی خوفزدہ ہوئیں کہ سال بھر تک کسی بیوہ کا با آوازِ بلند تذکرہ کیا نہ کسی کے بیوہ ہونے کی خبر مجھ تک پہنچنے دی۔ انھیں یہ یاد نہیں رہا کہ ''بیوہ'' سے نکاح کرنے کی دھمکی میں نے کس وجہ سے دی تھی، انھیں وجہ یاد نہیں تھی۔ بس ''بیوہ'' یاد تھی۔

اس سہ بالا منزل کے اکثر بچے بڑے ہو چکے تھے، آئے دن ان کی شادی بیاہ کے ہنگامے بپا رہتے تھے۔

آج کل مجھ سے چھوٹی تانیہ کی شادی کا غلغلہ شروع ہو چکا تھا۔ بڑے بھائی کی حیثیت سے مجھ پر ذمہ داریاں آ پڑی تھیں۔ آفس سے واپسی پر میری مصروفیت کے نئے انداز شروع ہو جاتے۔

ہمارے ہاں یہ خصوصیت بھی ہے کہ ہر قسم کا فنکشن اللہ تعالیٰ کے ذکر سے شروع ہوتا ہے، یعنی قرآن خوانی اور میلاد کا سلسلہ لازمی ہوتا ہے۔ تانیہ کی رسم مایوں سے پہلے قرآن خوانی ہو رہی تھی۔ گھر میں کھچا کھچ مہمان بھرے ہوئے تھے۔ ایک ہاؤ ہکار مچ رہی تھی۔ دور دراز سے آنے والے مہمانوں کے سامان سے شریک محفل ٹھوکریں کھاتے پھر رہے تھے۔

قرآن خوانی کے سلسلہ میں تیار مٹھائی مین گیٹ تک پہنچ چکی تھی، اب وہاں سے ڈھویا ڈھوئی کا سلسلہ تھا۔ میں بالوشاہی کے تین بڑے بڑے ''پیک'' اوپر تلے رکھ کر اندر چلا، مگر راہداری میں اوئی کی آواز کے ساتھ میں گرتے گرتے بچا۔ بمشکل ایک ''پیک'' سنبھال پایا، دو

لڑھک گئے۔ بھنا کر ٹکرانے والے کی سمت نظر کی، وہ پنا تھی۔ باہر بکرا ذبح ہوا تھا وہ تھال میں غالباً اس کا گوشت اٹھائے جا رہی تھی، یوں سمجھیے وہ شمال کی سمت جا رہی تھی اور میں مغرب کی سمت۔

اب دیکھنے والا سین تھا، گوشت کی بوٹیوں نے اس کا چہرہ اور کپڑے خون آلود کر دیے تھے، وہ زمین پر گری ہوئی تھی، پھر اس پر بالوشاہی کے دو ڈبے الٹے ہوئے تھے، وہ کیونکہ بندھے ہوئے تھے، اس لیے کھل کر بکھرنے سے مٹھائی بچ گئی تھی۔

وہ عجیب خفت آمیز تاثرات کے ساتھ خود کو سنبھال رہی تھی، ایک ہجوم بیکراں ہم دونوں کو گھیر چکا تھا۔

پنا کی حالت غیر تھی۔

"گھبراؤ نہیں پنا۔ فیضان بھائی تمہارا صدقہ اتار رہے ہیں۔" یہ میری "وہی" خالہ زاد تھی۔ ایک مشترکہ فرمائشی قہقہہ پڑا۔

میں نے ڈبے سمیٹتے ہوئے پنا کو غیر ارادی طور پر دیکھا تھا۔ اس کی شکل تازہ تازہ خون کی وجہ سے عجیب مضحکہ خیز نظر آنے لگی تھی، کھڑے ہوئے لوگ ہنس ہنس کر دوہرے ہو رہے تھے۔

"تیری پیاری پیاری صورت کو کسی کی نظر نہ لگے۔" ندا کی شوخ آواز آئی۔

"چشم بدور" باقی لڑکیوں نے کورس میں کہا۔

پنا مارے شرمندگی کے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

میں نے اپنی نرم دلی کے ہاتھوں یہ بے ساختہ حرکت کی کہ اس کے شانے پر بے اختیار ہاتھ رکھ دیا۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹ گئی۔

"اتنی زور سے کرنٹ مارتے ہیں، آپ فیضان بھائی!" حرا نے شوخی سے تعجب کیا۔

"ہم ابھی آپ کو جنریٹر پر رکھ دیتے ہیں۔ صبح سے لائٹ گئی ہوئی ہے۔" ایک اور کزن بولی۔

میں خاموشی سے بوٹیاں چن کر تھال میں ڈالنے لگا تھا۔ میں کبھی کبھار ہی اپنی کزنز کے پھندوں میں پھنستا تھا مگر جب بھی پھنستا تھا، برا پھنستا تھا۔

پھر دو چار کزنز ندا، حرا سمیت گوشت کی بوٹیاں سمیٹنے میں میرے ساتھ شامل ہو گئی تھیں۔ اور پنا کو نہا دھو کر صاف ستھرا ہونے کی تلقین کے ساتھ منظر سے ہٹا دیا گیا تھا۔

............❀............

بعض انسانی کمزوریاں ایسی برہنہ حقیقتیں ہوتی ہیں کہ انسان ان سے صرف نظر نہیں کر سکتا۔ جیسی میری اپنی طبیعت کی کمزوری...... رومان پسندی، ظاہر ہے انسان اپنی توہین آپ کرنے کی ہمت و جرأت نہیں رکھتا۔ میں اسے رومان پسندی کہہ رہا ہوں۔ آپ مجھے دل پھینک کہہ سکتے ہیں۔ اتنی تو رعایت انسان اپنے ساتھ کرتا ہی ہے کہ زہریلی حقیقت سے نظر بچا سکتا ہے۔ الفاظ بدل کر خود کو فریب دے سکتا ہے۔

بعض اوقات ڈھونڈنے سے من چاہا وقت میسر نہیں آتا اور بعض اوقات سان و گمان سے بھی پرے سے خوش کن لمحے نگارشِ زندگی بن جاتے ہیں۔

اب یہی دیکھ لیں کہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ بودی اور بونگی سی لڑکی بھی مجھے متوجہ کرے گی، ویسے بھی آج کل میں "خزاں" کے دور سے گزر رہا تھا۔ زندگی میں کوئی ہلچل ہی نہیں تھی۔ میں رومان پسند سہی مگر "باذوق رومان پسند" ہوں۔

خدا معلوم، وہ کیسے میرے ذوق پر پوری اتر گئی تھی؟

اپنے اور علیم کے مشترکہ دوستوں کی تواضع و مدارت کے لیے کہنے، میں مہندی والی رات کچن میں آیا۔ ذہن میں یہی تھا کہ بے چاری ملازمہ برتنوں کے ڈھیر کے سامنے کھڑی ہر پیالے، ہر پلیٹ میں اپنی تقدیر کا زائچہ استخراج کر رہی ہوگی، یعنی خوشیوں کے ہجوم میں گھرے اس گھر کی تھکی ماندی ملازمہ یقیناً اپنی خوشیوں سے محروم اور چاکری سے پُر زندگی کے بارے میں سوچ رہی ہوگی۔

عموماً خوشیوں کے یہ لمحے گھریلو ملازمین کے لیے کسی امتحان سے کم نہیں ہوتے، ویسے میں اس سلسلے میں خاصا حساس واقع ہوا ہوں۔

تمام لوگ مہندی لے کر گئے ہوئے تھے، گھر میں تانیہ، امی اور بڑی پھوپھو موجود تھیں۔ یا پھر لڑکوں میں، میں اور علیم۔ اس قدر کے آدم زادے گھر سے باہر تھے لامحالہ غیر معمولی خاموشی صاف محسوس ہونا تھی۔

سوچا تو یہی تھا، اگر ملازمہ کام کر رہی ہوگی تو چائے کے لیے امی یا پھوپھو کو کہوں گا کچن میں درّانہ اندر داخل ہوا تھا۔

وہ بڑے سے پتیلے میں موجود دودھ جو رینج کے ایک کونے میں دھرا تھا۔ بغور دیکھ رہی تھی۔ کپڑا ہاتھ میں تھا۔ گویا دودھ کو جوش دیا جا رہا تھا۔

"بھلا، اس قدر غور سے دودھ کو دیکھنا اور اتنا الرٹ ہو کر خود کو ٹینشن میں رکھنا، کہاں

کی عقلمندی ہے؟ جوش آنے لگے تو برنر کو بند کر دینا بھی۔"

وہ واقعی بہت انہماک کے عالم میں دودھ میں ڈوبی ہوئی تھی، میری آواز پر بڑی طرح چونکی، پھر خفیف سی ہو کر رہ گئی۔ اور برنر کی لو بڑھاتے ہوئے بولی۔

"تازہ دودھ کو کئی جوش دینا ہوتے ہیں، ورنہ عجیب سی بو آتی رہتی ہے، اب کیا بار بار چولہا جلاتی رہوں۔"

"یہ کون سا دودھ ہے جو رات دس بجے تک تازہ ہے؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"آیا تو شام کو تھا۔ فرج میں رکھا تھا کیونکہ کوئی بڑا برتن "فارغ" نہیں تھا۔"

وہ مجھے بہت تفصیل اور تحمل سے جواب دے رہی تھی۔ بڑے سادہ انداز میں۔ اب کیونکہ وہ مستقل آ گئی تھی، اس لیے شاید اس نے میری گھریلو پوزیشن محسوس کر کے کترانے اور کنی کاٹ کر نہ گزرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یا پھر وہاں کی تربیت وہیں چھوڑ آئی تھی میں نے بغور اس کی سمت دیکھا۔

وہ زرد اور سرخ پھولوں والے کرتے سرخ شلوار دوپٹے میں بڑے گھریلو اور سادہ قسم کے تاثرات چہرے پر سجائے ہنوز مصروف تھی۔ مگر اب شاید وہ پریشان سی ہو گئی تھی، میری موجودگی سے۔ اور پھر اب تو میں اسے دیکھ بھی رہا تھا۔

وہ بہت دلکش لڑکی تھی، اس کے میک اپ سے عاری چہرے میں اس بلا کی جاذبیت تھی کہ مجھے سخت حیرانی ہوئی کہ مجھے آج تک اس کی دلکشی کا احساس کیوں نہ ہو سکا۔ اس کے چہرے کی جلد میں عجیب نمی سی محسوس ہو رہی تھی۔ تمام داغ دھبوں، لکیروں سے پاک اُجلا اُجلا چہرہ اور خوبصورت گھنیری پلکیں۔

دلکشی تو صحیح معنوں میں یہ ہے۔ سادہ سی زلفیں اور دُھلا ہوا چہرہ اور کشش کا یہ عالم...... ہر لحظے ہر لمحے میں موجود اور غازے سرخی سے پاک دلکشی۔ میں سچ مچ متاثر اور اپنی اب تک کی بے خبری پر متاسف تھا۔

وگرنہ اب تک میں نے جن لڑکیوں کو دیکھا تھا وہ تو گھر میں بھی ایسی ہوتی تھیں۔ گویا کہیں پارٹی میں جانے کے لیے تیار ہوں۔

اس دن صحیح معنوں میں مجھے دلکشی کا ادراک ہوا۔

وہ میری نظروں سے اس قدر ڈسٹرب ہو گئی تھی کہ کام سے بے خبر ہو گئی تھی۔ نتیجتاً دودھ اُبل کر تمام اطراف اُمڈ اُمڈ کر بہنے لگا۔ برنر دودھ گرنے سے خود بخود بند ہو گیا۔ اس نے

بے ساختہ دودھ کا برتن اٹھانا چاہا تو پکتا ہوا دودھ اس کے ہاتھوں پر آ گرا۔ احساسِ ندامت تھا، میری موجودگی کی گھبراہٹ یا ہاتھ جلنے کی تکلیف اس کی کٹورا سی آنکھیں بھر آئیں۔

میں نے بے ساختہ اس کے ہاتھ تھام لیے تھے، جب وہ تکلیف سے بلبلا کر پیچھے ہٹی تھی اور اس کے ہاتھ سے کپڑا لے کر آہستگی سے اس کے ہاتھ صاف کیے۔

پھر اپنے کمرے سے برنال نکال کر اس کے پاس واپس کچن میں پہنچا تو وہ غائب تھی۔ وہاں سے پلٹا۔ اس کے کمرے میں چلا آیا نہ جانے کیا مل رہی تھی اپنے ہاتھوں پر، آہستہ آہستہ موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے سلسلہ وار بہہ رہے تھے۔

میری حیرانی سوا ہو گئی۔ یقیناً جلنے کی تکلیف خاصی ہوتی ہے۔ لیکن اتنی بڑی اور سمجھ دار نظر آنے والی لڑکی با قاعدہ روئے۔ یعنی رتی برابر قوتِ برداشت نہیں اس لڑکی میں۔ گویا بہت ہی ناپختہ ذہن کی مالک ہے۔

"کیا بہت تکلیف ہو رہی ہے؟" میں دروازے میں جمے رہنے کا ارادہ ترک کر کے اندر چلا آیا۔ وہ چونک پڑی اور جی بھر کے شرمندہ نظر آئی۔

"اور یہ تم نے کیا لگا لیا ہے؟ برنال لگاتیں تو تھوڑی دیر میں جلن ختم ہو جاتی۔" نہ جانے کیا لال پیلا سا مرہم لگا بیٹھی تھی۔

آپ یقین کریں، میں نے کسی غلط جذبے کے تحت نہیں بلکہ صرف اور صرف اس کی تکلیف کا اندازہ کرنے کے لیے اس کے ہاتھ تھام کر دیکھنا شروع کیے تھے۔

اس کے دل کی دھڑکنوں کی بے ترتیبی، میں اس کے لرزتے ہاتھوں سے محسوس کر سکتا تھا۔

میرے ہاتھوں کی گرفت اتنی مضبوط اور قطعی تھی کہ وہ مجھے نہایت درجے کی بے بس حالت میں نظر آئی۔

"اوہ!" اب میں اس کی غیر حالت کو سمجھا، اتنی پردے دار لڑکی میرے سامنے بغیر دوپٹے کے تھی......

مجھے اپنے طور پر سخت کوفت و ندامت کا احساس ہوا، اور نہ جانے کیا عجیب سا محسوس ہوا بس پھر میں ٹیوب وہیں رکھ کے واپس آنے لگا۔

یقین کریں پھر وہ گاؤدی اور سادہ سی لڑکی مجھے نہیں بھولی۔ تقریب کے ہنگامے اپنی جگہ اور میری طبیعت کی سرشاری اپنی جگہ۔

بس اس پر ایک سرسری سی نگاہ ڈال کر مطمئن اور سرشار ہو جاتا تھا۔

بے باک، نڈر، شوخ، برجستہ گو لڑکیوں کے بیچ وہ نظریں چراتی ہوئی، سٹپٹائی، گھبرائی سی، بہت منفرد محسوس ہو رہی تھی۔

میری نظریں اس کو خاموش پیام پہنچا چکی تھیں، میں اپنی بے ساختہ حرکتوں سے اس پر اپنے دل کی کیفیت عیاں کر چکا تھا۔ اس لیے اس کی زیادہ سے زیادہ کوشش ہوتی تھی وہ میرے سامنے نہ آئے۔

تانیہ کے ولیمے والے دن تمام افراد ہی تقریباً گاڑیوں میں لد چکے تھے۔ وہ کیونکہ ایک ذمہ دار قسم کی لڑکی تھی، اس لیے گھر کے حفاظتی اقدامات اور نوکروں کو ہدایت دینے کے لیے میری امی سے بھی زیادہ مصروف تھی۔

میں نے اس دن پرانی فلموں کے ہیرو والا ایک کام یہ کیا کہ لان سے سرخ گلاب کی ایک اَدھ کھلی کلی توڑی اور اس کے پاس آ گیا۔ وہ نوکر سے بات کرنے میں مگن تھی۔

”یار! میرے کمرے سے میرا سگریٹ لائٹر تو لے کر آؤ۔“ میں نے اسے ٹالا۔ نوکر کے باہر نکلتے ہی وہ بھی تیزی سے باہر جانے لگی۔

”بات سنو پنا......!“ وہ رُک گئی میری آواز پر، مگر پلٹی نہیں۔

میں نے اس کے بالوں میں کلی اٹکا دی۔ میرے خیال میں اس کی خاموشی اور کترانے کی ادا میں تمام جنوں کا حاصل بھی اور جواب بھی تھا۔

میری اس حرکت سے اس کی حالت غیر ہو گئی۔ مجھے ترس سا آ گیا۔

”جو دوسروں کی زندگی سے سکون چھین لیں، وہ دوست نہیں، دشمن ہوتے ہیں۔ میں تم پر قطعی رحم نہیں کر سکتا۔

باہر تمام گاڑیاں بھر چکی ہیں مگر میں نے اپنی گاڑی کی اگلی سیٹ تمہارے لیے خالی رکھی ہے۔ تانیہ کی سسرال بہت دور ہے، میں یہ طویل راستہ تمہاری موجودگی میں...... خوشگوار انداز میں کاٹنا چاہتا ہوں۔ سمجھیں۔“

”نہیں......“ وہ جیسے بے ہوش ہونے کے قریب ہو گئی۔

”کیا نہیں......؟“ میں اس کے قریب آ گیا۔ ”بھئی یہ تو سراسر چور کی داڑھی میں تنکے والی بات ہو گی۔ برائی کیا ہے؟ بھئی ہمارے گھرانے میں تو یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ تم میری فرسٹ کزن ہو، میری ساتھ اسی گھر میں رہتی ہو......“

”مگر آپ سے ڈر لگتا ہے۔“

”کیوں......؟“ میں بے ساختہ مسکرا دیا۔

”کیا معلوم......“ وہ کہہ نہ سکی، یکدم چپ ہو گئی۔

”کیا معلوم آج اعلان کر دوں کہ میں بھی مجنوں کے شاگردوں میں شامل ہو چکا ہوں۔ بلکہ میرا خیال تو یہ ہے میں استاد مجنوں کو بھی کراس کر جاؤں گا...... اگر تمہاری یہی ادائیں رہیں۔“

وہ تقریباً بھاگ کھڑی ہوئی۔

کئی قہقہے میرے اندر گھٹ کر رہ گئے۔ ملازم آتا دکھائی دیا تھا، اس کے ہاتھ میں کوئی سگریٹ لائٹر نہیں تھا۔ اور ہو بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ تو میری جیب میں تھا۔

تانیہ کی شادی کے ایک ہفتے بعد ہی مجھے چھ ماہ کے لیے جاپان جانا پڑا، ایک کورس کے سلسلے میں۔ بس میرا جاپان آنا ہی غضب ہو گیا۔ جیسے گھر والوں پر میری شادی کا بھوت سوار ہو گیا۔

کبھی تانیہ تصویر بھجوا کر رائے پوچھ رہی ہے، اور کبھی امی۔

میں نے کیونکہ فی الحال شادی وادی کے بارے میں کوئی پلان نہیں بنایا تھا، اس لیے میں نے اس سلسلے میں کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔

مگر ایک دن میں چونک پڑا۔ تانیہ نے اپنے شوہر کی ایک قریبی کزن کی تصویر بھجوا کر اور خط میں قصیدے کا رنگ بھر کر مجھے چونکایا۔ دراصل وہ تعلیم کے لحاظ سے بڑی غیر معمولی قسم کی شے تھی۔ والدین مالٹا کے جزیرے میں جانے کیا مہم سر کر رہے تھے، لڑکی اپنے بڑے اور شادی شدہ بھائی کے پاس مقیم تھی۔

اس کی تصویر پر ایک نظر ڈال کر میں مبہوت ہو کر رہ گیا...... اتنی دلکش اور حسین جیسے تصویر...... اور کتنی خوش کن بات کہ یہ غیر معمولی سی چیز مجھے وابستگی کا اعزاز دے سکتی ہے۔ تانیہ نے یہی کہا تھا۔ اگر میں ہامی بھر لوں، تو کوئی مسئلہ ہی نہیں، واقعی انسان اگر عمدہ اور بھرپور انداز میں زندگی گزارے تو زندگی کا مزہ ہے۔ جب اس سے وابستہ ہر شے دلکش اور عظیم الشان ہو۔

اس تصویر کے پیچھے مجھے پنا انتہائی پسماندہ اور صبر آزما چیز نظر آئی۔ میں اس ماحول کے اثر سے آزاد ہو چکا تھا۔

تانیہ کو رضامندی کا خط بھجوایا...... اس وقت تو مجھ پر نئی دُھن سوار ہو چکی تھی۔ چھ ماہ

کے بجائے مجھے جاپان میں تقریباً دس ماہ لگ گئے۔

واپس پاکستان پہنچا تو سب شدت سے میرے منتظر تھے۔ میرے پہنچنے کی دیر تھی، میری شادی کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہو گیا۔

ایک ماہ کے اندر اندر شمع میری ہو گئی۔ اپنے تمام تر اُجالوں سمیت۔ وہ واقعی ایک نشہ، ایک راز، ایک ''وقت'' تھی۔ وقت محیط ہوتا ہے اور میں اس محیط میں بند ہو چکا تھا۔

مجھے مہینوں خیال نہ آیا کہ پنا کے بارے میں سوچ سکوں۔

شمع کی ہنسی، شمع کی مسکراہٹ، میرے ذہن کو منجمد کر کے رکھتی تھی۔

جیسے وہ تنویمی عمل کی عامل ہو اور میں اس کا معمول۔ دراصل اس کی شائستگی نے اس کی تمکنت تک کو حسن دے دیا تھا، میرا اس قدر خیال رکھتی اتنا مجھے چاہتی۔

کہ میں اپنے زمان اور مکان۔

اپنے وقت۔

اپنے پہر کے ہمراہ کسی اور دنیا کی حدود میں داخل ہو گیا۔ جہاں میں تھا اور شمع تھی۔

پھر ایسا ہوا کہ میں اتنا بے حس ہو گیا کہ دراّنہ اس کے سامنے ہوتا اور نظر انداز کر دیتا۔

میں نے کبھی اس کا چہرہ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

نہ اس کی آنکھوں کی طرف دیکھا، اوّل تو میرا اس سے سامنا ہی نہیں ہوتا تھا۔ اگر ہوتا بھی تو یوں کہ شمع کو اپنی خدمت گزار، قسم کی سسرالی، بہت بھائی تھی اکثر وہ اسی سے مخاطب ہوتی تھی۔

''پنا ڈیر، ذرا میرا بلاؤز استری کر دو......''

''پنا جی، میرے بالوں میں رول لگا دو پلیز......''

ایسے میں جب وہ ہمارے بیڈ روم میں داخل ہوتی تو میں بڑی تندہی سے مطالعے میں مگن ہو جاتا......اور مطالعے کا مرکز چہرے کے بالکل سامنے کر لیتا۔ شمع اس سے اپنا کام بھی کراتی جاتی، اور خود ہی باتیں بھی کرتی جاتی......

کسی پارٹی میں جانے کے لیے تیار ہوتی تو وہ اس سے مدد لیتی، پھر پور پور سے سج کر، تیار ہو کر وہ پنا کے مقابل کھڑی ہو کر پوچھتی:

''ٹھیک ہے؟ کیسی لگ رہی ہوں......؟'' شمع تفاخر سے پوچھتی۔

مجھے نہیں معلوم۔ اس وقت پنا کے چہرے کے تاثرات کیا ہوتے تھے؟ کیونکہ میں

اپنے اندر اتنی اخلاقی جرأت نہیں پاتا تھا کہ ''چہرے'' پر نمک چھڑکنے کا منظر دیکھوں۔

آدمی مطمئن اور شکم سیر رہتا ہو تو بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنی روح میں بھی جھانکے۔ اور احتساب کے عمل سے گزرے۔

لیکن جب وہ کسی اندوہناک واقعے سے یوں گزرتا ہے جیسے کانچ پر چل رہا ہو تو وہ اپنے کانپتے وجود کو سنبھال کر اپنے ضمیر کی سمت متوجہ ہوتا ہے۔ اور ضمیر ہی انسان کا اصل ہے۔

مجھے قدرت نے اس طرح احتساب کے عمل سے گزارا۔ جب شمع ننھی نور العین کو میرے بازوؤں میں دے کر مجھے تنہا کر گئی تو میری حالت پاگلوں سے بدتر ہو گئی۔

ایسا پتھر ہوا کہ آنکھوں کے سوتے گویا خشک ہو گئے۔

اس بچی کو کیا ملا؟ اوائلی لیسیری۔ مامتا سے محرومی۔

اور مجھے، محض سراب سی خوشی......خواب جیسا سکھ۔

آہستہ آہستہ اس گھر کی تقریباً سب ہی لڑکیاں رخصت ہو چکی تھیں۔ میری ''کزن مارکہ'' قسم کی بھابیوں کی خاصی بھیڑ ہو چلی تھی۔

امی معصوم عینی کو سنبھال رہی تھیں۔ بڑی پھوپھو الگ میری دلجوئی میں مصروف نظر آتیں۔

اور ''وہ'' جب میری ماں کو نڈھال دیکھتی تو بڑے پیار سے عینی کو لے کر اپنے کمرے میں چلی جاتی۔

حرا ابھی باقی تھی، وہ پڑھ رہی تھی اس نے فی الحال شادی سے انکار کر دیا تھا اور ایک دو کزنز بہت معصوم بچیاں تھیں۔ پورے گھر میں صرف پنا ہی مصروفِ عمل نظر آتی تھی۔ یہاں سے وہاں۔

اب جب میں تھکا ہارا ستم ہائے روزگار سے نمٹ کر گھر پہنچتا تو کوئی مسکراہٹ میرے دل میں خوشی کے دیے اُجالنے......موجود نہ ہوتی۔ ایک عجیب سی بیگانگی زندگی میں در آئی تھی، اور وہ جو اس کہانی کا اہم اور سب سے مظلوم کردار ہے وہ تو گویا میرے سائے سے بھی پناہ مانگتی تھی۔

اوّل تو مجھے نظر ہی نہیں آتی تھی۔ دوئم میں خود اس کا سامنا کرتے ہوئے کتراتا تھا۔

مجھ میں ہمت کہاں تھی کہ اس کے لہو رنگ دکھوں کا سامنا کرتا جو میری جانب سے اسے ملے تھے۔

میرے ہرجائی پن کے گھاؤ،

بے وفائی کے ناسور۔

جنھیں وہ کسی بخشش کی طرح سنبھالے ہوئے تھی۔

شمع کو جدا ہوئے گیارہواں مہینہ چل رہا تھا۔ جب امی نے میرے سر پر بم سا دے مارا۔ وہ پنا کے سلسلے میں میری رائے لے رہی تھیں، جو نہ جانے اتنی لڑکیوں میں سے کیسے بچ گئی تھی، حالانکہ وہ بدشکل تو نہیں تھی۔

میں بوکھلا کر رہ گیا۔

"امی...... پنا نہیں مانے گی......" میرے لہجے کی خجالت تیقن میں بدل گئی۔

"کیوں......؟" امی کی حیرانی خاصی زیادہ تھی۔

اس کیوں کا جواب دینے سے بہتر تھا، میں بن باس کاٹنے نکل کھڑا ہوتا۔

"ایسے ہی...... دیکھیے ناں...... میں ایک بچی کا باپ ہوں؟ مجھے آخر کچھ تو کہنا تھا۔

"تو اس سے کیا ہوتا ہے، بوڑھے تو نہیں ہو...... بھری بہار میں کھیتی اُجڑی ہے۔"

امی کی آواز بھرّا گئی۔

اور میرے اندر وحشتیں اُتر آئیں۔

"تمہاری پھوپھو تمھیں بیٹوں کی طرح چاہتی ہیں۔ وہ تمہاری پریشانی نہیں دیکھ سکتیں، ان سے پوچھ کر ہی تم سے بات کر رہی ہوں۔ انھیں قطعی کوئی اعتراض نہیں۔"

"لیکن امی...... پنا......؟" میں پھر اُلجھا۔

"وہ ماں کے سامنے نہیں بول سکتی۔"

"پھر یہ تو اس پر ظلم ہوا ناں۔" میں پتا نہیں یہ جملہ کیوں کہہ بیٹھا، جیسے مجھے اس کا بہت خیال رہا ہو۔

"کوئی ظلم ولم نہیں ہے، ہمارے خاندان کی بچیاں اپنے والدین کی خوشی دیکھتے ہوئے فیصلے کرتی ہیں اور پھر عینی پنا کے قریب ہو رہی ہے۔" امی نے سمجھایا۔ (اتنی ریت ایکی ہو پنا۔ ذرا دیر کو تو میرے لیے چیلنج بنتیں)

"ٹھیک ہے پھر۔"

یقین کریں، میری یہ آمادگی جبری نہیں، پرخلوص تھی۔ (ہنسیے نہیں) سچ کہہ رہا ہوں۔ میں نے یہ سوچ کر ہامی بھری کہ ضمیر کی خلش مٹانے کا سنہری موقع مل رہا ہے۔ اگر ہو سکا تو معافی تک مانگ لوں گا۔

پھر ایک سادہ ورنگین سے سمے وہ میری ہو گئی۔ (وہ تو شاید ہمیشہ سے میری تھی)

رات دو بجے تک میں نے لان میں سگریٹ کے کئی پیکٹ پھونک ڈالے مگر میری ہمت نہ پڑتی تھی کہ اس کا سامنا کر سکوں۔ ایک عجیب سا خوف تھا۔

میرا باطن اس پر گویا قرض کی صورت چڑھا ہوا تھا۔ مجھے اندیشے ہولا رہے تھے کہ میرا قرض ضرور لوٹائے گی۔

عینی پھوپھو کے پاس تھی۔ آج رات کے لیے وگرنہ میں یہ سوچ کر ہی قدم اندر رکھ دیتا کہ وہ عینی میں مصروف ہو گی۔

بہت ہمت کر کے آخر میں اپنا ہی سامنا کرنے کمرے میں داخل ہوا تو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ وہ لان کے ڈھیلے ڈھالے سوٹ میں کروٹ کے بل رخسار کے نیچے ہاتھ رکھے بے خبر سو رہی تھی۔

مٹے مٹے میک اَپ کے نشان اس کے چہرے پر موجود تھے۔

نکاح کے وقت میں نے دیکھا تھا۔ وہ بہت دلکش اور خوبصورت لگ رہی تھی۔

میری ایک بے وقوف سی کزن ہے۔ اسے ہمیشہ بے موقع بات کرنے کی عادت ہے مجھ سے چپکے سے بولی تھی...... "آج تو شمع بجھ جائے گی۔" میں جز بز سا ہو کر رہ گیا تھا۔

میں نے "معذرت نامہ" اپنے ذہن کے ہی کسی خانے میں بند کر کے کپڑے تبدیل کیے اور خود بھی سو گیا۔ حالانکہ نیند بڑی منتوں کے بعد آئی تھی۔

اس کا قرب مجھے آنچ کی طرح محسوس ہو رہا تھا مگر میں بہت مجبور تھا۔



اس کی مسلسل خاموشی سے حوصلہ پا کر ایک روز میں نے اس سے بے توجہی کا گلہ کر دیا۔ وہ عینی کی فراک بدل رہی تھی، رک گئی، مجھے غور سے دیکھا اور مسکرا دی، پھر اپنے کام میں مگن ہو گئی۔ میں بھڑکتے تنور میں جا گرا تھا۔

وہ میرا اور عینی کا بہت خیال رکھتی تھی۔

جو میں کہتا وہ سنتی اور مانتی۔

بعض اوقات میں اسے بے وقت پریشان کر دیتا اور وہ تحمل سے جھیلتی۔

میں نے اس کے چہرے پر بدلتے رنگ نہیں دیکھے، ہمیشہ سمندر کی سطح جیسا سکون دیکھا، ایسا سکون جو کسی طوفان کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ مگر یہاں تو چار ماہ گزر گئے۔ کوئی سیلاب

کوئی طوفان نہیں آیا۔

ایک روز وہ میری ’’جی حضوری‘‘ کر کے باہر نکل رہی تھی میں پھٹ سا پڑا۔

’’پتا......!‘‘

وہ میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

’’لوگ شادی کی سالگرہ مناتے ہیں۔ میں ’’یومِ استقلال‘‘ منایا کروں گا۔ ایسا ضبط، ایسا استقلال میں نے آج تک دیکھا نہ سنا جو تمھارے رویے اور چہرے سے ظاہر ہے۔‘‘

وہ سر جھکا کر باہر چلی گئی۔ میرا جی چاہا خود کو شوٹ کر لوں۔ یہ تھا میرے غم و غصے کا جواب۔

بعض اوقات ہم کسی پارٹی میں جاتے۔ اور میری ہدایت کے مطابق وہ اچھی طرح تیار ہوتی تو روح بن کر میرے وجود میں سرایت کر جاتی، ایسے میں، میں اپنا استحقاق استعمال کرتا یا ساتھ اس کی تعریف کر دیتا تو......

میرے ہاتھوں سے وہ اپنے ہاتھ چھڑا کر عینی کی کوئی تازہ شرارت بتانے لگتی یا شوریک سے میرے جوتے نکال کر سادگی سے پوچھتی۔

’’یہ ٹھیک ہیں......؟‘‘

آپ سوچ نہیں سکتے ایسے سے میری کیا حالت ہوتی۔

ایک دن تو حد ہی ہوگئی۔

میں صبح آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ وہ خلافِ معمول بیڈ پر تھی۔

میں سخت حیرانی کے عالم میں اس کے پاس آیا۔ اس کی پیشانی چھوئی۔ وہ بخار میں جل رہی تھی۔ میں گھبرا کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

’’تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔‘‘

اس نے آنکھیں موند لیں۔

’’آپ میری طبیعت کے بارے میں پریشان نہ ہوں۔ عینی بہت خوش نصیب ہے، اسے سہاروں کی کمی نہیں۔‘‘

’’کیا بکواس ہے۔‘‘ میری ساری انسانیت بھاپ بن کر اُڑ گئی۔

’’غلام ربانی صاحب کا رات فون آیا تھا۔ وہ ٹرپ سے لوٹ آئے ہیں، آپ کو بلا رہے ہیں۔‘‘

’’تانیہ کے بچے کی پرسوں سے طبیعت خراب ہے، امی کہہ رہی تھیں آپ کو بتا دوں۔ اور یہ آپ نے کل والی شرٹ کیوں پہن لی۔ میں نے دوسری لٹکا دی تھی ناں۔‘‘

وہ اٹھ کر کمرے میں اِدھر اُدھر آنے جانے لگی۔

میرے دماغ میں جھکڑ سے چلنے لگے۔

’’یہ رومال......‘‘ اس نے مجھے تہہ شدہ صاف ستھرا رومال پیش کیا۔

’’اپنا خیال رکھا کرو پتا۔ میں بہت پریشان ہو جاتا ہوں۔‘‘

میں نے پھر اس پر اپنا استحقاق استعمال کیا، وہ مچھلی کی طرح پھسل گئی اور مجھے بتانے لگی:

’’سودا لانے والا کہیں چلا گیا ہے۔ گھر بھر پریشان ہے۔‘‘

’’بکرے کا گوشت مزید مہنگا ہو گیا ہے۔‘‘

’’عینی چار بجے سے آپ کے انتظار میں بیٹھ جاتی ہے۔‘‘

’’پرسوں برابر والوں کے تینوں بچوں کا عقیقہ ہے۔‘‘

میرے اعصاب اس کے جملوں سے چٹخنے لگتے ہیں۔

وہ مجھ سے ڈھیروں باتیں کرے گی، سارے جہاں کے دُکھڑے سنائے گی۔

عینی کی شرارتوں پر کھلکھلا کر ہنسے گی۔

مگر......میری شدتوں سے نظر چرائے گی۔

میری بات۔ محبت کی بات۔ گویا ایک روپے کے نوٹ کی طرح ارزاں ہے۔

میں اس کی آواز سنوں گا...... باتیں سنوں گا۔

مگر شاید کوئی ایسا حرفِ معتبر میری قسمت میں نہیں کہ میرے قلب میں تانیہ کی شادی کے عہد کا گڑا تیر نکل جائے۔

کوئی وہ جملہ نہیں جس میں سراسر میری ذات کا حوالہ ہو۔ میری رہائی ہو پتا......اے میری خلش، میرے کرب، میرے ادھورے پن......

اگر کوئی حرفِ معتبر نہیں تو۔

کوئی حرفِ ملامت ہی سہی۔



تایا گزر اوقات

اوّل اوّل تو وہ ایک واحد گھر کے ہی تایا بنے تھے مگر پھر شیطان کی طرح قریہ قریہ، گھر گھر تایا مشہور ہو گئے تھے۔

تایا اگر ان کا نام پڑ گیا تھا تو ''گزر اوقات'' عرفیت ٹھہری تھی۔ ہر عرفیت کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے۔ ان کے ہاں بھی وجہ موجود تھی کہ یہ کائنات ہی اسباب وعلل کا گورکھ دھندا ہے۔

''شنید تھی کہ برسوں کے انتظار کے بعد وہ اپنے والدین کو میسر آئے تھے۔ خیال تو یہی تھا کہ تبرک کے طور پر استعمال ہوں گے ہمیشہ مگر ان کی پیدائش کے چار سال بعد یوں ہوا کہ ایک تواتر سے ان کے بہن بھائی عالم ناسوت میں وارد ہونا شروع ہوئے۔

پہلے ان کی اماں، حکیم حکمت عملی سے بچے پیدا کرنے کے نسخے لیتی تھیں پھر بند کروانے کے لینے لگیں۔

ہونے والے متولدین کی چیخ و پکار میں تایا کی ماں بہری ہونے لگیں کم از کم تایا کی آواز تو ''اصفہان ریڈیو'' بن کر رہ گئی کبھی سنی جاتی کبھی نہیں۔ ایسی مٹی پلید ہوئی کہ حد نہیں۔

تایا جو چار سال تک اکلوتے ہونے کے مزے لوٹتے رہے تھے یوں چونکے گویا نرم گرم چھپر کھٹ سے دھڑام فرش پر گر پڑے ہوں۔

کچھ تو پیدائشی ہی ''باریک'' سے تھے۔ بے توجہی نے باقی ماندہ عرقیات بھی نچوڑ لیے۔ پڑھائی لکھائی سے انھیں سوکن کا سا بیر تھا۔ پٹ پٹا کر بھی مڈل تک نہ پہنچ سکے حالانکہ ابھی تک اماں ان کی پیدائش کی منت پوری کر رہی تھیں۔ ہر سالانہ عرس پر چادر چڑھانے جاتی تھیں۔

یہ اور بات کہ تایا کے لچھن دیکھ کر انھیں چادر پر خرچ ہونے والی رقم کا قلق ہونے لگتا تھا۔

ان کی وادی نے بی بی فاطمہؓ کے کونڈے مان رکھے تھے۔ سال کے سال بیٹھی کونڈوں پر بھنبھناتی مکھیاں ہلاتیں تر بہ تر پوریاں کھلاتیں۔ ایک نئی منت اور ماننے لگ جاتیں کہ

پیدا تو ہو گئے ہیں عالم فاضل بھی بن جائیں۔

عالم فاضل تو خاک بنتے۔ نکھٹو پن میں البتہ ان کا کوئی ثانی نہ ٹھہرا تھا۔ جسمانی طور پر ان کی وضع قطع یوں تھی گویا بانس پر کپڑے چڑھا رکھے ہوں۔ مارے کمزوری کے جھلاہٹ کا عارضہ الگ لاحق تھا۔ کچھ ہوش سنبھالا تو گھر بھر انھیں بر سر روزگار دیکھنے کا تمنائی ہو گیا۔

مگر محنت مشقت بھی ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ سائیکلوں کی دکان پر تھوڑے دن کام کیا۔ ماں چیخیں کہ اتنے سے پیسوں میں کیا کرے گا؟ تو اللہ کے صابر شاکر بندوں کی طرح فرمانے لگے۔

''گزر اوقات تو ہو ہی جائے گی اماں۔''

چند دن ایک آڑھتی کے پاس بیٹھنے کا ارمان پورا کیا۔ کسی نے پوچھا ''کیا کما رہے ہو؟'' فرماتے ''گزر اوقات ہو رہی ہے۔''

پھر ایک اسٹور پر جزوی سیل مین کے طور پر کام کرنے لگے۔ اسٹور کے مالک نے بہت کہا وہ تمام دن کی ڈیوٹی کر لیں۔

مگر ''اسٹیمنا'' کی کمی کے باعث انھوں نے درخور اعتناء نہ جانا، بولے 'جو مل رہا ہے گزر اوقات ہو رہی ہے۔''

اس قدر قناعت پسند آدمی تھے کہ ''گزر اوقات'' سے آگے پیر ہی نہیں رکھتے تھے۔

دوسرے بہن بھائی پڑھ لکھ کر کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ وہ گزر اوقات ہی میں لگے رہے۔ یوں گزر اوقات ان کی عرفیت بن کر رہ گئی۔

سب سے پہلے تو ماں انہی کی شادی کرنا چاہتی تھیں وہ تو ''تایا گزر اوقات'' کے لیے رشتہ لے جانے میں قطعی کوتاہی نہ برتتی تھیں۔

لڑکی والے ہی انھیں دوسرے سیارے کا باشندہ قرار دے دیتے تھے تو وہ بے چاری کیا کرتیں۔

پھر دوسرے بھائیوں کی موجودگی میں ان کی حیثیت ہی زائل ہو جاتی تھی۔ بے چاری ماں ہار کر دوسرے بچوں کے گھر بسانے میں لگ گئیں۔

ان سے چھوٹے بھائی کے ہاں پہلا بچہ پیدا ہوا جس نے بانگ دہل انھیں تایا کہنا شروع کیا۔

پھر ان کے گھر میں ''تایا'' کا درد کرنے والی ایک لائن تیار ہو گئی۔

پہلے لوگ اپنی حس مزاح کا اظہار غلام علی گزراوقات کہہ کر کرتے تھے۔ اب تایا گزر اوقات کہنے لگے۔ اب وہ جگت تایا گزراوقات بن چکے تھے۔

اچھی بی کے لیے اگر تایا گزراوقات کا رشتہ آیا تھا تو یہ کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی۔ تایا گزراوقات کا رشتہ تو ان کی قدر افزائی کا باعث ہی تھا۔

بلو کی اماں نے سنا تو یہی کہا کہ اللہ نے ملائی جوڑی ایک اندھا ایک کوڑھی۔

اچھی بی کو چونتیسواں سال لگ رہا تھا گودوں کے کھلائے بھتیجے بھانجیاں جنریشن گیپ کا نعرہ لگانے کے قابل ہو چکے تھے۔ اچھی بی ہنوز کنواری تھیں۔

دراصل ان کی ''دانائی'' کے چرچے اس قدر ہو چکے تھے کہ ان کے ہم پلہ ہونے کا دعویٰ کرنے والا کوئی نہیں رہا تھا۔

پرلے سے بھی پرلے درجے کی سیدھی یا بے وقوف تھیں اس پر مستزاد لگائی بجھائی کی عادت ایسی تھی جیسے کسی کو نشے کی لت ہو۔

تین بھابیوں کو علیحدہ گھر لے کر بھی عافیت کا سانس میسر نہیں تھا۔ بڑی بھاوج کو گھر آئے ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا کھڑی میاں سے دکھڑے کہہ سن رہی تھیں کہ ''ہفتہ بھر ہو گیا ماں کی صورت نہیں دیکھی اماں (ساس) کو بخار چڑھ رہا ہے کیسے جاؤں؟''

جھٹ اماں کو رپورٹ پہنچا دی کہ ''بھابی کہہ رہی ہیں کہ اماں تو مرض الموت میں مبتلا لگتی ہیں، میکے کیسے جاؤں؟''

ساس نے سنا تو بہو کو ہمیشہ کے لیے میکے کا رستہ دکھا دیا۔ وہ تو بھائی کی سوجھ بوجھ کام آئی اور گھر اُجڑنے سے بچ گیا۔

دوسری بھاوج نئی نویلی دلہن تھیں، بن ٹھن کر رہتی تھیں۔ پہلی والی کو بھی حرص آئی۔ کسی کسائی نظر آنے لگیں۔

چھوٹی دلہن نے کہہ دیا یونہی کہ بھابی کو چار ماہ کا پیٹ ہے۔ کیسی پھنسی پھنسی قمیصیں پہنتی ہیں۔

جھٹ بڑی بھابی تک ''تاس'' کا نمائندہ بن کر پہنچ گئیں کہ چھوٹی بھابی کہہ رہی ہیں کہ بڑی بھابی کپڑا جسم پر چڑھا کر سلواتی ہیں۔

ان کی اسی قسم کی لگائیوں بجھائیوں سے گھر میں ہمہ وقت بغیر ٹکٹ ''ریسلنگ'' شروع ہو جاتی۔

اس پر حد یہ تھی کہ مبالغہ ان کی گھٹی میں پڑا تھا، کوئی بات شروع کرتیں تو وہ طومار باندھتیں کہ لگتا میری جنگ عظیم گلی گلی لڑی جا رہی ہے۔

اخبار میں کہیں دھماکے کی خبر پڑھتیں تو چار بلڈنگیں بیٹھے بیٹھے گرا دیتیں کہیں کسی ساس بہو کا جھگڑا سننے کو مل جاتا تو کسی ایک کو اسپتال پہنچائے بغیر خبر پوری نہ کرتیں۔

کہیں آگ لگنے کا واقعہ ہوتا تو سمندر سے آگ عبور کرا دیتیں۔

بھاوجیں تو انھیں اپنے گناہوں کی سزا تصور کرتی تھیں کہ پست قامت آٹے کی بوری جیسی ہیئت رکھنے والی کے لیے رشتہ ملنا بھی دشوار تھا اس پر پورا منہ دانتوں سے بھرا تھا۔ جس کے سبب بیٹھے بٹھائے ان پر خوش اخلاقی کا دورہ پڑتا دکھائی دیتا تھا کہ دانت نکالتی نہیں تھیں نکلے رہتے تھے پچھلے برس رمضان کا چاند دکھائی نہیں دیا تھا اور وہ چھت پر دیکھ آئی تھیں اور اماں گھڑی میں تین بجے کا الارم لگا کر بیٹھ گئی تھیں۔

انتیسویں روزے کو وہ عشاء تک چار بار چاند نکال آتی تھیں جس پر بڑی بھاوج چیخ کر بولی تھیں:

''اے اچھی بی پلک کا بال ٹوٹ کر ڈیلے پر تو نہیں چپک گیا؟''

تایا گزراوقات پچپن سے اوپر ہو چکے تھے اور شادی کا خیال دل سے نکال کر روزانہ بڑی بڑی آنکھوں والی حوروں کا تصور لیے بیٹھے رہتے تھے۔

اچانک ان کی اماں کو سن گن ملی کہ اچھی بی نام کی کوئی ''لڑکی'' بر کی آس میں بیٹھی ہے۔

مامتا تو سب کے لیے ایک سی ہوتی ہے۔ محروم بیٹا دل میں پھانس کی طرح گڑا رہتا ہے۔

عین رمضان میں ہی رشتہ لے کر پہنچ گئیں۔ سب نے کہا بھی کہ عید کے بعد چلی جانا مگر وہ نہ مانیں۔

اچھی بی کی بھاوجوں کو شنید ہوئی تو دنوں میں پھلجڑیاں چھوٹنے لگیں۔ انھیں تایا گزر اوقات کسی نجات دہندہ سے کم نہ دکھائی دیے۔ ایڑی چوٹی کا زور لگا کر وہ تایا کو کوہ قاف کا باشندہ ثابت کرنے پر تل گئیں۔

اچھی بی کی اماں بولیں:

''اے دلہن، لڑکے کی عمر زیادہ ہے۔'' منجھلی بہو تیزی سے بولیں۔

''عمر زیادہ ہے تو کیا ہوا؟ لڑکا تو ہے۔ باریک ہے تو کیا ہوا اچھی بی کا حاشیہ ہی بن جائے گا۔''

تایا جو بسے گھر دیکھ دیکھ کر آہیں بھرا کرتے تھے یہ سن کر خوشی سے پھولے نہ سمائے تھے کہ ان کا رشتہ منظور ہو گیا ہے اور ان کا بھی گھر بس رہا ہے۔''

مارے خوشی کے ڈیڑھ گھنٹے تک بتیسی ہاتھ میں لے کر ''مانجھی'' تھی۔ اور تصورات کی دنیا میں اچھی بی کو بسایا تھا۔

خاندان کی لڑکیوں نے سنا تو خوشی سے چیخ پڑیں۔ اچھا شغل ہاتھ آیا تھا۔ روزہ کھولنے کے بعد ڈار کی ڈار انھیں چھیڑنے پہنچی تھیں اور وہ اتنا شرمائے تھے کہ باقی جسم میں خون کی کمی واقع ہو گئی تھی۔ سارا چہرے پر جو آ گیا تھا۔

طے ہوا عین عید کے دن برات جائے گی۔

تایا نے شرما کر فرمائش کی کہ ان کی شادی کی مووی بھی بنائی جائے اور مہندی کا سلسلہ ضرور ہو۔

لڑکیوں نے اس سلسلے میں بڑی یک جہتی کا مظاہرہ کیا اور بزرگوں کی ہر آواز کو دبا دیا گیا۔

سارا رمضان تایا کی شادی کا موضوع زیر بحث رہا ہر گھر میں رونق اُتر آئی۔ چاند رات کو لڑکی والے مہندی لا رہے تھے۔

بہنیں بھاوجیں سرخ دوپٹا تھامے ان کی منتظر کھڑی تھیں اور وہ کمرے سے نکلنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

خوب شور شرابے پر ہانپتے کانپتے باہر آئے اور بہن کو چپکے سے بتایا کہ بتیسی گم ہو گئی ہے، وہ ڈھونڈ رہے ہیں۔

بہن نے دلاسا دیا کہ کوئی بات نہیں ایسا بھی ہو جاتا ہے۔ لڑکیوں نے موقع کی مناسبت سے ایک گانا مزید تیار کر لیا تھا۔

کسی کی دید ہو جائے
ہماری عید ہو جائے

ایک لڑکی گاتی باقی ''آمین'' کہتیں ایسا لگتا کہ میلاد کے آخر میں مناجات پڑھی جا رہی ہو۔

اچھی بی کی طرف سے مہندی آئی، ہر شخص کے چہرے سے چاند رات طلوع تھی عجیب سی گدگدیاں ہر ایک کو ہو رہی تھیں۔

تایا نے ہر رسم میں بھرپور حصہ لیا۔ بتیسی سنبھال سنبھال کر مسکراتے رہے مووی کی لائٹ میں ان کا تانبے جیسا رنگ دمک رہا تھا۔ مووی میکر کو انھوں نے خصوصی ہدایت دی تھی کہ ان کے کلوز اَپ ضرور لیے جائیں جیسے سینما کی اسکرین پر ''ندیم'' کے کلوز اَپ آتے ہیں۔

لڑکیوں نے گانا چھیڑ رکھا تھا

دلہن گاؤں کی گنوار تایا بولتے نہیں

تایا نے بہن کے کان میں سرگوشی کی:

''ہم نے تو سنا ہے وہ کچھ پڑھی ہوئی ہیں؟''

''یہ تو گانا ہے۔ ہوٹ کر رہی ہیں دلہن والوں کو۔'' بہن نے تشفی دی۔

''کہیں وہ برا نہ مان جائیں؟'' انھوں نے خدشہ ظاہر کیا۔

''ان کے ایمپلی فائر یہاں فٹ نہیں ہیں۔'' بہن جل کر بولی تھیں۔

لڑکیوں کی خوشی کی تو کوئی حد نہیں تھی۔ اتنی مدہوش تھیں کہ چاند رات کی شاپنگ بھول چکی تھیں۔

ساری رات گانے گا گا کر آوازیں بیٹھ گئی تھیں۔ خدشہ لاحق ہوا کہ ابھی تو کل کا دن باقی ہے۔ آوازوں کا یہی حال رہا تو کیا کل تایا کو اشاروں سے چھیڑیں گی؟ لہٰذا تین بجے سو گئی تھیں۔

اگلی صبح عید تھی جلد اٹھنا پڑ گیا۔ آنکھوں میں لال ڈورے، بیٹھی آوازیں، پھیلے بال، مٹے مٹے میک اَپ ایسا لگ رہا تھا، تایا کی شادی میں جوکر شریک ہوں۔

تایا کی شادی کیا تھی ایک دلچسپ ڈراما تھا جس میں ہر کردار جوش و خروش کے ساتھ کردار نگاری کرتا نظر آ رہا تھا۔

عید کی نماز کے بعد بارات کی تیاری کا سلسلہ شروع ہو گیا...... تایا کے حوالے سے ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ کر کے لڑکیوں کے پیٹ میں بل پڑ رہے تھے۔

بزرگ بظاہر انھیں ٹوک رہے تھے مگر گدگدیاں انھیں بھی زبردست ہو رہی تھیں۔

اللہ اللہ کر کے رات گئے رخصتی عمل میں آئی۔

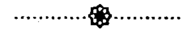
تایا کی بھابی نے گھر پہنچنے سے پیشتر ہی کرتا دھرتا لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ دولہا دلہن کو گود میں لے کر دہلیز پار نہیں کرائے گا۔ خدشہ ہے کہ ایسا کرنے کی صورت میں دولہا حجلۂ عروسی کے بجائے اسپتال پہنچ جائے گا کہ ایک تو جانِ ناتواں اس پر ''عمر کا تقاضا''

اس پر سب نے اتفاق کیا۔

دلہن کی خالہ دلہن کے ساتھ آئی تھیں۔ رات دو بجے تک انھیں چپکے چپکے نہ جانے کیا مشورے دیتی رہیں۔ اُدھر تایا، ظالم سماج قسم کی خالہ ساس کو دل ہی دل میں بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔

بڑی عمر کی خواتین نے لڑکیوں کو ڈانٹ پھٹکار کر سونے کے لیے بھیج دیا تھا۔

بہنیں، بھاوجیں البتہ تایا کو اپنے جلو میں حجلۂ عروسی میں لے گئی تھیں۔



صبح کو بڑی عمر کی خواتین کی وجہ سے، کچھ فطری حجاب کی وجہ سے لڑکیاں تو ایک دم کمرے میں نازل نہیں ہوئیں البتہ بہنیں بھاوجیں طوفان کی طرح دلہن کے کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔

''کیسی ہو دلہن رانی؟'' ایک بھاوج معنی خیز انداز میں مسکرائیں۔

وہ شرما کر دوہری ہو گئیں۔

''کیا تحفہ ملا؟''

انھوں نے تکیے کے نیچے سے ایک ایک کے کئی نوٹ نکالے اور لجا کر بولیں۔ ''کہہ رہے تھے کہ آپ کے شایانِ شان کوئی تحفہ سمجھ نہیں آیا یہ پیسے رکھ لیجیے اپنی مرضی سے کچھ خرید لیجیے گا۔''

''آپ کو دیکھ کر کیا تاثرات تھے تایا کے، آپ میں کیا چیز پسند آئی انھیں؟'' ایک اور سہاگن نے شوخی سے پوچھا۔

''کہہ رہے تھے کہ آپ کی آنکھیں بہت حسین ہیں۔'' وہ شرم سے دوہری ہوئیں تو گاؤ تکیہ بن کر رہ گئیں۔

بے ساختہ ہنسی کو بمشکل بریک لگے تھے۔

''اور کچھ کہہ رہے تھے؟'' ایک اور چلبلی کو مزید جاننے کا اشتیاق ہوا۔

''کہہ رہے تھے آپ میرا خیال رکھیں گی اور میں آپ کا۔ گزراوقات تو ہو ہی جائے گی۔''

اب قہقہے رُک نہیں سکے تھے۔

جب تایا گزراوقات کی بھابی انھیں باتھ روم کی طرف لے جا رہی تھیں تو اچھی بی کی حسِ مبالغہ پھڑکی اور وہ رازداری سے بولیں۔

''بھابی...... مجھے ''متلی'' سی ہو رہی ہے...... لگتا ہے۔'' وہ شرما کر رُک گئیں۔

بھابی نے پہلے تو ہکا بکا ہو کر ان کی شکل دیکھی پھر خاموش رہنے میں ہی بہتری سمجھی۔

ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انھیں کس قسم کے تاثرات کا اظہار کرنا چاہیے۔

انھیں تایا کی ''گزراوقات'' خطرے میں نظر آ رہی تھیں۔



اِک حرف تسلی تو؟

"شوفر ڈرِون" کار شیشے کی طرح چمکتے ہوئے فرش والے وسیع وعریض پورٹیکو میں آ گئی تھی۔

"اب یقیناً ہار جاؤ گے۔" عباس نے منہ بنا کر کرسی کی پشت سے کمر ٹکائی۔

"یار! اسی کو کہتے ہیں مفت میں بدنام ہونا۔" محتشم کچھ کھسیا گیا۔

"تجربے کی بات ہے، کوئی فکشن نہیں۔"

"ادھر وہ آئی نہیں اور تم ہارے نہیں۔ جب کھیل سے تمھاری توجہ ہی ہٹ جاتی ہے تو ہار تو انجام ہوگا ہی۔ بساط پر مہرے انتہائی نازک پوزیشن میں تھے۔" اور عباس کی بات کی تصدیق ہو رہی تھی۔

محتشم غائب دماغی کی کیفیت میں مبتلا ہو چکا تھا۔ اس کی بات اس کے انداز کی تردید کر رہی تھی۔

"یار گونگی ہے تمام عمر اقرارِ محبت سننے کو ترسو گے۔" عباس چڑ کر بولا۔

"ہا...... ہا......" محتشم کا قہقہہ بے حد جاندار تھا۔

"یار! تم بہت فاسٹ ہو۔ میں تو ابھی حسن بے مثال کو جی بھر دیکھنے کے مرحلے سے گزر رہا ہوں اور تم سوچ میں اتنا آگے بڑھ آئے۔"

"تو کیا فلرٹ کرو گے؟" عباس کی مٹی ہی "سنجیدہ" مقام سے اٹھائی گئی تھی۔ بہت مدبرانہ انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"دیکھو یار! ذرا دیکھو، کلب میں یہاں سے وہاں تک اس وقت "اسی" خاموش تصویر کے بیمار نظر آ رہے ہیں۔" محتشم نے اسے چاروں سمت متوجہ کیا۔

"یار شطرنج کے وقت کچھ اچھا نہیں لگتا۔" عباس سخت جھلایا ہوا تھا۔

"تم اس کالی کلوٹی کے اتنے وفادار ہو کہ نگاہ تک بچاتے ہو۔ یقین کرو میں اس وقت تم سے سخت متاثر ہو رہا ہوں۔" محتشم نے اسے چھیڑا۔

"جان نہیں جلاؤ یار، کھیل کا سارا مزہ ہی غارت ہوگیا۔"

"ویسے میں آج اسے رقص کی دعوت دے کر ہی رہوں گا۔" محتشم نے اپنا مصمم ارادہ ظاہر کیا۔

"میری بلا سے تم اس "جمعراتن" کو یہ دعوت دے ڈالو کہ وہ تمھیں شوٹ کر ڈالے۔"

عباس کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"بیٹھو تو سہی، غصہ تھوک دو یار۔ لو میں اس کی طرف سے پیٹھ کیے لیتا ہوں۔"

محتشم نے اسے منایا۔

"رہنے دو۔ "بے ادبی" ہوگی۔" عباس جل کر بولا تھا۔

"کھیل شروع کرو بھئی، ختم کرو یہ قصہ۔" محتشم مستعد ہو کر بیٹھ گیا۔

"فائدہ کیا، جان بوجھ کر ہار جاؤ گے۔ اس طرح کھیل میں کیا مزہ آتا ہے؟" وہ ہنوز ماش کے آٹے کی طرح اکڑا ہوا تھا۔

"یار یہ ہر جمعرات کو ڈرامہ ہونے لگا ہے۔" وہ ناراضگی سے بولا۔

وہ شطرنج کا رسیا تھا۔ نشے کی طرح اسے اس کی لت تھی۔

"بیٹھ جاؤ۔" محتشم نے پھر اصرار کیا۔

"میں کہہ رہا ہوں کہ اب میرا بیٹھنا بے کار ہوگیا۔ کیونکہ ڈائننگ فلور آباد ہو رہا ہے۔"

"اب تم پہلے سے زیادہ بے توجہ ہو جاؤ گے۔" عباس نے ٹیبل سے کار کی چابی اٹھائی۔

وہ کچھ غلط بھی نہیں کہہ رہا تھا۔ تاہم محتشم کو اس کے اٹھ جانے کا افسوس ہو رہا تھا۔

عباس "اوکے" کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

محتشم نے سگریٹ سلگایا اور لان میں نظر دوڑانے لگا۔ سرخ لباس میں حسن خاموش پورے لان کا جائزہ لے رہا تھا۔

محتشم اب خود پر قابو نہ پا سکا تھا، اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کا رخ اسی خاموش تصویر کی طرف تھا۔

"ہیلو۔"

وہ ایک مگن جوڑے کو بے حد اشتیاق سے دیکھنے میں مصروف تھی۔ ایک دم چونک پڑی۔

"تھینکس گاڈ، آپ سنتی تو ہیں۔ میں نے تو سنا ہے عموماً جو بولنے کی صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں وہ سُن بھی نہیں سکتے۔" محتشم نے حاصل کردہ معلومات اسے منتقل کیں۔

اس نے انتہائی ناگواری سے پیشانی پر بل ڈال کر محتشم کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔

''کیا میں بیٹھ سکتا ہوں؟''

اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔ محتشم کھسیا سا گیا۔ ''کیا آپ کسی کا انتظار کر رہی ہیں؟'' وہ سر کھجا کر پوچھنے لگا۔ اس نے اپنی سبز آنکھیں محتشم پر جما دیں۔ پھر انتہائی بےزار کن انداز میں اثبات میں گردن ہلا دی۔

''کس کا؟'' محتشم پوچھ بیٹھا، حالانکہ اس قسم کے سوالات کرنے کا کوئی حق اسے حاصل نہیں تھا۔ یونہی تجسس بیدار ہو گیا تھا۔ کلب کے تمام ہی ممبران کو وہ جانتا تھا۔

''بلی'' نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ اپنی گاڑی اور ڈرائیور کا، پھر پلیٹ میں رکھے پاپ کارن ٹونگنے لگی۔ جیسے کہہ رہی ہو ''اب آپ جائیے۔'' محتشم سخت مایوس حالت میں وہاں سے لوٹا تھا۔

اب وہ مزید شدت سے عباس کی خفگی پر ضمیر کی ملامت سن رہا تھا۔

اس نے ایک پیاسی نگاہ ''بلی'' پر ڈالی اور آگے بڑھ گیا۔

''یہ ہے کیا شے؟'' مسز برلاس کی تیوری پر بل پڑے ہوئے تھے۔

''ارے اپنے حسن کا تماشہ دیکھنے آتی ہے۔ لباس ایڈوانس پہنتی ہے اور چال دیکھو۔''

''مس جہاں پناہ'' نے اپنے گدے جیسے جسم کو کرسی پر ٹھکانے لگاتے ہوئے جل کر کہا تھا۔

''حالانکہ سب کو پتا ہے کہ گونگی ہے پھر بھی بدذات کے آگے پیچھے پھرتے ہیں۔''

مس ابرار میرٹھی کی جان ناتواں جیسے سلگ کر آدھی رہ گئی تھی۔ صرف زبان میں کچھ طاقت کے اثرات پائے جاتے تھے۔

''ارے یہ کرنے کیا آتی ہے یہاں؟ کوئی کھیل کھیلتے اسے نہیں دیکھا گیا۔''

''کلب پکنک سے یہ غائب تھی۔ ڈانس فلور پر اسے کبھی نہیں دیکھا گیا، مجھے تو یہ کسی عجوبے سے کم نہیں لگتی۔''

مسز لالٹین والا کی سمجھ یوں بھی زیادہ کام نہیں کرتی تھی۔ معلومات کا گھوڑا بیچ میں کہیں گر پڑتا تھا۔ مگر اس کے بارے میں تو وہ بھی سوچ سوچ کر ہلکان ہو جاتی تھیں۔

''جسے دیکھو، اس کی ٹیبل یاترا ضرور کرتا ہے۔ اتنی کرکری کرتی ہے، پھر بھی اس کے پاس جاتے ضرور ہیں۔''

مس سلیمان نے ذرا اپنا دوپٹہ مزید آڑا ترچھا کیا۔ سوکھی چمڑی سے کپڑا ابھی یوں چمٹا رہتا تھا جیسے اس کی مامتا پھڑک رہی ہو۔''

وہ دبو چھوٹے سے قد والا آفتاب صدیقی کتنی مشکل سے ان کی طرف مائل ہوا تھا مگر اب وہ بھی اسکوائش کورٹ کے بجائے سامنے کرسی پر بیٹھا اسے دیکھتا رہتا ہے۔ یہ احساسِ شکست انھیں اب چین نہ لینے دیتا تھا۔

''مجھے تو یہ ابنارمل لگتی ہے۔'' مس جہاں پناہ نے غالباً بابا فرائیڈ سے کچھ اکتساب کیا ہوا تھا۔ ''آئی ہے بیٹھی ٹکر ٹکر دیکھتی رہتی ہے۔''

''ہونہہ دیکھتی رہتی ہے۔ شہیدان عشق کی گنتی کرتی رہتی ہے۔'' مسز برلاس نے انتہائی کڑوا سا منہ بنایا۔

''میرا تو ویک اینڈ پر آنے کا کوئی پروگرام نہیں ہوتا۔ میری دیگر مصروفیات بھی بہت ہیں مگر برلاس صاحب کی وجہ سے آنا پڑتا ہے۔''

''حیلے بہانے سے وہ بھی گونگی کا تذکرہ کرنے لگ جاتے ہیں۔'' مسز برلاس واقعی مشکل میں تھیں۔

''بھئی اسے یہاں سے دفعان کرنے کا کوئی پروگرام بنانا چاہیے۔'' مسز لالٹین والا کو اپنی فکر پڑ گئی تھی۔

''پروگرام......'' مس سلیمان طنز سے مسکرائیں۔ ''منصوبہ کہیے۔''

''مجھے لگتا ہے اس کے پیچھے کوئی اتھارٹی ہے، انداز نشست نہیں دیکھا اس کا؟ جیسے ہم سب اس کی رعایا ہوں۔'' مس جہاں پناہ کے غرور و خود پسندی کو اس کی وجہ سے سخت ٹھیس پہنچ رہی تھی۔

''میرا بس چلے تو یاجوج ماجوج بنا کر ہمیشہ کے لیے کسی دیوار کے پیچھے پھینک دوں۔'' مسز برلاس نے قہر آلود نگاہوں سے اس کی سمت دیکھا تھا۔

ان کا دکھ بڑا جائز قسم کا تھا اور نسوانی و معاشرتی ہمدردیاں ان کے ساتھ آسانی سے بگھاری جا سکتی تھیں۔ اس لیے وہ اس گونگی کے خلاف کھل کر بولنے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھیں۔ آفٹر آل مسٹر برلاس۔ ''بڑی شے'' تھے۔

جوں جوں رات بڑھتی جا رہی تھی ہلچل و چہل پہل بڑھ رہی تھی۔ سرو قد کھڑے افراد کی وجہ سے اس کی ٹیبل ان دکھوں کی ماری خواتین سے اُوجھل سی ہو گئی تھی۔

معاً وہائٹ یونیفارم میں ملبوس کیپ ہاتھ میں لیے ہوئے ڈرائیور سامنے سیڑھیوں پر نمودار ہوا اور آگے بڑھنے کے بجائے وہیں کھڑا رہ گیا۔

حسن لب بستہ آہستگی سے اٹھ کھڑا ہوا اور محتشم آفریدی پھڑ پھڑا کر رہ گیا، گویا

"انکل۔" نومی پودے کے پیچھے سے جھانک رہا تھا۔

"ہوں۔" محتشم نے نظر کا چشمہ نیچے کر کے بچے کو دیکھا۔

"ممی بلا رہی ہیں آپ کو۔ وہ کہہ رہی ہیں مزے کی چیز دکھاؤں گی۔" نومی نے جیسے اسے پٹایا۔

"یار تم ہی دیکھ لو۔" محتشم نے بے زاری سے کہہ کر کتاب چہرے کے سامنے کر لی۔

"بڑی ہے اس سے، اس کے قابل نہیں ہے۔" رخشی اندر وارد ہو کر چڑ کر مخاطب ہوئی تھیں۔

"آیئے بھابی۔" محتشم سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"انداز تو ایسا ہے جیسے کہہ رہے ہو جایئے بھابی۔" وہ اس کے پاس رکھے موڑھے پر بیٹھ گئیں۔

"مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ نومی کو ٹرخا دو گے اس لیے پیچھے پیچھے چلی آئی۔ ذرا باہر تو آؤ بھئی۔"

"کیا ہے باہر؟ وہی منظر وہی چیزیں جو روز دیکھتا ہوں۔" محتشم غالباً اس وقت مطالعے کے موڈ میں تھا۔ پھر ایک دم ذرا چونکا۔ "آپ کیا کہہ رہی تھیں، کیا بڑی ہے اس سے؟"

"انجو بھائی کی بہن آئی ہوئی ہے۔ سچ دیکھ لو، ورنہ پچھتاؤ گے۔"

"جہاں اتنے کام کرتا ہوں، پچھتا بھی لوں گا۔" محتشم پر قطعی کوئی اثر نہیں ہوا۔

"کتنے روڈ ہو رہے ہو محتشم، تمھیں احساس نہیں کہ میں تمھارے لیے کتنی فکر مند رہتی ہوں۔"

"سوری بھابی، میرا یہ مطلب نہیں۔ بھئی جب میں فی الحال شادی ہی نہیں کرنا چاہتا تو اس قسم کی باتوں سے کیا فائدہ؟" وہ لاپروائی سے بولا۔

"ویسے کوئی دین ایمان نہیں تمھارا، لمبے بالوں والی ہو، ایسی ہو، ویسی ہو، کتنی مشکل سے لمبے بالوں والی ڈھونڈ نکالی تھی۔ تمھیں اس کی آنکھیں چھوٹی لگی تھیں۔ بڑی آنکھوں والی دکھائی تو اس کے چہرے پر غائبانہ قسم کی چھائیاں تمھیں نظر آ گئی تھیں۔ امی لاہور سے فون پر کہتی

ہیں کہ میں تمھیں ٹھیک کروں۔"

"میں ان سے پوچھتی ہوں کہاں کہاں سے؟" بھابی سخت ناراضگی سے کہہ رہی تھیں۔

"دیکھو! یہ جو فاطین آئی ہوئی ہے۔ ہر لحاظ سے تمھارے لیے موزوں ہے بہت پُر وقار لڑکی ہے۔"

"آؤ تو سہی مل لینے میں کیا ہرج ہے؟" محتشم چار و ناچار اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اس سے زیادہ بھابی کو ناراض بھی نہیں کر سکتا تھا۔

"انتہائی بددلی سے ان کے پیچھے پیچھے لاؤنج میں آیا۔ نفیس سے تراش خراش کا بلیک سوٹ پہنے وہ واقعی بڑی گریس فل نظر آ رہی تھی۔ کھلی کھلی آستینیں کہنیوں سے اوپر تھیں۔ دامن سے کالر تک چھوٹے چھوٹے گولڈن بٹن تھے جو یوں چمک رہے تھے جیسے اندھیرے میں جگنو۔ بٹی ہوئی رسّی کی طرح چوٹی کمر پر جھول رہی تھی۔ کانوں میں رنگ تک نہیں تھے مگر اس پر بھی اس کا حسن نگاہ سے دل میں اتر رہا تھا۔

"السلام علیکم۔" اس نے بڑے سبھاؤ سے سلام کیا تھا اور محتشم کے جواب کا انتظار کیے بغیر بھابی کی سمت متوجہ ہوتے ہوئے کہنے لگی تھی۔

"یہ دیکھیے، میں نے آپ کے لان میں کھلے ہوئے پھولوں کا کیسا استعمال کیا ہے۔"

اس کے ہاتھ میں بہت خوبصورت گلدستہ تھا۔ جو وہ گلدان میں آرائش کر چکی تھی۔

"تھینکس۔" بھابی نے تشکرانہ انداز میں مسکرا کر جواباً کہا۔

"کیا میں پھول اور خواتین کے بیچ مخل نہیں ہوں؟" محتشم کو فاطین کی بے نیازی سے اپنی ہتک سے محسوس ہوئی۔

وہ تو یوں بھی آج کل کسی سمت متوجہ ہونے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔ اس کے خیالات پر تو اب "ویک اینڈ" سوار رہتا تھا۔ دن کاٹے نہیں کٹتے تھے۔

"فاطین! یہ محتشم ہیں۔ ہمارے اکلوتے اور بگڑے ہوئے دیور۔" بھابی کے لہجے میں محتشم کے لیے ازخود شفقت در آئی۔

"اور محتشم! یہ فاطین ہیں۔ انجو بھابی کی چھوٹی بہن۔" (انجو، محتشم کے سب سے بڑے بھائی کی بیگم)

"اچھا، بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" محتشم نے جیسے جان چھڑائی تھی۔

"میں آپ کو آپ کا یہ جملہ واپس کرتی ہوں۔" وہ گلدان ٹھکانے پر پہنچا کر خوش دلی سے بولی۔

"ویسے میں اس سے قبل...... میرا مطلب ہے آج سے قبل آپ سے ملاقات کا شرف حاصل نہیں کر سکا، کیا یہ بات تعجب خیز نہیں؟" محتشم نے محض یہ احساس دلانے کے لیے کہ وہ خاصا خوش اخلاق ہے یہ بات کہی تھی۔

یوں بھی ویک اینڈ سر پر تھا۔ کسی نئے جادو کا اثر امکان سے دُور تھا۔

"میں گزشتہ آٹھ سال سے اپنے بھائی بریگیڈیئر عاطف کے ساتھ اردن میں تھی اور میں ایگزام کی وجہ سے آپی کی شادی میں شریک نہیں ہو سکی تھی۔ بس یہ وجہ ہے۔" وہ لاپروائی سے ہنس دی۔

اس کے لہجے، اس کے رویے میں محتشم کی خاطر کوئی تکلف نہیں تھا۔ استغنا اس کی شخصیت کا خاصہ تھا۔

"اب تو نہیں جاؤ گی۔" بھابی نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

"ارے بھابی! آپ تو ایسے کہہ رہی ہیں جیسے میں نے جا کر کوئی غلطی کی تھی کہ اب تو نہیں کرو گی؟" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"بھابی پلیز ذرا کھانا جلدی لگوا دیجیے گا۔ مجھے ضروری کام سے جانا ہے۔" محتشم زیادہ دیر خود پر جبر نہ کر سکا، واپس اپنے کمرے میں چلا گیا۔

"بہت موڈی ہے یہ محتشم۔" رخشی نے ماحول میں توازن پیدا کیا۔

"مردوں کی اکثریت موڈی ہی ہوتی ہے کیونکہ مذکر کی صورت پیدا ہونے کی وجہ سے ان کی عظمت کے ڈنکے روزِ پیدائش سے پٹ رہے ہوتے ہیں۔ یعنی ان کا کتنا بڑا احسان ہے دنیا پر کہ یہ مذکر ہیں۔ یہ بھی اپنی اہمیت کا احساس دلانے کا انداز ہوتا ہے بھابی۔ موڈی تو بے چاری عورتیں بھی بہت ہوتی ہیں مگر انھیں بہت اور جگہ جگہ اپنا آپ کچلنا پڑتا ہے۔ قربانی دینا ہوتی ہے۔ ماحول وفضا کو قابلِ قبول رکھنے کے لیے، کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

"تمہاری آبزرویشن اچھی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم دنیا کو سرسری نہیں دیکھتیں اور غافل نہیں ہو۔ ایسی لڑکیاں گھرانوں میں توازن برقرار رکھنے کے لیے بہت ضروری ہوتی ہیں۔ جاگتا ہوا ذہن رکھنے والی، اپنے مسائل کا حل ڈھونڈنے والی خود اعتماد قسم کی لڑکیاں۔" رخشی کو اس کی سنجیدگی اچھی لگی۔

"میرا یہ مطلب تو نہیں تھا۔" فاطین جھینپ گئی۔

"آپ نے کچھ زیادہ ہی ستائش کے پہلو نہیں ڈھونڈ لیے؟ میں تو ایسے ہی کامن سی

بات کر رہی تھی۔" وہ شرمندہ سی نظر آنے لگی تھی۔ رخشی ہنس پڑیں۔

آج عباس نہیں آیا تھا۔ اس پر مستزاد وہ بھی نہیں آئی تھی۔ وہ انتہائی بددل ہو کر آفتاب صدیقی کے ساتھ اسکوائش کورٹ چلا آیا۔

مگر اسے محسوس ہوا جو سلوک وہ عباس کے ساتھ کرتا ہے وہی سلوک آفتاب صدیقی اس کے ساتھ کر رہا تھا۔ محتشم اپنا سر ہی پیٹ سکتا تھا۔ عباس کم از کم رقیب روسیاہ تو نہیں تھا۔

کافی دیر ایک دوسرے کو دھوکا دینے کے بعد وہ بددلی سے باہر آئے اور محتشم کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا یوں جیسے انتیسویں روزے کو عید کا چاند نظر آ گیا ہو۔

سفید رنگ کی ستاروں بھری ساڑھی میں وہ مجسمے کی طرح کرسی پر ایستادہ تھی۔

"آج میں معاملہ آر پار کر کے ہی رہوں گا۔"

"اس لیے کہ میں سائے کے تعاقب پر یقین نہیں رکھتا۔ میری زندگی اجیرن ہو چلی ہے۔ تمہارا گونگا ہونا تمہارا بہت بڑا عیب ہے، یہاں تو اتنے لوگ ہیں اور جو تمھیں ملتے اور جلتے ہوں گے۔ وہ محض تمھارے حسن سے چند دن بہل سکتے ہیں، نباہ نہیں سکتے۔"

"میں تمھارے اس گونگے اور خاموش حسن کی وجہ ہی سے تم پر مرمٹا ہوں۔ میں تمھیں وفا و محبت کی حقیقت سے روشناس کراؤں گا۔" وہ نہ جانے کیا انٹ شنٹ سوچتا اس کی ٹیبل کی طرف بڑھ رہا تھا۔

یہ دیکھ کر اس کی شریانوں میں جوار بھاٹا اٹھنے لگا کہ آفتاب صدیقی نیپکن سے ہاتھ پونچھتا اس کی ٹیبل کے آس پاس منڈلانے لگا تھا۔

"ہوں تو یہ بھی ان پر ہاتھ صاف کرنے کے چکر میں نظر آتے ہیں۔" وہ سلگ کر سوچنے لگا اور بے اختیار سے انداز میں اس کی ٹیبل کی طرف بڑھا۔

اور جب دو چار ہاتھ لبِ بام رہ گیا یعنی دو قدم کے فاصلے پر وہ تھی کہ مس جہاں پناہ درمیان میں آ گئیں۔ اپنی مردانہ چال اور تحکمانہ اندازِ گفتگو کی وجہ سے یہ نام محتشم ہی نے انھیں مرحمت کیا تھا۔ وگرنہ اصلی نام تو ان کا امینہ مغل تھا۔

"ارے محتشم صاحب! جسٹ اے منٹ پلیز۔"

"ہونہہ! ایک منٹ میں زلزلے سے کئی ہزار عمارتیں کر سکتی ہیں۔ ان کے لیے ایک منٹ کوئی چیز نہیں۔" محتشم کو ان کی مداخلت سخت گراں گزری۔

"کل آپ پھولوں کی نمائش میں آ رہے ہیں ناں؟ میں نے جاپان میں جو کچھ سیکھا

کل اس کا بھرپور اظہار ہوگا۔ آپ کو یاد دہانی کرا رہی ہوں۔ بھول لیے گا نہیں۔'' محتشم نے جان چھڑانے کو جلدی سے حامی بھر لی مگر چند لمحات کے لیے سوچ میں پڑ گیا کہ مس جہاں پناہ نے پہلا انوی ٹیشن کب دیا تھا جو یاد دہانی کی نوبت آئی۔

پھر ایک دم سوچ کو جیسے جھٹک کر آگے بڑھا۔

''ہیلو۔'' اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا پھر نگاہیں سامنے مرکوز کر دیں۔

''میں صرف ایک دو باتیں کر کے یہاں سے چلا جاؤں گا۔ آپ اس کلب کی ممبر ہیں۔ اس شہر کے چیدہ چیدہ بلکہ یوں کہیے کہ اس شہر کی ''کریم'' یہاں موجود ہوتی ہے۔ ہماری بات چیت کے لیے اس کلب کی ممبر شپ ہی بہت ہے۔''

''آپ نے یہ کلب جوائن کیا ہے مگر یہاں کی ایکٹوٹیز سے آپ بہت دور نظر آتی ہیں۔ ہم مذاق ممبر نہ سہی مگر ممبر تو ہیں۔ بات چیت میں کوئی حرج ہے کیا؟'' محتشم اس خوف سے وضاحتی گفتگو کرتا چلا گیا کہ کہیں وہ اٹھ کر نہ چل دے۔

سبز آنکھوں والی پُراسرار لڑکی نے اپنی پُرفسوں نگاہیں اس پر گاڑ دیں، مگر جلد ہی جھکا لیں۔ وہ ایک مرد کی پُراعتماد نگاہ کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

''کیا میں بیٹھ سکتا ہوں؟'' کم عمر دوشیزہ کی یہ ادا اسے حوصلہ افزا لگی۔

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''آپ تو واقعی پتھر ہیں۔'' محتشم کے لہجے میں شکستگی در آئی اور اس حسن جہاں تاب نے اپنے سفید سفید ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ لیے۔ گویا کہہ رہی ہو وہ کچھ سننا نہیں چاہتی۔

''مگر آپ کو آج اس طرح جانے نہیں دوں گا۔''

''ابھی آپ کا شوفر آئے گا۔ پھر تماشا دیکھیے گا۔'' محتشم نے جیسے دھمکی دی۔

''ہاں نہیں تو۔'' بندہ کم از کم کسی کی بات تو سن لے۔''

وہ ممبران کی اس ٹولی کی طرف چلا آیا جو کلب میں ''برج پارٹی'' کے عنوان سے مشہور تھی اور اپنی آج کی پرفارمنس پر گفتگو کر رہی تھی۔

''آپ دیکھیے مسز برلاس؟ مسز لالٹین والا نے اشارہ کیا۔

''کچھ دنوں میں اس کا اپائنٹمنٹ اس شہر کے بہترین سائیکاٹرسٹ سے ہونے والا ہے۔'' مس ابرار میرٹھی نے بھی جلے دل کے پھپھولے پھوڑے۔

دونوں بیگمات کے قہقہے بے ساختہ اور خاصے بلند تھے۔ بے چارہ محتشم۔

محتشم بہت اضطراب کی کیفیت میں رسٹ واچ پر نگاہ ڈال رہا تھا۔ معاً اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

اس کا شوفر آ گیا تھا۔ محتشم بجلی کی سی سرعت سے اس کی سمت بڑھا۔

''شوفر۔''

شوفر نے آواز کی سمت نگاہ دوڑائی اور محتشم کو اپنی طرف آتے دیکھ کر رک گیا۔

''یس سر۔''

''آپ اس شہر کے کس علاقے سے تشریف لائے ہیں۔'' محتشم نے کچھ تہذیب بگھار کر رام کرنا چاہا۔

''آپ یہ کیوں جاننا چاہتے ہیں سر؟'' وہ حیران سا نظر آنے لگا۔

''یہ جو وائٹ ساری میں مس بیٹھی ہیں۔ مجھے ان کے بارے میں کچھ ضروری بات چیت کرنا ہے۔ بات یہ ہے شوفر کہ یہ بے چاری تو گونگی ہیں اور ہمارے کلب کی سالانہ تقریبات کا آغاز ہونے والا ہے۔''

''ہم ان کے گارجین سے مل سکتے ہیں؟''

''لیکن سر اس بات کا جواب تو وہ خود بھی دے سکتی ہیں کیونکہ وہ سنتی تو ہیں؟''

''یہی تو سارا مسئلہ ہے کہ وہ جواب تک دینا پسند نہیں کرتیں۔'' محتشم نے دکھڑا رویا۔ ''اب دیکھیے ناں وہ ہمارے کلب کی بیوٹی کوئین ہیں۔ اگرچہ یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ صرف میں ہی نہیں کلب کا ہر ممبران سے دوستی کا خواہش مند ہوگا بلکہ......''

''معاف کیجیے سر! بس، بہت ہو چکا۔'' محتشم کو شوفر کا انداز و لہجہ شاق گزرا، مگر وہ یہاں کوئی تماشا برپا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر نوبت یہاں تک پہنچی تھی مگر وہ تیزی سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا تھا۔

خاصے فاصلے سے اس نے اس کی گاڑی کا تعاقب شروع کیا تھا۔ اس وقت اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ جب اس نے ایک موڑ پر گاڑی رکتے ہوئے دیکھی۔ محتشم نے بھی اپنی گاڑی فاصلے پر روک لی۔ وہ گونگی گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر نیچے اتری اور شوفر نے اگلا دروازہ کھول دیا۔ وہ تقریباً کھلکھلاتی ہوئی آگے بیٹھ گئی۔ محتشم حیران و ششدر دیکھ رہا تھا۔ گاڑی آگے بڑھ گئی۔ محتشم نے بھی گاڑی بڑھائی۔

کافی فاصلہ طے کر کے اور امرا کی مشہور بستی میں پہنچ گئے۔ چند بلاک کے موڑ

موڑنے کے بعد ایک کوٹھی کے سامنے گاڑی رک گئی۔ محتشم کو یہ راستہ جانا پہچانا لگا جہاں وہ ایک آدھ بار آ چکا تھا۔ محتشم نے بھی فاصلے پر گاڑی روک دی تھی۔

شوفر نے زور سے ہارن بجایا۔ چند لمحوں بعد گیٹ وا ہو گیا۔ گونگی گاڑی اندر جانے سے پہلے ہی دروازہ کھول کر اتر گئی تھی۔ محتشم ٹکٹکی باندھے بدستور سامنے دیکھ رہا تھا اور اس لمحے تو وہ چکراتے چکراتے رہ گیا جب بھرپور ہنسی کے ساتھ اس نے فاطین کو گیٹ میں ایستادہ دیکھا۔ وہ یہاں پہلے بھی آ چکا ہے اور کیوں آ چکا ہے۔ ظاہر ہے بھائی کی سسرال میں داخلہ ممنوع نہیں ہوتا۔ گونگی مسکراتی ہوئی اس کے ساتھ اندر چلی گئی۔

محتشم چند ثانیے حیران پریشان کھڑا رہا۔ پھر جیسے ہوش میں آ کر پوری رفتار سے گاڑی بڑھا لے گیا۔

اسے وہ راستہ ازبر تھا، وہاں تو قرابت داری نکل آئی تھی مگر فاطین سے گونگی کا کیا رشتہ تھا؟ کیا کیا جائے کہ اس دن کے بعد وہ گونگی کلب ہی میں نہیں آئی تھی۔

دو ویک اینڈ کے تکلیف دہ انتظار کے بعد وہ حالت جنوں میں پھر اس راستے پر آ گیا تھا۔ آج وہ قطعی فیصلہ کر کے آیا تھا۔ وہ جانتا تھا اس کی مڈبھیڑ فاطین سے ہی ہو گی۔ وہ اسی ادارے سے آیا تھا، انتہائی بے تابی سے کال بیل بجائی تھی۔

چوکیدار نے گیٹ کھولا تو اس نے دیکھا کہ پورچ میں وہی شوفر گاڑی پر بہت دل و جان سے کپڑا پھیر رہا تھا۔ گونگی اس کے قریب کھڑی تھی۔ اونچی سی شلوار اور گھاگھرا نما لمبی سی فراک پہنے۔ دونوں کی نگاہ ایک ساتھ محتشم پر پڑی شوفر تیزی سے اس کی سمت آیا۔ اس کی آنکھوں میں تحیر تھا۔

"یس سر؟" وہ قریب آ کر گویا ہوا۔ گونگی اندر بھاگ گئی تھی۔

"یہ، یہ، کیا......" محتشم کو کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

"آپ کو کس سے ملنا ہے سر؟" شوفر انتہائی ادب سے پوچھ رہا تھا۔

"مجھے اس لڑکی کے گارجین سے ملنا ہے۔" وہ بدقت تمام گویا ہوا۔ فاطین کا نام مصلحتاً نہیں لیا۔

"تو پھر ملیے۔ میں ہوں اس کا گارجین۔" شوفر اطمینان سے بولا۔

"ہائیں۔" محتشم ہونق ہو کر اس کی شکل دیکھنے لگا۔

"یہ، یہ......کون ہے؟" اب اسے کچھ تو بولنا تھا۔

"میری بیوی ہے سر۔" وہ پُرسکون انداز میں گویا ہوا۔ بھک سے جیسے محتشم کی ہستی فضا میں بکھر گئی تھی۔

"میں کرنل صاحب کا شوفر ہوں سر اور یہ میری بیوی ہے۔ میں سمجھ رہا ہوں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔"

"سر! یہ ہماری مس کی شرارت تھی اور کچھ بھی نہیں۔"

"سر! یہ آزاد علاقے کی لڑکی ہے۔ میں پشاور کا رہنے والا ہوں۔ پچھلے برس دس ہزار روپیہ لے کر اپنے گاؤں گیا تو میرے دوستوں نے سیر کا پروگرام بنایا۔ ہم آزاد علاقے کی طرف نکل گئے۔ وہاں یہ ہوا کہ ایک گھرانے سے کچھ علیک سلیک ہوئی۔ وہیں میں نے پلوشے کو دیکھا۔ پتا چلا اس کی شادی ہو رہی ہے۔ ایک ستر سال کا بوڑھا پانچ ہزار دے رہا تھا اس لیے مجھے اس لڑکی پر بہت ترس آیا۔ میں نے اس کے باپ کو دس ہزار دے کر شادی کر لی، مگر اپنے گھر والوں کی ناراضگی مول لے کر میں اس کو سیدھا کراچی لے کر آ گیا۔"

ہماری بیگم صاحبہ ایک ویمن کلب کی ممبر تھیں۔ میں ان کو کلب لے جایا کرتا تھا۔ ایک روز پلوشے کہنے لگی کہ اس کا دل کرتا ہے وہ بھی بیگم صاحبہ کی طرح کپڑے پہنے، گھومے پھرے۔ ہماری مس صاحبہ نے شرارت کر ڈالی۔ وہ بہت اچھی ہیں۔ میں نے پلوشے کی بات ان کو بتائی تھی۔ مس صاحبہ کچھ ہی دن ہوئے پاکستان آئی ہیں۔ پہلے وہ اپنے بھائی کے پاس اردن میں رہا کرتی تھیں۔

مجھ سے کہنے لگیں کریم خان میں تمہاری معصوم بیوی کی خواہش پوری کر سکتی ہوں اور تمھیں دکھا سکتی ہوں کہ تمہاری بیوی کتنی اہم ہستی ہے اس شہر کی۔ تم ایک خزانے کے مالک ہو۔ میں نے ان کو منع بھی کیا تھا۔ پلوشے بھی ضد کرنے لگی۔ مس صاحبہ کہنے لگیں چند دنوں کی بات ہے۔ کچھ بھی نہیں ہو گا۔ ہم دلچسپ شرارت کریں گے اور پلوشے خوش ہو جائے گی۔"

"میں راضی ہو گیا۔ سر بات یہ ہے کہ ہماری مس صاحبہ بہت اچھی ہیں۔ انھوں نے ذمہ داری لی تھی۔ انھوں نے ہی پلوشے کو ممبر شپ دلائی۔ پلوشے ان کے ہی کپڑے پہنتی تھی۔ ہم تو غریب لوگ ہیں سر۔ بس اتنی سی بات ہے سر۔" محتشم گنگ سا کھڑا رہ گیا تھا۔

"یہ بہت خطرناک شرارت تھی شوفر۔" وہ جیسے کنوئیں سے بول رہا تھا۔

"سر میں انسان کا بچہ ہوں۔ آپ کو دیکھ کر بات سمجھ گیا تھا۔ پھر پلوشے بھی مجھے بتاتی تھی اور آپ ہی کی وجہ سے میں نے مس صاحبہ کو کہہ دیا تھا کہ اب پلوشے کلب نہیں جائے گی۔

آپ یہاں کیسے پہنچ گئے سر؟" کریم خان کو اچانک یاد آیا۔

محتشم کو شوفر کے تحمل نے از حد متاثر کیا۔

''بس ایسے ہی۔'' وہ کھسیانی مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوا۔ ''سوری شوفر۔'' وہ شرمندہ نظر آیا۔

''کوئی بات نہیں سر۔ جو کچھ ہوا اس میں حیرت کی بات نہیں۔'' وہ سمجھ دار تھا۔ ''سر میری بیوی گونگی نہیں ہے۔ مس صاحبہ نے اسے گونگی بنایا تھا۔ اب دیکھیں نا سر بات کرنا تو اسے آتی نہیں۔''

''آں...... ہاں...... اچھا میں چلتا ہوں۔'' وہ چونک سا گیا۔

''کریم خاناں، یہ وہی ہے یہ ادھر بھی آ گئی بیڑا غرق۔ اجی۔ ام مس صاحبہ کو بلانا اے۔''

پھول سے آگ نکلنے لگی۔ فاطین سے سامنا کرنے کے خیال سے ہی محتشم کانپ گیا۔

''تم نے بھی اپنی ضد کا انجام دیکھ لیا۔ کان پکڑو۔'' کریم خان اپنی بیوی سے مذاق کرنے لگا۔

''ام مٹی سے ناک لگاتا اے بابا۔'' وہ قہر آلود نگاہوں سے محتشم کو دیکھنے لگی۔

''اس کی عمر بہت چھوٹی ہے سر، اس لیے اس کی ضد نے مجبور کر دیا تھا، ورنہ یہ کوئی اچھا مذاق تو نہیں ہے۔ مجھے احساس ہے۔''

''محتشم تو وہاں سے یوں نکلا جیسے اس کے پیچھے بھوت لگے ہوں۔ وہ شکر منا رہا تھا کہ کریم خان سلجھا ہوا مرد تھا۔ وگرنہ اس کی خیریت نہیں تھی۔

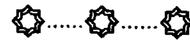
''اب میں تمھیں سمجھوں گا فاطین۔'' محتشم نے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ ''تمھیں نکو بنایا اسی شوفر کے سامنے۔'' چوکیدار حیران و پریشان سا کبھی اسے کبھی دونوں میاں بیوی کو دیکھنے لگتا تھا۔ وہ اسے نظر انداز کرتا ہوا گاڑی کی طرف بڑھ گیا تھا۔

''اب یقیناً کرنل صاحب سے جلد شرف بازیابی حاصل کرنا ہوگا۔'' وہ اگلے منصوبے کے تحت گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

اسے اپنے کانوں میں رخشی بھابی کی شریر آواز گونجتی محسوس ہوئی۔

''اب خدا کے لیے شادی کر لو محتشم۔ تمھارے بچے ایک پنشنر کی اولاد ہونا پسند نہیں کریں گے۔ کم از کم اپنے ہونے والے بچوں ہی کا خیال کر لو۔''

اسے محسوس ہوا جیسے گاڑی کی بیک سیٹ پر تین چار بچے دھما چوکڑی مچا رہے ہوں اور فاطین اگلی سیٹ پر گردن موڑے انھیں آرام سے بیٹھنے کی تاکید کر رہی ہو۔



پھوپھی جان

پھوپھی جان کو خدا نے سات عدد بیٹیاں دے کر گویا دیگر خاندان کی ہمہ صفت لڑکیوں کے حقوق غصب کرنے کا ٹھیکہ دے دیا تھا۔ میں یوں نہیں کہ خاندان بھر میں یکتا و لاثانی تھی مگر شاید شخصی کشش مجھے خدا نے وافر عطا کی تھی۔ بدقسمتی سے پھوپھی جان کے نزدیک بھی رہتی تھی۔ ایک بات واضح کر دوں کہ یہ میری سگی پھوپھی نہیں ہیں بلکہ ابا جی کی قریبی کزن ہوتی ہیں۔

میں تینتیس برس کی لڑکی ہوں۔ میرے آرزوؤں کے دن بھابھیوں کے ڈھیر میں اور راتیں کلستے، رُوتے گزر رہی ہیں۔ نکھری رنگت ہے مناسب قد و قامت، اعلیٰ تعلیمی ڈگری کی حامل خدمت گزار، مقفل لب خاموش تماشائی۔ مگر ناشکری ہوں۔ میرا وجود عورت پن کے احساس سے خالی ہے۔ میں شوہر کی سنگت، بچوں کی کلکاریوں سے محروم، خدا کی مکمل اور مخلوق کی نگاہ میں نامکمل ہوں۔

اب میں ضبط کے اس دور سے گزر رہی ہوں جہاں بار ہا ماتھا پیٹ کر رونے کو جی چاہتا ہے۔ دیوار سے سر ٹیک کر تڑپ تڑپ کر رونے کو جی چاہتا ہے، سر میں خاک ڈال کر گلیوں میں پھرنے کو جی چاہتا ہے۔

اس لیے نہیں کہ مجھے شوہر نصیب نہیں ہوا۔ اس لیے نہیں کہ میں تخلیق کے کرب سے محروم ہوں اس لیے کہ میرے کانوں کے پردے تار تار ہو چکے ہیں، اس لیے کہ میں خودداری اور کھڑی ناک سے جینے کے قابل نہیں ہوں۔ مجھ میں کسی چیز کی کمی نہ ہونے کے باوجود مجھے شرمسار ہو کر جینا پڑ رہا ہے اس لیے کہ میں چودہ زیورات کے سیٹ جو میرے پاس ہیں استعمال کرنے کے مواقع سے محروم ہوں...... کہ محافل سے مجتنب ہوں کہ وہاں مری انا و وقار کو ٹھیس لگتی ہے۔

''ہائے ہائے۔ بے چاری کی قسمت۔ کیا کمی تھی بھلا؟''

''اس کے ساتھ کی بچیاں مدتوں پہلے بیاہی گئیں خیر سے ان کے بچے بھی بڑے ہو رہے ہیں۔''

"ہائے کرموں جلی، سات بھائیوں کی اکلوتی بہن، نہ پہننے کی کمی نہ کھانے کی۔"

"آہ......ہا......"

"او......ہو......"

"ہائے......ہائے......"

خواب سجاتے سجاتے تھک گئی......

سرہانے موتیا سجاتے سجاتے تھک گئی۔

اپنے نفس سے لڑتے لڑتے ہار گئی۔

اونچے سر سے جینے کی تمنا کرتے کرتے ہار گئی۔

اب اپنے آپ کو سزا دینے کو جی چاہتا ہے۔

اپنی روح کو سُلگتے کوئلوں پر ڈال دینے کو جی چاہتا ہے۔

جب میں تڑپ تڑپ کر رونے کا پروگرام بناتی ہوں۔ میری ماں...... پیاری ماں......سادہ ماں روغن بادام کی شیشی ہاتھ میں لیے آ جاتی ہے۔

"لا چندا۔ تیرا چہرہ کہہ رہا ہے تیرا سر دُکھ رہا ہے۔ لا مالش کر دوں۔"

"ہائے...... تجھے وجدان ہوتا ہے، تجھے الہام ہوتا ہے۔ ماں...... ماں...... کہ تیری بیٹی...... آج گریہ کرے گی۔ شب گریہ منائے گی ہاں ماں۔ تو نعمت ہے۔" میں بال کھول کر گھٹنوں کے گرد ہاتھ باندھ کر بیٹھ جاتی ہوں۔ میری ماں کے ٹھنڈے بوڑھے ہاتھ میرے سر پر حرکت کرنے لگتے ہیں۔ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ میں سسکیاں دبانے لگتی ہوں۔ یہ کیسا راز ہے جو ماں پر بھی آشکارا نہیں کیا جا سکتا؟

پھر مجھے غنودگی آنے لگتی ہے۔ میں ماں کی طرف پشت کیے بستر پر آ جاتی ہوں۔ سو جاتی ہوں۔

........................

میری ذہانت اور اعلیٰ تعلیمی ریکارڈ میری بدقسمتی کا دورِ آغاز بن گیا۔ خاندان کے تمام پڑھے لکھے لوگ مجھے سراہتے تھے۔ حتیٰ کہ پھوپھی جان بھی۔ کسی نے بھی کیا میں نے بھی کبھی محسوس نہیں کیا کہ میری تعریفوں سے پھوپھی جان پر کیا گزرنے لگی ہے وہ ہمیشہ تعریف کرتی زبانوں کے بیچ میں حسد ماری آواز نکالتیں۔ "اے بھائی نصر اللہ کتنا پڑھالو گے بیٹی کو کرنا وہی

ہانڈی چولہا۔"

"ہاں بہن! میں جانتا ہوں مگر جاہلوں کے ہانڈی چولہے میں اور پڑھی لکھی عورت کے ہانڈی چولہے میں بھی بڑا فرق ہوتا ہے۔" ابا جی لیاقت سے لفظوں کی مالا گوندھتے۔

میں پھولی پھولی فراکوں اور ننگی ٹانگوں کے دور سے نکل کر شلوار قمیض میں آ گئی۔ تعریفیں سوا تر ہو گئیں بقول امی کے بڑی ہونہار بیٹی ہے۔

پھر میرے بے ترتیب دوپٹے کو سنبھلنا آ گیا۔ تعریفیں مزید بڑھیں محض ایک اچھی طالبہ ہی نہیں تھی ایک ہونہار گھریلو لڑکی بھی تھی۔

میرا میٹرک کا رزلٹ بھی نہ نکلا تھا کہ شادی کی تقریب میں موضوعِ گفتگو بن گئی۔ میری پھوپھی جان کی نند اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر آ گئیں۔ میں محض پندرہ برس کی تھی۔ رشتہ تو میری کم عمری کے سبب واپس کر دیا گیا۔ مگر پھوپھی جان کو چوکنا کر گیا ان کی دو بڑی بیٹیاں تھیں۔ مجھ سے ہزار درجے خوبصورت پانچ مجھ سے چھوٹی تھیں مگر وہ کم نہ تھیں۔

میں انٹر میں تھی کہ میرا رشتہ دور کے رشتہ داروں سے آیا۔ جانے کس طرح خبر پھیلی کہ پھوپھی جان صبح ہی آ دھمکیں۔

"اے بھابی! تمھیں کبھی بھابی نہ سمجھا بہن ہی جانا۔ تم ہی کچھ دھیان کرو۔ آخر میری نور جہاں چندا سے بڑی ہے تمہاری بیٹی کی جگہ ہے چندا کی عمر تو ابھی کچھ نہیں ہے اس جگہ نور جہاں کی ہو جائے۔"

"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں؟ ہمیں تو ابھی جلدی بھی نہیں......" امی نے صاف دلی و خلوص سے کہا۔

میں عجب لا ابالی سی تھی مجھے ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا کہ یہ بڑوں کے جھگڑے ہیں وہ جانیں۔

مگر یہ بہرحال میرے نوٹس میں تھا۔ اپنی شادی کا سن کر عجیب سے تاثرات ہو جاتے میرے۔ خود بخود شرم آ جاتی تھی۔ دلہنیں بہت اچھی لگتی تھیں مگر نتھ، بندیا پہن کر مرکز توجہ بننے کا جنون بھی نہیں تھا۔

میں پانچ بھائیوں سے چھوٹی اور دو بھائیوں سے بڑی ہوں۔

پھر ایسا ہوا کہ میرے شاندار اٹھان والے بھائی دنیا کی نظروں میں آ گئے۔ آئے

دن گھر میں شادی بیاہ کی باتیں ہونے لگیں۔ مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ پھوپھی جان اپنا کام کر چکی ہیں...... امی جان نے سرور جہاں کا رشتہ بھی مانگ لیا۔ میرے بھیا اس غضب کے حسین تھے، پہن اوڑھ کر تو نظروں میں نہ سماتے تھے۔ سرور جہاں خوبصورت تھی مگر اس میں بلا کی شخصی کشش نہیں تھی، بے تکا لباس، بے سوچے سمجھے گفتگو کرنا، باتیں کرنے کی شوقین توے پر سے روٹی جلا کر اتارتی تھی۔ میں ایک حساس اور نفیس لڑکی ہوں۔ میرے ذہن میں تو ایک آئیڈیل بھابی کا بسیرا تھا۔ مگر پھوپھی جان کو کائنات سے خوشیاں سمیٹنے کا ہنر آتا ہے۔ جو لوگ نفس مار کر خوشیاں سمیٹنے کے قابل نہیں ہوتے وہ ہاتھ مار کر خوشیاں سمیٹتے ہیں۔ سرور جہاں آخر کار ہمارے گھر کی بڑی بہو بن کر آ گئی۔ وہ تو امی اور میں چالو مشین ہیں اس لیے اس کی پول نہ کھل پائی۔

پھوپھی جان تو حور جہاں کو بھی ہمارے در پر پٹخنے کے درپے تھیں۔ اب امی اتنی بھی نادان نہ تھیں انھوں نے سرور جہاں سے ہی بہت سُرور لے لیا تھا۔

پھوپھی جان امی کے ساتھ رہا کرتی تھیں ان سے کرید کرید کر میرے متعلق پوچھا کرتیں کہ کہیں رشتہ تو نہیں ہو رہا۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر نیم خواندہ لوگ میرے لیے منتخب کرتی تھیں اس سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ اپنی بیٹیوں کو بہت اعلیٰ اور ارفع مقام پر دیکھنا چاہتی ہیں جس طرح بعض لوگ پیدائشی طور پر مخصوص رجحان رکھتے ہیں، انھیں میں ایک حسد ہے اور یہ وہ ناگ ہے جو عرصے سے میری آستین میں پھنکار رہا ہے اسی حسد کا ناگ۔ حاسد کی اپنی زندگی میں سکون نہیں ہوتا۔ اس کا تخریبی ذہن ہمہ وقت جوڑ توڑ میں مصروف رہتا ہے۔

میں آج اس عمر میں نہیں بہت عرصے پہلے پہچان چکی ہوں۔ پھوپھی جان کو۔ میری امی بہت بھولی ہیں۔ محبتوں میں بہہ جاتی ہیں۔ پھوپھی جان کی خودنمائی کی تمنا نے خون نہیں سیاہ حسد کا زہر بھر دیا ہے۔ مجھے ان سے نفرت نہیں ہمدردی ہے کہ خدا توکل خدا خوفی سے ہوتا ہے۔
دوسروں کی ہمہ وقت غیبت و برائی سے دل سیاہ پڑ جاتا ہے، سفاک ہو جاتا ہے۔
خدا خوفی ہو تو عیب جوئی نہیں رہتی۔ خدا پر اعتماد ہو تو کسی کا حق نہیں مارا جاتا، چھین لینے کی تمنا نہیں ہوتی۔

میں نماز کی عادی ہوں اس لیے صبر کی عادی ہوں...... میں نے ہمیشہ یہی سوچا خدا اگر بھلائی کرنا چاہے تو اس کو کون روک سکتا ہے؟ اگر میرے حوصلے جواب دینے لگے ہیں اگر اب میں کھلم کھلا ناگواری کا اظہار کرنے لگی ہوں کہ میرے بھی سینے میں دھڑکتا ہوا دل ہے۔

میں بھی ارمانوں کی چتا میں جلتی ہوں، میرا بھی دل سنورنے کو چاہتا ہے، میرا بھی دل محفلوں میں دل سے ہنسنے کو چاہتا ہے، میرا بھی دل چاہتا ہے لوگ مجھے دیکھیں۔ حسد سے نہیں، ہمدردی سے نہیں، ترس کھا کر نہیں، رشک سے دیکھیں۔ مسکرا کر دیکھیں۔

میں اپنی ہم عمر لڑکیوں کی طرح باتیں کروں کہ ساڑھی میں نے میاں کی پسند سے باندھی ہے۔

ان کی چپاتیاں میں اپنے ہاتھ سے ڈالتی ہوں۔ وہ مجھے فلاں بات پر ڈانٹتے ہیں وہ میری فلاں بات پسند کرتے ہیں۔ میرا بیٹا بہت ذہین ہے اپنے باپ کی طرح ہمیشہ فرسٹ آتا ہے۔ میری بیٹی بہت پیاری ہے۔ میں بہت دوراندیش ہوں، بیٹی کے لیے انشورنس پالیسی لے لی ہے۔ میری بھی اپنی ساس سے کبھی کبھار "تو تو آپ آپ" ہو جاتی ہے۔ میرے وہ...... میرے وہ۔

پھر میں رو پڑتی ہوں کہ جسے موت نہ مار سکے اسے نشانے لگا لگا کر طعنے مارو۔ میں لوگوں کے طعنوں سے آہستہ آہستہ مر رہی ہوں۔ آہستہ آہستہ میرے گھر میں بھابیوں کا ڈھیر ہو گیا ہے۔ میرے دو بھائی باہر ہیں۔ ہر بھائی کی شادی پر سونے کا سیٹ بنتا ہے۔ پانچ بھائیوں کی شادی ہو چکی ہے میرے پاس سونے کی چوڑیاں اتنی ہیں کہ دونوں کلائیاں بھر کر بھی بچ رہی ہیں۔

میں وہمی بھی ہو گئی ہوں۔ ہیرا نہیں پہنتی۔ نیلم نہیں پہنتی۔ زمرد نہیں پہنتی کہ شاید مجھے راس نہیں۔ عقیق پتھر کی انگوٹھی پہنے رہتی ہوں کہ یہ پتھر بہادر بناتا ہے، حوصلہ مند بناتا ہے اور اسی چیز کی مجھے زیادہ ضرورت ہے۔

آپ کو ایک واقعہ اور سناتی چلوں:

اس وقت میں اٹھارہ برس کی تھی بی۔ اے فائنل میں۔ ہمارے چچا زاد بھائی آفس کے کسی کام کے سلسلے میں ملتان آئے تو ہمارے ہاں قیام کیا۔

ہم کوئی دقیانوسی لوگ نہیں ہیں اور پھر وہ فرسٹ کزن بھی تھے میں باتیں وغیرہ بھی کر لیتی تھی۔ ہمارے ابا جی فریج کا پانی نہیں پیتے ان کا گلا خراب ہو جاتا ہے تو ہمارے خوبصورت برآمدے میں دو گھڑے بھی رکھے ہوئے ہیں۔ میں گرمیوں میں موتیا کے گجرے گھڑوں پر لپیٹ دیتی ہوں پورا برآمدہ مہک جاتا ہے۔

اس روز میں نے گجرے بناتے بناتے کچھ پھولوں کو ملا جلا کر گلدستہ بنایا اور از راہِ

مہمان نوازی مہمان کے کمرے میں بھی سجانے چلی آئی۔ انتصار باتھ روم میں تھے۔ شاید میں نے گلدان سجایا جونہی پلٹی انھیں انتہائی انہماک سے اپنی جانب دیکھتا پا کر نروس ہوگئی۔ خدا جانے کیا خصوصیت آ گئی تھی ان آنکھوں میں کہ مجھے حیا سی آ گئی۔

''جی...... یہ پھول ہیں......؟'' میں گڑبڑائی۔

''میں نے کب کہا کہ ڈھول ہیں۔'' شوخی سے جواب ملا۔ میں گھبرا کر چلی آئی۔

امی جی، ابا جی اور میں ہمیشہ گرمیوں میں کھلی چھت پر سوتے ہیں۔ میں سرِشام ہی چھت پر بستر کر آتی ہوں۔ آج بھی میں حسبِ معمول چھت پر آئی تو انتصار ایک پلنگ بچھا کر ایک کتاب لے کر لیٹے ہوئے تھے۔

میں نے آہستگی سے اپنا کام جاری رکھا اور شیڈ میں کھڑے نواڑی پلنگ اٹھا اٹھا کر درمیان میں لانے لگی...... انتصار اٹھ کھڑے ہوئے۔

''ارے بھئی مجھے کہہ دیتیں۔''

''یہ تو میری روزانہ کی ڈیوٹی ہے۔'' میں نے بے نیازی سے کہا اور بستر لگانے لگی۔

جونہی چادر جھٹک کر بستر پر پھیلائی انتصار نے دو کونے تھام لیے اور بچھوانے لگے، مجھے عجیب سا لگا تھا۔ ابا جی کا سفید تکیہ سرہانے رکھ کر دوسرے پلنگ کے لیے انھوں نے چادر اٹھا لی اور بچھانے لگے تب میں نے دو کونے تھام لیے اور بچھوانے لگی۔ یہ سب برجستہ و بے ساختہ تھا۔ مگر میں آتے ہوئے پلٹ کر نہ دیکھ سکی۔ کھلی چھت پر مجھے پسینہ آ رہا تھا۔

جذبے تو خاموشی کی سیڑھی پر چڑھتے ہیں، جب آواز جاگتی ہے تو یہ نیند لیتے ہیں۔

پھر میں انتصار سے بہت کترائی۔

سرور جہاں بھابھی تو بھائی جان کے پاس سعودی عرب میں تھیں مگر پھوپھی جان اسی دم خم سے آتی تھیں انتصار کو بہت بہت بلا جاتی تھیں مگر جانے کیوں وہ وہاں رکتے نہیں تھے۔

ایک روز پھوپھی جان آئی ہوئی تھیں کہ انتصار ایک قمیص ہاتھ میں لے کر آ گئے۔

''چندا...... ذرا یہ بٹن تو لگا دو۔'' میں نے ان کے ہاتھ سے قمیص لے لی، ساتھ ہی پھوپھی جان کا کلیجہ بھی۔

جاتے ہوئے وہ انتصار کو اپنے ساتھ لے گئیں۔ ساتھ ہی میرا مقدر اور میرا سکھ بھی۔

پھر انتصار کا تمام وقت ان کے ہاں گزرنے لگا۔ آخر ایک دن خاموشی سے کراچی

سدھار گئے۔ میں الجھنوں میں نہیں تھی۔ سب سمجھتی تھی اسی لیے جب انتصار کا پیغام پھوپھی جان کی نمبر چار بیٹی منظور جہاں کے لیے آیا تو مجھے حیرت نہیں ہوئی۔ منظور جہاں اب جہاں کو منظور تھی یا نہ تھی انتصار کو منظور تھی۔ منظور جہاں مجھ سے سال بھر چھوٹی تھی۔

میرا اپنا گھر سکھ کا گہوارہ تھا ملال جلد ہی مٹ گیا۔ میں نے بڑے اہتمام سے شادی میں شرکت کی...... انتصار سے نیگ جوتا چھپائی جی بھر کر لی۔

میں بائیس برس کی ہوئی تو امی اور ابا جی کو فکر لاحق ہوئی اور اس وقت میں سر پیٹ کر رہ گئی جب اس بات کا تذکرہ پھوپھی جان سے کیا گیا۔ انھوں نے مجھے چمکار کر گلے سے لگا لیا۔

''اے ہاں...... میری لاڈو پری کو رشتوں کی کیا کمی۔ خواہ مخواہ ہی فکر کر لیتے ہیں آپ لوگ۔ اس کا ڈولا تو شان سے نکلے گا۔ میری چندا۔ میری بچی۔'' میں نے بمشکل مکر جال باتوں اور بانہوں سے پیچھا چھڑایا۔

اس مرتبہ میرا رشتہ منجھلی بھابھی کے رشتہ داروں میں سے آیا۔ وہ لوگ مسلسل کئی دن آتے رہے...... پھوپھی جان بھی شریک رہیں۔

''اے ہاں۔ یہ چندا تو میری مسرور جہاں کی ہم عمر ہے، دو بچوں کی ماں ہے میری مسرور جہاں۔'' باتیں تو پھوپھی جان کو ایسی لچھے دار آتی ہیں کہ سب بے ساختہ ان کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ ''میری پانچویں بچی چندا سے دو برس چھوٹی ہے اے بڑی بھولی ہے۔ حسن تو بچیوں میں بہت۔ اللہ ماری جانے کس پر گئی ہیں۔ میں بھی یونہی واجبی سی شکل کی، باوا الگ کم شکل بچیاں خدا معلوم کس پر گئی ہیں۔ اے میری چھوٹی بیٹی کو تو چندا کی شادی کا بہت ارمان ہے۔ خوب کپڑے بناتی رہتی ہے۔ میں تو ٹوک دیتی ہوں کہ آخر ماں کا کلیجہ ہے کہ نامراد ایسے اچھے کپڑے نہ پہنا کر کسی کی نظر کھا جائے گی۔ کام کاج میں تو یہ میری بچی ساری بہنوں سے آگے ہے۔ مشکور جہاں باوا نے بڑے دل سے نام رکھا تھا میری بچی کا۔ اے بہن کبھی ہمارے ہاں بھی آیئے......'' انھوں نے لہجے میں مٹھاس بھر کر کہا۔

اور پھر وہ لوگ دوبارہ پلٹ کر ہمارے گھر نہ آئے۔ شاید اس لیے کہ اگر مسرور جہاں دو بچوں کی ماں اور میری ہم عمر ہے تو جانے میری عمر کیا ہوگی۔ یا پھر اس لیے مشکور جہاں اپنی ماں کے بقول ہم صفت تھی۔ اور یوں مشکور جہاں بھی نمٹ گئی۔

مگر اس مرتبہ ابا جی کو بہت تاؤ آیا کیونکہ اب وہ میرے مسئلے میں بے حد سنجیدہ ہو

چکے تھے۔

"یہ سعیدہ نے کیا کھیل شروع کر رکھا ہے۔ ایک رشتہ ہمارے گھر سے یوں لے گئی تھیں کہ نور جہاں چندا سے بڑی ہے اس کا حق بھی ہے اور عمر بھی۔ مگر اب کیا ہو رہا ہے؟ لگتا ہے سعیدہ ہمارے ساتھ پرخلوص نہیں ہے۔ اسے صرف اپنی بیٹیوں کی فکر ہے بلکہ وہ چالیں چل رہی ہے۔"

"اے توبہ کریں خاں صاحب! کیوں بہن کو برا بھلا کہہ رہے ہیں وہ تو بے چاری خود اتنی فکر کرتی ہے...... اتنی مخلص ہے۔ یہ تو نصیب کی بات ہے۔" امی پھوپھی جان سے مسحور تھیں ابا جان کو ٹھنڈا کر دیا۔

مشرقی شرم و حیا نے کبھی مجھے ماں سے کہنے نہ دیا کہ ماں! دنیا وہ تو نہیں جو نظر آتی ہے۔ آنکھیں کھولو ماں کچھ سوچو۔ دیکھو۔ مگر مجھے خدا کا فرمان یاد آتا ہے کہ وہ فرماتا ہے خدا جس کا بھلا کرنا چاہے تو کوئی اسے روکنے والا نہیں اور اگر خدا کسی کو تباہ کرنا چاہے تو کون ہے جو اسے روک سکتا ہے۔ میں چپ سادھے رہتی۔

بھابیاں اپنے میں مگن رہتی تھیں اور کوئی دنیا میں بیس بائیس سال عمر کی لڑکیوں کی کمی ہے جو مجھ پچیس سالہ کو کوئی گھاس ڈالتا یا پھر اس شہر میں میں واحد لڑکی تھی کہ ہر لڑکے والا ادھر ہی آتا۔ جنھیں آنا تھا آ چکے تھے۔

جمعہ کا دن تھا مہمان آئے ہوئے تھے پھوپھی جان کے گھر والے بھی تھے پھوپھی جان سمیت میں بعد نماز ظہر صلوٰۃ التسبیح سے فارغ ہو کر درود شریف پڑھ رہی تھی۔ جمعہ کے لیے یہ میرا خاص اہتمام ہوتا ہے۔ پھوپھی جان جھانک کر چلی گئیں۔ میں فارغ ہو کر باہر آئی تو عجیب سے لہجے میں بولیں۔

"اے بٹیا کیا وظیفہ کر رہی تھیں اتنی دیر تک؟"

"جی ہاں۔ برائے دشمن و بلا ارض و سموات۔" میں نے تیکھے لہجے میں جواب دیا تو گڑبڑا کر اپنا برقع تہہ کرنے لگیں۔ منجھلی بھابی نے گھور کر مجھے دیکھا پھر جانے کیوں مسکرا دیں۔

میں کچن میں چائے بنانے آ گئی تو پھوپھی جان کی آٹھ سالہ مخمور جہاں بھی وہیں آ گئی اور باتیں کرنے لگی۔

"بے بی آپا (منظور جہاں) آئی ہوئی ہیں۔ بہت لڑتے ہیں انتصار بھائی ان سے

امی کہہ رہی تھیں آئے تو ٹھیک کر دوں گی۔" میں چونک گئی۔

"بے بی آپا کہہ رہی تھیں جب تک میرے پاؤں نہیں پڑیں گے میں نہیں جاؤں گی، بڑے گندے ہیں انتصار بھائی بے بی آپا کو جاہل، پھوہڑ اور بدتمیز کہتے ہیں۔ خود تو بڑے تمیز دار ہیں جیسے۔" مخمور جہاں نے منہ بنایا۔

میری نگاہوں میں انتصار کا نفیس سراپا اور منظور جہاں کا بے ڈول جسمانی جغرافیہ اور بے ڈھب انداز گھوم گئے۔

"اگر ایسا ہو رہا ہے تو کوئی حیرانی کی بات نہیں......" میں نے سوچا۔

پھوپھی جان چلی گئیں امی کو مشورہ دے کر کہ لڑکی کی عمر نکلی چکی ہے۔ کسی رنڈوے، دوہاجو سے بیاہ کر اللہ اللہ کرو۔

ابا جی اور بھائیوں کو تو پتنگے لگے۔

"خبردار! سعیدہ سے کہنا آئندہ ایسی بات نہ کرے۔ ہم جانتے بوجھتے بیٹی کو کنوئیں میں دھکا دے دیں۔ کوئی بھاری نہیں ہے ہمیں اپنی بیٹی، تعلیم یافتہ ہے زندگی گزارنے کا سلیقہ ہے اس کے پاس۔ سعیدہ کو تو دشمنی ہے شاید چندا سے۔"

"اے توبہ! کیا کہہ دیا آخر اس نے ہمدردی میں کہہ جاتی ہے شامت ماری؟" امی بولیں۔

"تم چپ کرو جی۔" اب ابا جی برہمی سے بولے......" کھلی آنکھوں سے مکھی نگلتی ہو۔ جس نے چندا کے رشتے کا قصد کیا سعیدہ نے وہیں اپنی بیٹی بیاہی زبردستی۔ میں اللہ کے بھروسے پر خاموش رہا۔ زمانہ دیکھا ہے میں نے۔ سعیدہ سے کہنا خیریت اسی میں ہے کہ وہ ہمارے معاملات میں مداخلت نہ کرے۔" ابا جی کے غصے پر امی چپ ہو رہی تھیں۔

........................

میں چندا تھی۔ کیسا چندا؟ جو اماوس میں چکراتا پھر رہا تھا اور جبکہ اب میں نے انتظار ختم کر دیا تھا۔

اپنا آپ حالات کے سپرد کر دیا تھا۔

شوریدہ سر لہر کی طرح بھنور...... سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔

تب ایک روز گھر میں کچھ ہلچل سی مچی صرف مردانے میں۔

تیسرے روز ایک مختصر سی بارات آئی تھی۔

ابا جی نے سارا کام بالا بالا طے کر دیا تھا۔

صبح وہ خود خاص خاص گھروں میں دعوت دے آئے تھے۔

پھوپھی جان ہانپتی کانپتی آ پہنچیں۔

''اے توبہ بھابھی! ایسی بھی کیا پردہ داری۔ مانو ہوا ہی نہ لگائی۔ اے کیا ہم دشمن ہیں؟''

''اے میری چندا۔ میری لال۔'' وہ مجھے لپٹائے میری بری کا جائزہ لے رہی تھیں۔

چار مختلف جواہرات کے سیٹ، بے حساب کپڑا، میوہ، الم غلم۔

پتہ چلا میرے شوہر اپنے والد کے اکلوتے بیٹے ہیں۔ چند ایک رشتہ داروں کے سوا ان کا کوئی نہیں۔ پچیس سال کی عمر میں ایک حادثے سے ان کی آنکھ ضائع ہو گئی تھی دو کامیاب آپریشن کے بعد بینائی بحال ہو گئی تھی...... پینتیس کے لپیٹے میں تھے پہلے ایک آنکھ کی وجہ سے ہر رشتہ دار نے بیٹی دینے سے انکار کر دیا تھا اب سزا کے طور پر وہ خاندان سے لڑکی لانا نہیں چاہتے تھے، اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ میرے سونے کے زیورات میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔

مگر سب سے بڑا زیور تو میرا سیف الرحمٰن ہیں۔

سب سے بڑا تاج تو میرا سیف الرحمٰن ہیں۔

میری شکھتا، میرا آسمان صرف سیف الرحمٰن۔



اور اب میں خوبصورت ساڑھی میں ملبوس اپنی زندگی کے ہمراہ اپنی شاندار موٹر سے اتر کر بیٹے کی انگلی تھام کر پھوپھی جان سے ملنے جاتی ہوں تو جانے کیوں سوچتی ہوں کوئی کتنا بگاڑ سکتا ہے؟ کس قدر بگاڑ سکتا ہے؟؟

مگر جانے کیوں میرا احساس دل پھوپھی کی بیٹیوں کے دکھ پر افسردہ ہو جاتا ہے۔



تیرے لہجے کی تھکن یاد آئی

''ارے بھئی، اس طرح تو نہ دیکھو۔ فی الحال یہیں ہوں تمھارے پاس بلکہ قریب...... اطمینان سے دیدار کر لینا۔''

وہ آنکھوں میں جامد ہوتے تحیر کو شوخ مسکراہٹ میں چھپا کر گلے سے پھولوں کے ہار اتارتا ہوا بولا۔

وہ جو بیڈ سے پاؤں لٹکائے دوپٹے تک سے بیزار انتہائی خشمگیں نظروں سے اس کی طرف متوجہ تھی، مزید تپ گئی۔

''دراصل میں آپ کی اپنے کمرے میں بے تکلفانہ موجودگی برداشت نہیں کر پا رہی ہوں۔''

تب اس نے موزے کھینچتے ہوئے حیران نظریں اس پر دوڑائیں، پھر خود کلامی کے انداز میں گویا ہوا۔

''میں نے سنا نہیں ہوگا۔''

''کیا سنا نہیں ہوگا؟'' وہ اسی اکھڑ پن سے بولی۔

''یہی کہ مہر معجّل کے ہمراہ بیوی کو ایک کمرہ بھی دینا ہوگا جہاں صرف وہی بادخل ہوں گی سب بے دخل...... حضور سارا گھر آپ کا ہے، گھر والے سمیت۔''

وہ کوٹ وارڈ روب میں لٹکا کر پلٹا۔ قمیص کے اوپری بٹن کھول کر جیسے ہی اس کے برابر میں بیٹھا وہ لپک کر دوسری طرف بڑھ گئی۔

''مانا کہ میری دوسری شادی ہے پر تمہاری تو پہلی ہے۔ تھوڑا سا حجاب مجھ سے ہی لے لو اُدھار...... لاؤ تمہارا گھونگھٹ ہی نکال دوں۔'' وہ اسے چھیڑتے ہوئے آگے بڑھا۔

''جب میں آپ کے لیے کوئی جذبہ اپنے دل میں محسوس ہی نہیں کرتی تو شرم کا فائدہ شاہ صاحب!''

''ارمان تو میرے کم ہونے چاہئیں کہ دوبارہ...... تمھارے لیے تو بہت ارمانوں و

انتظار کا صلہ ہے آج کا دن، بلکہ اب تو رات......"

"خوش فہمی ہے آپ کی۔ میں نے کبھی ایسی لغویات کا ارمان نہیں پالا۔ جائیے اپنے کمرے میں، میں سونا چاہتی ہوں اب۔"

"آپ بچی نہیں ہیں ماہ رو! عمر کے جس دور میں آپ ہیں وہاں تو ہر بات ازخود سمجھ میں آ جاتی ہے۔" اس نے پھر انداز بدل دیا باتوں کا۔

"اور بھئی چلو اب دو چار باتیں ہی کر لو۔ اتنے عرصے بعد کمرہ آباد ہوا ہے۔" وہ بہکے ہوئے انداز میں اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔

"رسم ہے، پوری کرنا ہے، یہ انگوٹھی ہی قبول کرو فی الوقت" وہ اس کی انگلی میں انگوٹھی ڈالتا ہوا بولا۔

اس نے شاہ عالم کے صحت مند چہرے و نفیس تراش کی مونچھوں کو بیزاری سے دیکھا۔

"اب تو آپ کو میرے سونے پر اعتراض نہ ہوگا؟ سخت تھکی ہوئی ہوں، بات کرنے کا قطعی موڈ نہیں۔"

"سننے کا بھی نہیں؟" وہ اپنی بہکی ہوئی آنکھیں اس پر گاڑ کر بولا۔

"نہیں۔" وہ سختی سے نہیں کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ بھی کھڑا ہو گیا۔ اس کے شانوں کو تھام کر بولا۔

"کل بچے اپنی نانی اماں کے پاس سے آ جائیں گے اور ان شیطانوں کی موجودگی میں، میں بات کرنے کو ترس جاؤں گا اور آج تو ویسے بھی......"

"شاہ صاحب! یہ شادی نہیں ہے معاہدہ ہے۔ بچوں کے سکھ کی تجارت، وگرنہ میں نے کبھی آپ کی بیوی بننے کی خواہش اپنے دل میں محسوس نہیں کی بلکہ مجھے آپ سے...... آپ سے...... یوں سمجھ لیں ایک طرح کی نفرت سی ہے۔ آپ نہ میرا آئیڈیل ہیں نہ پسند۔"

اتنا کڑواہٹ بھرا لہجہ، شاہ کو جھرجھری سی آ گئی۔ اس کی گرفت شانوں پر ڈھیلی پڑ گئی۔

"کیا ضرورت تھی مجھ پر احسان کرنے کی؟"

"میں نے کسی پر کوئی احسان نہیں کیا۔ آپ مجھے بچوں کی آیا تصور کر لیں یہ بچے مجھے جان سے زیادہ عزیز ہیں، بس۔"

جواب ایسا تھا کہ وہ بے ساختہ چار قدم پیچھے ہٹ گیا۔ آنکھوں کے چراغ بجھ سے گئے۔

جب وہ باتھ روم سے باہر آئی تو وہ کمرے میں موجود نہ تھا۔ اس نے کمرہ تاریک کیا۔ پنکھا فل اسپیڈ پر کیا اور بیڈ پر ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح گر گئی۔

............✿............

"اوہ مائی گاڈ! یہ پھول میں نے تمھیں یہاں لگانے کو کہا تھا" وہ گلا پھاڑ کر چیخی تھی۔ مالی کپکپا کر رہ گیا۔

"جی اب کیا کروں؟" وہ لرزتا ہوا بولا۔

"یہ کھرپا اٹھا کر میرے سر پر دے مارو" وہ بھڑک کر بولی۔

"مار دے یار! ایسے موقعے کبھی کبھار نصیب ہوتے ہیں۔" وہ اپنی پشت سے اجنبی آواز سُن کر بے طرح اچھلی۔

ڈارک براؤن پینٹ اور لائٹ براؤن شرٹ میں بے حد شوخ سا نوجوان سینے پر ہاتھ لپیٹے کھڑا تھا۔ اسے اپنی جانب متوجہ دیکھ کر بوکھلا سا گیا۔

"چلیں، بے چارے کو معاف کر دیں۔"

"آپ کہاں سے آئے ہیں اس کے ہمدرد بن کر؟" وہ چیخی۔

"گلشن سے، میرا مطلب گلشن اقبال۔"

"کیا پوچھ رہی ہوں، میں تم سے۔ کہاں رہتا ہے تمہارا دماغ؟" وہ اس اجنبی کو یکسر نظرانداز کر کے دوبارہ مالی پر برس پڑی۔

"میں تمھارے باپ کی نوکر ہوں ہر وقت تمھارے سر پر نازل رہوں کبھی تو ڈھنگ سے کام کر لیا کرو۔ مجھے مل جائے کوئی ڈھنگ کا مالی دیکھنا کیسا پتہ کاٹتی ہوں تمہارا۔ ناس مار دیا اتنے خوبصورت پودوں کا۔" وہ پیر پٹخ کر اندر کی سمت بڑھی تو وہ سامنے آ گیا۔

"کم از کم مجھ سے تو پوچھ لیں کہ آپ کے گھر میں کیوں نظر آ رہا ہوں؟"

"یہ میری ڈیوٹی نہیں ہے۔" اس نے آگ برساتی نظروں سے اسے دیکھا۔

"پھر وہ شخص بتا دیں جو آن ڈیوٹی ہے۔"

مگر وہ آگے بڑھ گئی۔

"یا اللہ خیر رکھنا۔"

"جا یار! تو کہہ دے اندر کہ کامران کے دوست آئے ہیں اور جلدی میں ہیں۔" وہ

گدی پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ مالی اندر بڑھ گیا۔

''اس گھر میں جتنی بے انصافی و زیادتی میرے ساتھ ہوئی ہے کوئی تصور نہیں کر سکتا۔'' وہ پیر پٹخ کر بڑبڑاتی ہوئی اندر داخل ہوئی تو اپیا مسکرا دیں۔

''اب کیا ہو گیا؟''

''مجھے ندا کے گھر جانا ہے۔ پاپا چھ بجے آئیں گے۔ کامی بھائی خدا معلوم کہاں ہیں۔ سب اپنی اپنی گاڑیوں پر اتراتے ہیں۔ انشاء اللہ میری بھی ایک دن رولس رائس ہوگی۔ پھر سب کی رالیں ٹپکیں گی۔ ماہی! مجھے دے دو۔ ابھی لا دوں گا۔ ماہی! دو گھنٹے کے لیے۔ دوں گی اچھی طرح۔'' وہ منہ پر ہاتھ پھیرتی ہوئی بڑبڑائی۔

''اے شیخ چلی کی نانی! کیوں خون جلاتی ہو۔ وہ لان میں بیٹھا ہے کامی اس کا کوئی دوست آیا ہوا ہے۔'' اپیا نے بے حد چاہ سے اپنی پیاری بہن کو دیکھا۔

وہ ایک دم کامران کے سر پر پہنچ گئی۔ ''کامی بھائی! پلیز ذرا مجھے گلشن ڈراپ کر آئیں۔ سچی آنے کی کوئی پرابلم نہیں ہے۔''

کامران لائٹر جلائے آگے کو جھک کر دوست کی سگریٹ جلا رہا تھا۔

''آگے پیچھے بھی دیکھ لیا کرو۔'' اس نے پشت پر کھڑی بہن کو ٹوکا۔

''کل پیچھے دیکھا تھا۔ آج آگے دیکھ رہی ہوں۔ ایک ہی چیز ہے۔'' وہ لاپروائی سے کل والے نوجوان پر نگاہ ڈال کر بولی۔

''سوری یار! یہ میری چھوٹی بہن ہے۔ مزاج میں بچپن بہت ہے اور......''

''ایسی کوئی بات نہیں۔ اب یہ مت کہہ دیجیے گا کہ سولہ کا سن لگا ہے۔ پورے بائیس برس کی ہوں گریجویٹ۔ کامران بھائی پلیز۔ اگر آج وعدے کے مطابق نہ پہنچی تو وہ ندا کی بچی کل میری کھال کھینچ ڈالے گی۔'' اس نے ایک تسلسل میں تعارف و دھڑ کا بیان کیا۔

''ایک تو تمہاری سہیلیاں بھی تمہاری طرح چڑیلیں ہی لگتی ہیں۔ بال کھال نوچنے والی۔''

''چلو یار! مجھے بھی ڈراپ کر دینا اگر گلشن ہی جا رہے ہو۔'' وہ نوجوان اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ دونوں آگے بیٹھے تھے۔ وہ پیچھے باقاعدہ دراز تھی جس پر کامران نے ٹوکا بھی تھا۔

''آپ کو ہو گی ان راہ چلتوں کی پرواہ، زمانے کی فکر، مجھے نہیں۔ ہمیں آزاد زمین پر

آزاد وطن میں آزاد پیدا کیا گیا ہے۔'' وہ اپنی دو چوٹیاں پیچھے پھینک کر بولی اور پھر اسی طرح ہو گئی۔

دونوں بے ساختہ ہنس پڑے۔

''کم از کم میرے مہمان ہی کا لحاظ کر لو۔'' آخر کامران نے کہہ دیا۔

''روز روز آنے والے مہمان نہیں ہوتے۔''

''تم نے انھیں کہاں روز روز دیکھ لیا؟'' وہ ایک موڑ کاٹ کر بولا۔

''کل آئے تھے آج بھی دیکھ رہی ہوں۔ لگتا ہے اب عمر بھر دیکھوں گی کیونکہ اتنا بے تکلف تو کسی کو بھی نہیں دیکھا آپ سے۔''

گیٹ پر ندا غالباً اسی کے انتظار میں کھڑی تھی۔ وہ ہاتھ ہلا کر چیخی۔

''ندا! میں آ گئی ہوں بھئی۔ لڑنا مت۔''

کامران نے اسٹیئرنگ چھوڑ کر دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

''اچھا کامی بھائی! خدا حافظ۔''

''کیا کیا جائے یار! اس کا، بالکل بھی سنجیدگی نہیں۔''

وہ مسکرا دیا۔ ''برا نہ ماننا یار! اوّل تو میں نے کبھی گھر پے دوست نہیں پالے۔ میرے دوستوں کی بھی عادی نہیں۔ ایٹتھ تک تم ہی دوست تھے اس کے بعد کوئی نہ بن سکا۔ پھر میڈیکل لائن کی مصروفیات۔ اسی لیے تمھیں کوئی...... سوری یار۔''

''ارے نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ اخلاقاً بولا۔

''ارے اپیا! کسی طرح ٹلو بھئی، کوئی رشتہ امی کو پسند نہیں آتا، کوئی پاپا کو، کوئی آپ کو اور کامی بھائی کو۔ کیسی لڑکی ہیں آپ؟ ذرا جلدی نہیں۔''

اپیا ہنستے ہنستے دہری ہو گئیں۔ ''ارے بھئی، بہت بری لگ رہی ہوں۔ اگر تمھیں جلدی ہے تو تم چلی جاؤ پی کے نگر۔ میں بھلا منع کر رہی ہوں۔''

''میں تو خیر شادی ہی نہیں کروں گی۔ مجھے تو اپنی کوئی فکر نہیں ہے۔ ایم اے میں ایڈمیشن لے رہی ہوں۔ اس کے بعد لیکچرر شپ کروں گی۔ اپنی رولس رائس کا خواب پورا کروں گی مگر شادی نہ کروں گی، سمجھیں آپ کہ نہیں؟ بھئی آپ کو آخر کرنی ہی ہے تو جلدی سے کر ڈالیں۔'' وہ شیلف میں کتابیں جماتے ہوئے بڑی مصروفیت کے انداز میں سرسری سا

مسکرا کر بولی۔

''ہونہہ! جب شادی کا وقت آئے گا تو چوں بھی نہ کر سکے گی میری گڑیا۔ بڑے آرام سے بغیر روئے دھوئے چلی جائے گی۔ جب اپیا پیچھے سے آ کر چپکے سے پوچھے گی تو ماہی کہے گی۔ وہ تو مذاق تھا اپیا۔'' وہ دوپٹہ اٹھا کر شانوں پر پھیلاتی باہر نکلتے ہوئے ہنس کر بولیں۔

''جی نہیں، شکریہ۔ اللہ کرے آپ ٹلیں جلدی سے۔ ہمارے گھر کے در و دیوار کو بھی پتا چلے کہ شادی کیا ہوتی ہے۔''

اپیا کی خوبصورت سی ہنسی اس نے کمرے میں سن لی۔ گویا انھوں نے اس کی بڑبڑاہٹ سن لی تھی۔



وہ اپیا اور کامران سے چار برس چھوٹی تھی۔ اپیا یعنی ماہ رُخ اور کامران چند منٹ چھوٹے بڑے تھے۔ عثمان صاحب کا بڑے پیمانے پر چمڑے کا کاروبار تھا۔ ماہ رو جسے سب پیار میں ماہی کہتے تھے، گھر بھر کی لاڈلی تھی مگر خاندان بھر کی آنکھوں کی ٹھنڈک بھی تھی۔ لاپرواہ، صاف گو، پُراعتماد، ڈھیروں محبتوں و چاہتوں اور اہمیتوں نے اس میں بلا کا اعتماد بلکہ تھوڑی تھوڑی خودسری بھی بھر دی تھی۔

آج شاہ عالم کامران سے ملنے آیا تو پورٹیکو سے باہر نکلتے ہی بوندیں برس پڑیں۔ گھر میں بے حد خاموشی تھی۔ وہ تیزی سے برآمدے کی سمت بڑھا مگر پھر ٹھٹک گیا۔ وہ گلاب کے کنج کے پاس کھڑی جان بوجھ کر بھیگ رہی تھی۔ بال ایک طرف ڈالے وہ گردن پر پھوار لے رہی تھی۔

''بات سنیں۔'' وہ قریب جا کر گویا ہوا۔

''پیسے لگیں گے۔'' بے نیازی سے جواب ملا۔

''بات یہ ہے۔'' وہ اس کی طراری پر جز بز ہو کر رہ گیا۔ اس نے جھٹکے سے بال پیچھے پھینکے۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر بولی۔

''کہاں ہے؟''

''کیا؟'' وہ سخت حیران ہوا۔

''بھئی، 'بات' اور کیا۔ آپ ہی تو کہہ رہے تھے بات یہ ہے۔ میں سمجھی ''بینز'' پر لکھ

کرلائے ہیں۔'' وہ کھردرے انداز میں گویا تھی۔

وہ چکرا کر رہ گیا۔

''کامران کہاں ہیں؟''

''آج ہمارا سارا گھر نکاح پارٹی میں ہمارے سب سے بڑے تایا کے ہاں مدعو ہے، سب تماشائی وہیں ہیں۔''

''تماشائی؟'' وہ ٹپٹایا۔

''یہ نکاح بیاہ لڑکا لڑکی کا تماشا ہی تو ہوتا ہے۔ بلاٹکٹ نہیں تحفہ وحفہ بھی دینا پڑتا ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا؟''

''جی نہیں، آپ کے علم سے آج ہی فیض یاب ہوا ہوں، شکریہ۔''

وہ پلٹا عجیب بدتمیز لڑکی ہے۔ خود بھی بھیگ رہی ہے میرے کپڑوں کا بھی ناس مار دیا۔ اخلاق تو چھو کر نہیں گزرا کہ کہیں بیٹھنے تک کو نہیں کہا۔ مزاج تو پیدائشی تیکھا تھا تیہہ دکھانے سے تو وہ کہیں بھی نہیں چوکتا تھا۔ اپنی گاڑی کی سمت بڑھ گیا۔ معاً اسے اپنی پشت کی سمت سے آواز آئی۔

''عبدالرحمٰن، انھیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔''

ملازم اتنے ادب سے گویا ہوا کہ اسے ناچار ڈرائنگ روم کی طرف مڑنا پڑا۔

تھوڑی دیر بعد وہ سبز کاہی پلین سوٹ میں ٹرالی لیے اندر داخل ہوئی۔

''ہمارا خانساماں بھی آج چھٹی منا رہا ہے اس لیے مجھے ہی تکلیف کرنا پڑی۔ ایک بات بتائیے گا۔'' وہ چائے بناتے ہوئے گویا ہوئی۔

''دو پوچھ سکتی ہیں۔''

اس کے مذاق پر اپنی بدمزاج نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔

''میں نے آپ سے اجازت نہیں مانگی۔''

''ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ آپ کا اور کامران بھائی کا کیا جوڑ ہے؟ وہ سنجیدہ ڈاکٹر جب کہ آپ تو بگڑے نوابوں کی طرح بس گھومنے پھرنے عیش کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ کیوں کامی بھیا کو تباہ کرتے ہیں۔ ویسے ہی ان کے ناپ کی لڑکیاں نہیں خاندان میں۔ غلط صحبت میں بگڑ گئے تو میں تو ڈھنگ کی بھابی کو ترس جاؤں گی۔ پلیز انھیں کچھ کرنے دیں کیوں ہر وقت ان کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔''

"آپ کامران کی باجی ہیں؟" وہ مسکرا دیا۔

"جی نہیں، جانثار بہن ہوں۔ چھوٹی ہوں ان سے۔ اسی وجہ سے آپ کو چائے بھی بنا کر دے دی کہ وہ برا منائیں گے کہ ان کے جگری یار کو انٹرٹین نہیں کیا، ویسے بھی۔"

"کیا ویسے بھی......؟"

"کچھ نہیں......" وہ ٹرالی سے تلے ہوئے باداموں کی پلیٹ نکال کر تپائی پر رکھتے ہوئے بولی۔

"ویسے عجیب بات ہے مجھے آج تک آپ کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔"

"میری خوش نصیبی کہ آپ کو اس کا خیال تو آیا۔"

وہ واقعی اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھنے لگا۔

"ناچیز کو شاہ عالم کہتے ہیں۔" وہ ہلکا سا شرارتی ہوا۔

"آپ کا تعلق خاندان مغلیہ سے تو نہیں۔" وہ بڑی سادگی سے گویا ہوئی تھی۔

"جی نہیں۔" وہ جل کر بولا۔ "آپ کو کیوں کر گمان ہوا؟"

"دیسے ہی کہ جہانگیر، عالمگیر، شاہ جہاں تو ہو گزرے۔ بس شاہ عالم ہی رہ جاتا ہے "عالمی ناموں" میں۔ میں سمجھی......"

وہ اپنا بے ساختہ قہقہہ نہ روک سکا۔ جب کہ وہ اسی سرد مہر انداز میں بیٹھی رہی۔ اپنے قہقہے پر وہ خود ہی شرمندہ ہو گیا۔ ایک ہی بات پر ایک آدمی ہنسے دوسرا چپ رہے تو ہنسنے والا خود کو احمق ہی لگتا ہے۔

"کب تک آئیں گے کامران؟"

"ظاہر ہے رات گئے تک ہی واپسی ہو گی۔" وہ ٹرالی دھکیل کر ایک طرف کرتے ہوئے بولی۔

"آپ کی چائے کا بے حد شکریہ۔" وہ میز سے چابیاں اٹھا کر کھڑا ہوتا ہوا شکر گزار ہوا۔

"کوئی بات نہیں۔ میں اپنے پیارے بھائی کی خاطر اس سے زیادہ بے کار کام بھی کر سکتی ہوں۔ گھر میں تو خانساماں تک نہیں تھا آج۔ ظاہر ہے مجھے ہی بھگتنا تھا۔" وہ اپنی دانست میں رواداری برت رہی تھی۔

ادھر شاہ عالم کا جی چاہا حلق میں انگلی ڈال کر وہیں چائے الٹ دے۔

وہ بے نیازی سے رسالہ پڑھنے لگی تھی۔

تب اسے غصہ ضبط کرنا پڑا کہ کامران کی غیر موجودگی میں ویسے بھی اس کا رکنا غیر ضروری تھا جبکہ ماہی سے ڈھنگ کا تعارف بھی نہ تھا۔

وہ برہمی میں چاہنے کے باوجود اس پر آخری نگاہ نہ ڈال سکا۔ بغیر پلٹے اس سے مخاطب ہوا۔

"کامران سے کہیے گا کہ ڈاکٹر خان نے رات فائل کے لیے فون کیا تھا۔" اس کے ساتھ ہی تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

ماہی نے اس کے بھیگے لباس کو نظر اٹھا کر دیکھا اور بے آواز ہنس پڑی۔



اور پھر آہستہ آہستہ شاہ عالم گھر کا ایک فرد بن گیا۔ اسے معلوم ہوا کہ وہ ایٹتھ میں تھا جب اپنے والد اور بہن جو بڑی تھیں، کے ہمراہ لندن چلا گیا تھا۔ اسی زمانے میں وہ کامران کا بہترین دوست بن چکا تھا۔ لندن جانے کے بعد ان میں باقاعدہ فون و خط و کتابت کا رشتہ قائم رہا تھا۔ تب ماہی کو یاد آیا کہ کسی شاہ عالم کو اس نے دو ایک بار فون پر ریسیو بھی کیا تھا۔ یہ آج سے دو برس قبل کی باتیں تھیں سو اس کے ذہن سے محو ہو چکی تھیں۔ ویسے بھی وہ ایک خود میں گم رہنے والی لڑکی تھی۔ ہر دم خوشیاں سمیٹنے والی، کھلکھلانے والی۔ کسی بھی بات کو سرسری سے زیادہ لینے کی عادی نہ تھی۔

اب یہ بھی معلوم ہوا کہ شاہ عالم بہن کی شادی کے بعد پاکستان مستقل آ گیا تھا۔ یہاں بہت بڑے پرائیویٹ ہاسپٹل میں نمبر دو سرجن تھا۔ ماہی کو یہ سن کر سخت تعجب ہوا کہ وہ سر پھرا سا نوجوان اتنے سنجیدہ پیشے میں......؟

اس کے والد کا قالینوں اور اُونی کپڑوں کا بہت بڑا بزنس تھا۔ وہ زیادہ تر باہر ہی رہتے تھے۔

یہ باتیں اسے خود بخود معلوم ہو گئی تھیں ورنہ اس نے کبھی جستجو نہ کی تھی۔

آج سنا کہ کوئٹہ سے آئی ہوئی شاہ عالم کی بہن ان کے گھر آ رہی ہیں۔ اپیا چائے کے لوازمات میں لگی ہوئی تھیں۔ امی کا خیال تھا کہ کھانے پر کسی روز انھیں میاں کے ہمراہ مدعو کریں گے۔

اس روز وہ صبح سے ندا کے ہاں گئی ہوئی تھی۔

"ہاں بجو! وہ لوگ بہت اچھے ہیں، آپ کو پسند آئیں گے۔"

"بھئی، یہ بات تھی تو پہلے بتا دیتے۔ مجھے تو اس سونے گھر سے بہت ہول آتا ہے۔ بہت پہلے گھر بس جاتا۔" وہ شرارت سے مسکرائیں وہ بھی مسکرا دیا۔ منزل خود بخود اتنے قریب آ جائے گی گمان بھی نہ تھا۔ جانے کیوں دل بے حد پُر یقین و مطمئن سا تھا، مگر ایک گمبھیر سا دھڑکا صرف اسی کی طرف سے تھا۔ اسی لیے اس نے بجو کے سامنے باقاعدہ نام نہ لیا تھا۔ کامران نے ایک ماہ قبل بتایا تھا کہ ماہ رخ کے لیے کسی گزیٹڈ آفیسر کا رشتہ آیا ہوا ہے اور سب گھر والوں کو بے حد پسند آیا ہے۔ اس روز وہ بے حد خاموش سا تھا۔ شاہ عالم کے پوچھنے پر اس نے یہ بات بتائی تھی۔ مزید کہا تھا کہ اسے ماہ رخ سے بے حد پیار ہے۔ کہاں پنڈی، کہاں کراچی؟ بس اسی وجہ سے اداس ہوں۔ یار اب یہ کڑا وقت آنا شروع ہو گیا ہے۔ اتنی پیاری بہنیں جانے کہاں کہاں بسیں گیں؟

وہ کامران کی اداسی دل سے محسوس کر رہا تھا۔ اس پر بھی یہ کڑا وقت آیا تھا جب بجو برطانیہ سے پاکستان آئی تھیں۔

اسے معلوم تھا کہ ماہ رخ کے بعد ماہ رو کا نمبر ہے۔ اس مرتبہ بجو نے اس کی شادی کا تذکرہ کیا تو اس نے عثمان صاحب کے گھر کا بتا دیا۔ ماہ رو سے جانے کیوں ڈھڑکا تھا کہ اس نے اگر انکار کر دیا تو وہ یہ انسلٹ برداشت نہ کر پائے گا۔ وہ چاہتا تھا بجو اپنے طور پر بات کریں تاکہ وہاں دوبارہ جانے والا منہ رہ جائے۔ جب وہ بجو اور ان کے شوہر رحمٰن گل کے ہمراہ وہاں پہنچا تو سب ان کے منتظر تھے مگر وہ نہ تھی جس کے بغیر کچھ بھی نہ تھا۔

ماہ رخ سرخی مائل براؤن شلوار سوٹ میں نفیس جارجٹ کا ہم رنگ دوپٹہ پہنے دراز بالوں کی سادہ سی چوٹی، سمپل سی لیدر کی چپلوں میں بے حد حسین لگ رہی تھی۔ عصر کی اذان کی وجہ سے گلابی چہرہ دوپٹے کے ہالے میں لوٹے لے رہا تھا۔

سادہ سی لڑکی بجو کی روح تک کو جھنجھوڑ کر رکھ گئی۔ وہ سمجھ گئیں ان کا عقل مند و لائق فائق بھائی واقعی گوہر یکتا چن رہا ہے۔ وہ جانے ہی والے تھے کہ وہ ندا کے ہمراہ اندر داخل ہوئی اور بجھے بجھے سے شاہ عالم کے چہرے پر نور آ گیا۔ سیاہ شلوار قمیص، سرخ کڑھائی کے دوپٹے

میں وہ شاہ عالم کا قرار بن کر آ گئی۔

بجو نے اسے اور ندا کو پیار کیا۔ پھر تعارف ہوا کہ یہ ماہ رخ سے چھوٹی ہے اور یہ ان کی سہیلی ہے۔

سب نے انھیں محبتوں سے الوداع کہا۔

بجو بے حد خوش تھیں۔ "ماشاءاللہ بہت اچھے لوگ ہیں، لڑکیاں بھی بہت پیاری ہیں۔"

وہ مسرور سا ہو گیا۔

صبح وہ بالکنی میں تھا۔ بجو گل بھائی سے کہہ رہی تھیں۔ "پرسوں بیگم عثمان نے کھانے پر بلایا ہے۔ تب باقاعدہ بات کروں گی۔ پاپا کی طرف سے بھی رات اجازت مل گئی ہے۔ انھوں نے آپ پر اور مجھ پر اعتماد ظاہر کیا ہے۔ چلیں شکر ہے اس گھر کا بھی نصیب جاگے گا۔ عورت کے بغیر گھر ہی کیا۔"

وہ باتیں کرنے لگیں۔

وہ جان بوجھ کر ڈنر پر نہ گیا۔ اس کی خود سمجھ میں نہ آیا کہ آخر کیوں اسے بہت بے چینی سے دونوں میاں بیوی کا انتظار تھا۔ کتنے ہی چکر وہ گیٹ کے کاٹ چکا تھا۔

بجو کی ہنسی پورٹیکو سے پھوٹی تو وہ بے قرار سا ہو گیا۔ وہ لپک کر باہر آیا تھا۔ بجو ہنسیں۔

"چھری تلے دم تو لو۔ لڑکی والے کیا ایک دم ہی ہاں کر دیتے ہیں......؟"

"ویسے انھوں نے ناامید تو نہیں کیا ہے کیونکہ تم انھیں بہت پسند ہو۔ وہ ہفتے بعد جواب دیں گے۔ گزار لو گے؟"

وہ مسکرائیں تو شاہ عالم جھینپ گیا۔ گل بھائی نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔

دو ہفتے کیسے گزرے، نہ بیان ہو سکتا ہے نہ تحریر۔ وہ ان دو ہفتوں میں ایک مرتبہ بھی "عثمان ولا" نہ گیا۔ کامران البتہ دوسرے تیسرے روز آتا رہا۔ مگر دونوں کی زیادہ باتیں پیشے سے متعلق ہوئیں۔

جس روز بجو جواب لینے گئیں اس نے سارا عرصہ ریکارڈز سننے میں گزارا۔ پاپا بھی لندن سے آ گئے تھے۔ آج وہ بھی ہمراہ تھے۔ بجو کے آنے کے بعد وہ کافی دیر کمرے سے باہر

نہ نکلا تو وہ خود آ گئیں۔

''کہاں ملے گی تمھیں ایسی بجو؟ بہت مبارک ہو بھئی۔ لڑکی بھی پیاری مقدر بھی پیارا۔ انشاء اللہ دو ماہ بعد دلہا بن جاؤ گے۔ سچ بے حد خوشی ہے کہ اتنی پیاری، باسلیقہ اور حسین رکھ رکھاؤ کی لڑکی بھاوج بن رہی ہے ورنہ اتنی ساری خوبیاں ایک لڑکی میں کہاں ملتی ہیں؟ بہت مقدر والے ہو ماشاء اللہ۔'' انھوں نے محبت سے کہا۔

''اگر میرا ایک اور بھائی ہوتا تو میں چھوٹی کو بھی مانگ لیتی۔ اگرچہ وہ تھوڑی لاپروا سی ہے مگر لوگ واقعی بہت اچھے ہیں۔''

اس کا دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا...... چھوٹی...... چھوٹی...... چھوٹی......؟؟''

''کیا کہہ رہی ہیں بجو......؟''

''ماہ رو کی بات کر رہی ہوں جسے سب گھر میں ماہی کہتے ہیں۔ واقعی بہت اچھی ہے مگر ماہ رخ کی سی بات کہاں......''

اس کے ذہن پر ہتھوڑے سے برسنے لگے۔

بجو تو مسکراتی ہوئی باہر نکل گئیں مگر وہ پتھر سا ہو کر رہ گیا۔ تقدیر کا مذاق۔ بھیانک مذاق۔ دو چار ہاتھ جب لبِ بام رہ گیا۔ بجو نے بتایا تھا کہ انھوں نے ایک اور شان دار رشتے پر اسے ترجیح دی ہے۔ ایک ماہ سے وہ رشتہ آیا ہوا تھا وہ بے طرح خاموش ہو کر رہ گیا۔ بجو اور گل بھائی تو زیارت واپس چلے گئے کیونکہ بچے دادی اماں کے پاس چھوڑ کر آئے تھے۔ اسکول کی وجہ سے اس لیے جلدی جانا پڑا۔

پاپا تو پاکستان آ کر مصروف رہتے تھے۔ اس کا دکھ کوئی نہ جان سکا۔

کامران آخر پوچھ بیٹھا۔ ''یار! کیا بات ہے۔ بہت اپ سیٹ رہتے ہو۔'' تو وہ بے معنی سے ہنسی ہنس کر رہ گیا تھا۔

جی جلنا کوئی ایک بار کا تھا۔

کتنی بار وہ ماں کے ہمراہ آئی تھی۔ گھر دیکھا تھا۔ گھر کی پیشانی پر سجے نام کا جی بھر کر مذاق اڑا کر گئی تھی۔

جب آتی جی بھر کر تنگ کرتی۔ وہ اسے خونی نظر سے دیکھ کر رہ جاتا۔ اس کے نزدیک تمام تر قصوروار وہی تھی۔

مہندی کی شب، سبز کرتے پائجامے، دھنک لہجے سے سجے دوپٹے میں وہ اس کا دل خون کر گئی تھی۔

اس کی انگلی پکڑے چہکتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر اس کا جی چاہا اس خوش باش و بے فکری لڑکی کو اتنا بڑا دکھ دے کہ اس کے آنسو کبھی خشک نہ ہوں۔

''میں تمھیں ایک بار تڑپ تڑپ کر روتا دیکھنا چاہوں گا۔ میں تمھیں بے جل ماہی دیکھنا چاہتا ہوں۔ کاش! تم نے مجھے تھوڑا سا بڑھنے دیا ہوتا۔ میں کسی اعتماد کے تنکے کے سہارے تمہارا نام لے کر بجو کو بھیجتا۔ کاش! میں تھوڑا سا بے حمیت ہوتا۔ کاش! مجھے اپنی انا عزیز نہ ہوتی۔ اب تو سدا ایک جھلستی نار بن کر مجھے جھلسائے گی، سلگائے گی۔ مجھے بے ایمانی کے راستے پر لگانے والی...... خدا کرے تیرے دل میں بھی کوئی کانٹا، چبھ جائے۔'' اس نے سفاکی سے دل ہی دل میں بددعا دی۔

اس کے موتیوں جیسے دانتوں سے نکلنے والی کرنیں اسے دہکانے لگیں۔ رسم کے بعد وہ گاڑی لے کر کلفٹن کے ساحل پر چلا آیا۔ چپل اتار کر دیر تک ٹھنڈی نم ریت پر ٹہلتا رہا۔

کیا غمِ عشق کو غمِ ہستی بنا لوں......؟

وہ پیاری سی، معزز، کم گو، بے مثل لڑکی ماہ رخ۔ اس کا گناہ، اس کی خطا......؟

اس نے مجھ سے کتنی توقعات باندھی ہوئی ہوں گی۔

جو کل شب اپنے دل کی تمام کلیاں کھلا کر میرا انتظار کرے گی۔

میرے منہ سے جانے کیا کچھ سننا چاہے گی۔

سزا کے قابل تم ہو ماہ رو۔

میں، میں...... ماہ رخ کے لیے ستم گر نہ بنوں گا۔ اسے اتنی محبت دوں گا کہ ماہ رو مارے رشک کے تم بھی سوچو گی۔ ضرور اپنے گرد اس قدر حصار باندھ کر رکھے تم نے؟ کس قدر خود پسند ہو تم۔ کتنا غرور ہے تم میں۔ تم نے مجھے تباہ کر دیا۔ کاش! تم کبھی اپنے خول سے باہر نکل کر مجھے ملتیں۔ میں کیا کیا نہ کر لیتا۔ کیا تم اتنی اہم ہو میرے لیے کہ میں شب کے دو بجے بے کلی کے عالم میں خود سے بے گانہ ہو چلا ہوں۔ انا پرستوں کا دل محبت بھرا نہ بنایا کہ مولیٰ! خوشیاں خود بخود حرام ہو جاتی ہیں۔

وہ تھک کر ریت پر بیٹھ گیا۔

............✿............

پتا نہیں کس بہانے جوتا اس کے پاؤں سے غائب ہوا تھا۔ اب تمام پریاں اس کا گھیراؤ کیے ہوئے تھیں۔ کیمروں کی فلش، مرکری بلب کی چکا چوند، مووی کا ہنگامہ...... وہ بوکھلا سا گیا۔

"جوتے کا کرایہ دیجیے۔ ورنہ ایک پاؤں میں پہن کر جائیے۔"

وہ کس قدر شوخ ہو رہی تھی۔

"ہوں...... ویسے تو بہت بولتے ہیں...... آج...... ارے ابھی تو اپیا گھر نہیں پہنچیں۔ ہنس بول لیجیے کہ

پھر کہاں یہ فرصتیں، پھر کہاں یہ رات دن

وہ کھلکھلائی۔

اور وہ بھسم ہو کر رہ گیا۔ سیاہ ڈنر سوٹ اور سرخ گلابوں کے ہار میں کھویا کھویا۔ بے پناہ اچھا لگ رہا تھا۔

اپیا کی سہیلیاں بہت خوش تھیں۔

"کیا کرایہ ہوگا پندرہ منٹ کا؟" وہ مسکرایا۔

وہ پریوں کی ملکہ ادھر ادھر سوالیہ نظروں سے دیکھ کر بولی۔

"ڈیڑھ ہزار۔"

پیچھے سے کامران بولا۔

"گڑیا! یہ تم نے جوتے کا کرایہ بتایا ہے یا ٹیکسی کا؟"

ڈھیروں قہقہے گونج اٹھے۔

شاہ عالم نے کوٹ کی جیب سے پندرہ سرخ سرخ نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھے تو وہ ٹھوڑی پر انگلی ٹکا کر حیران ہوئی۔

"اتنی آسانی سے دے دیے۔ ہمیں یہ توقع ہوتی تو دو ہزار مانگ لیتے۔"

پھر فرشی سلام جھاڑتی ہوئی الٹے قدموں واپس ہوئی تو سب اس کی اس بے ساختہ ادا پر ہنس دیے۔



ولیمے کی سج کو اس نے آنکھیں پٹپٹا کر اپیا کو نیا نازک سا ڈائمنڈ کا سیٹ پہنے،

شرارت سے ہنسی۔ تب اپیا جھینپ گئیں۔

"اپیا! آپ کا دلہا تو واقعی دل والا ہے ورنہ تو ابھی تک ہم نے دلہاؤں کو انگوٹھیوں، گھڑیوں پر ٹرخاتے دیکھا ہے۔ میری اپیا کو کسی کی نظر نہ لگے۔" اس نے بہن کا رخسار چوم لیا۔

اپیا بے طرح شرما رہی تھیں۔ وہ ان سے علیحدہ ہوئی تو دیکھا شاہ عالم آئینے کے سامنے کھڑا برش بالوں میں پھیر رہا تھا۔

"ہیلو...... ناٹی گرل...... کیسی ہو......؟" وہ مسکرایا۔

"بہت اچھی مگر آپ سے زیادہ نہیں۔ آپ تو پھولے نہیں سما رہے۔" وہ حسب عادت چٹاخ سے بولی۔

"کیوں نہیں، تمھاری اپیا ہیں ہی ایسی چیز۔"

وہ وارفتہ نظروں سے ماہ رخ کو دیکھ کر بولا۔

وہ بری طرح شرما گئیں۔

وہ اپیا کو مسرور پا کر بہت خوش تھی۔

"اپیا! آپ کو خوش دیکھ کر شادی کی ساری تھکن اتر گئی ہے۔"

"اچھا! چل میں تیری شادی پر بدلہ اتار دوں گی۔"

وہ اسے محبت سے دیکھ کر بولیں۔



دن بہت مصروف گزر رہے تھے۔ یونیورسٹی میں اس قدر مصروف ہو گئی تھی کہ اپیا کے ہاں ہفتوں نہ جا پاتی۔ جب وہ آتیں ناراض ہو کر جاتیں۔ وہ انھیں فون پر منا لیتی۔ اس کا پریولیس ختم ہوا تو اپیا ڈلیوری کے سلسلے میں میکے آ گئیں۔

وہ زمانے بھر کی منہ پھٹ شاہ عالم کے سامنے ہی بول پڑی۔

"ہائے اپیا! آپ ابھی سے پھنس گئیں۔ سچی مجھے تو بہت افسوس ہو رہا ہے۔"

اپیا سٹپٹا گئیں۔ شاہ عالم نے میگزین چہرے کے آگے کر لیا۔ امی ہوں ہوں کر کے رہ گئیں۔

"یہ ایم اے کر رہی ہے۔ عقل رتی بھر نہیں ہے۔ بھلا بہنوئی کے سامنے افسوس کرنے کی کیا تک تھی۔ اللہ نے انھیں خوشی کا دن دکھایا ہے۔ تم بیٹھ گئیں غم منانے۔ وہ تو شکر کرو

کہ وہ تمہارا مزاج سمجھتا ہے۔ دانتوں تلے داب کر رکھا کرو یہ گز بھر کی زبان۔'' شاہ عالم کے جاتے ہی امی نے اسے پھٹکارا۔

وہ کھی کھی ہنسے گئی۔

''بدتمیز۔'' اپیا کی بھی بے ساختہ ہنسی چھوٹ گئی۔

مگر خوبصورت گڈا آتے ہی سارے سمسٹر، یونیورسٹی اور افسوس بھول گئی۔ جب اس نے انگلی بھر کے روتے ہوئے بھانجے کے منہ میں شہد رکھا تو بڑی تائی اماں، جو اپیا کی وجہ سے ان کے پاس تھیں، سر پیٹ کر بولیں۔

''ارے ہے، شہد کس نے چٹایا۔ اس بچے پر اللہ اپنا رحم کرے۔ دیکھ لینا بالکل اپنی خالہ کی طرح ہوگا۔''

''ہمیشہ سر اٹھا کر چلے گا۔ بڑے بڑوں کو گھاس نہیں ڈالے گا۔'' وہ اس کا رخسار چوم کر مسکرا دی۔

اپیا مسکرا دیں۔ ''پھر تو تم ہی پالنا، میرا جگرا امی جتنا نہیں ہے۔''

''پال لوں گی۔ کیسی بے درد ہیں۔ ذرا پروا نہیں بیٹے کی۔ ظاہر ہے اور آ جائیں گے۔''

''ہے بے غیرت۔'' تائی اماں باسکٹ میں سر ڈالے جانے کیا ٹٹول رہی تھیں۔ باسکٹ میں سر دیے دیے ہی بدبدائیں تو وہ گڈا اپیا کی بغل میں دے کھلکھلاتی باہر نکل گئی۔

''اے رخی، ٹوکا کرو، پرائے گھر جائے گی۔ کیسے گزارہ ہوگا؟''

''سب عقلیں آ جاتی ہیں تائی اماں!'' وہ بولیں اور آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔ انھیں شاہ عالم کا انتظار تھا۔



تین برس بعد جب وہ ایک مقامی کالج میں انگریزی پڑھا رہی تھی تو اپیا اپنے گڈے، گڑیا اور گھر میں بری طرح پھنس گئی تھیں۔ شاہ عالم کی مرضی کے مطابق خود کو سیٹ رکھے ہوئے تھیں۔ بھرے بھرے بدن پر آج بھی جچتے کپڑے پہنتیں۔

ویسی ہی خوش اخلاق، مسکراتی ہوئی۔

بے حد خوبصورت بچوں کے اور بچوں کے باپ کے نخرے اٹھاتے ہوئے مصروف مصروف سی اپیا اسے پہلے سے زیادہ دل کش نظر آتیں۔ زیادہ تر وہ خود ہی کالج سے اس کے ہاں

چلی جاتی۔ شاہ عالم کے ساتھ ہنسی مذاق کا وہی عالم تھا۔ وہ اس سے بہت کتراتا تھا۔

بعض اوقات اپیا مع بچوں و شوہر کے فارغ بیٹھی ہوتیں۔ وہ پہنچ جاتی۔ اس روز ندا کو اس کے گھر سے لے کر آپی کے ہاں چلی آئی تھی۔ شاہ عالم اس کے سلام کا جواب دے کر بچوں میں مصروف ہو گیا تھا۔

''اپیا! یہ ندا بھی کہہ رہی ہے آج کہ تمہاری اپیا کے گھر کا نام کیسا عجیب سا ہے۔'' شاہ خانہ'' بالکل ایسے لگتا ہے جیسے دواخانہ، شفاخانہ، مرغی خانہ۔'' پھر مسکراہٹ دبا کر آہستہ سے بولی ''زچہ خانہ'' وغیرہ۔''

اپیا نے ایک دھپ جمایا اور ہنس کر شاہ عالم کی طرف دیکھنے لگیں۔

''میں نے ندا کو بتا دیا کہ اپیا کے میاں بڑے انٹلیکچوئل قسم کے ہیں، کیوں غلط کہا میں نے؟'' اس نے چوری سے شاہ عالم کو دیکھ کر اپیا سے سوال کیا۔

''پتا نہیں، الٹی سیدھی باتیں کرنا تو تم پر فرض ہے۔'' وہ چائے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''اور آڑی ترچھی باتیں سنتیں۔ نفل بھی بتا دیں اپیا۔ آسمانی نماز تو مجھ سے ڈھنگ سے ادا نہیں ہوتیں یہ زمینی.....''

وہ بات ادھوری چھوڑ کر مسکرانے لگی۔

''توبہ ماہی! لڑکیاں کیا دبتی ہوں گی تم سے۔ ذرا بھی تو سوبر نہیں ہو۔'' وہ چھیڑتی ہوئی باہر نکل گئیں۔

''ارے میرا رنگ تو آ کر دیکھیں کسی روز کالج میں۔'' وہ صوفے پر دراز ہو گئی۔

ندا شاہ عالم سے مخاطب ہوئی۔

''بہت کم بولتے ہیں آپ دلہا بھائی۔ اپیا کا تو رعب نہیں؟''

''اب یہ مانیں گے تھوڑا ہی۔ واقعی اپیا ہی کا رعب ہے۔ شادی سے پہلے کا رنگ تو تم نے دیکھا نہیں ندا۔ اپیا نے زمین آسمان کا فرق کر دیا ہے۔'' وہ شاہ عالم کی سمت دیکھ کر گویا ہوئی۔

جواب میں شاہ عالم کی بے ساختہ اٹھتی نظریں ماہی کے جسم میں سنسناہٹ پیدا کر گئیں۔

وہ فوراً گڑیا کی سمت متوجہ ہو گئی۔

اپیا نے ندا کی وجہ سے چائے پر بہت اہتمام کر لیا تھا۔

آج تائی اماں بری طرح اس کی شامت بلا گئی تھیں۔ بہت اچھا رشتہ لے کر آئی تھیں مگر اس نے حسب سابق انکار کر دیا تھا کہ اسے شادی ہی نہیں کرنا۔

آج ہی سارا گھر اس کے پیچھے پڑا تھا۔ امی نے صاف کہہ دیا کہ وہ ہاں کر رہی ہیں۔ بعد میں ٹھیک ہو جائے گا سب کچھ۔

اور واقعی انھوں نے ہاں کر دی۔

اس نے سر پٹک پٹک کر دی۔

مگر اس بار اس کی نہیں چلی۔

''غضب خدا کا، عمر نکل گئی تو کون پوچھے گا۔ اسے تو آگے کی الجھنوں کا احساس نہیں ہے۔ زندگی خالی ہر وقت کا ہنسی کھیل نہیں ہے۔''

امی اس مرتبہ سخت برہم تھیں۔ ظاہر ہے سب ہی ان کو کہہ رہے تھے۔

اس کی ہونے والی ساس اور نندیں خاموشی سے اس کی انگلی میں احسان علی کے نام کی انگوٹھی پہنا گئیں۔ اس کا پارہ سوا نیزے پر رہنے لگا۔ اس نے باقاعدہ رونے کے لیے کالج سے ہفتے بھر کی چھٹی لے لی۔ کانچ کے قیمتی گل دان توڑ ڈالے۔ پیر پٹخ پٹخ کر ٹانگوں میں درد کر لیا۔

امی کا اٹل فیصلہ تھا ''وجہ بتاؤ......!''

''کوئی وجہ نہیں ہے۔ خدا کی قسم کوئی وجہ نہیں ہے۔ مجھ سے نہیں ہوگی کسی مرد کی غلامی۔ بس......'' وہ گڑگڑائی۔

''اے ہاں تم سیدھی آسمانوں سے اتری ہونا۔ مرد کی غلامی، بے وقوف......!'' اس کی عقل پر تو سدا سے شبہ تھا انھیں۔ اب پختہ یقین ہو گیا تھا۔

جانے اسے کیا ہو گیا تھا۔ ہر وقت جھنجھلائی جھنجھلائی رہنے لگی۔

''ہونہہ! شادی کے بعد بالکل سیدھی ہو جائے گی۔'' وہ سوچا کرتیں۔

اپیا دو روز سے آئی ہوئی تھیں۔ شاہ عالم بھی تین بجے کے قریب وہیں آجاتے ہیں۔

''میرے بس کے نہیں ہیں یہ آپ کے یاجوج ماجوج۔''

وہ بے ڈھنگے پن سے گڑیا کو پہلو پر ٹکائے گڈو کو گھسیٹتے ہوئے اندر داخل ہوئی مگر ٹھٹکا کر رہ گئی۔

شاہ عالم بیڈ پر دراز تھا۔ اپیا اس کی قمیص کے بٹنوں سے کھیلتی ہوئی بڑی دلکشی سے

مسکرا رہی تھیں۔

''ہائیں۔'' وہ بوکھلا گئی تھی۔ وہ دونوں جھینپ گئے تھے۔

زور سے گڈو کے دھپ مارا۔ گڑیا کو فرش پر پٹخا۔ گڑیا روئی تو اس نے اس کے رخسار پر طمانچہ رسید کر دیا۔ اپیا تڑپ کر بڑھیں۔

''ارے ماہی! توبہ ہے۔ اتنے سے بچوں کو اس طرح مارا کرتے ہیں؟''

اپیا نے گڑیا کو گود میں بھر کر شاہ عالم کی طرف دیکھا اور ماہی کو لتاڑا۔ مبادا اپنے بچوں کی اس درگت پر برا نہ مان گیا ہو۔

''یہ گڑیا باتھ روم میں ٹب میں ڈوب رہی تھی اور یہ گڈو۔''

وہ گڈو کو مارنے کو لپکی۔ اپیا نے گڈو کو اپنے پیچھے کر دیا۔

''گڑیا کے منہ میں ٹوتھ پیسٹ کی ٹیوب ڈالے مسلسل دبا رہے تھے۔ ابھی پوچھتی ہوں تمھیں۔'' وہ گڈو کو گھور کر بولی۔

''ارے اپیا! انھیں مارا کریں۔ بگڑ جائیں گے ورنہ۔''

مخاطب وہ اپیا سے تھی مگر توجہ شاہ عالم کی طرف تھی۔ گڑیا ماں کی گود سے چپکی سسکیاں بھر رہی تھی۔

''توبہ کیا ظلم توڑا ہے میری بیٹی پر۔ تمھارے بھی دن قریب ہیں۔ دیکھوں گی کتنا مارا کرو گی اپنے بچوں کو۔''

وہ گڑیا کا رخسار چوم کر شاہ عالم کی طرف پلٹ گئیں۔



کامران باہر تھا۔ ماہی کی شادی کی وجہ سے اس کا گھر میں شدت سے انتظار ہو رہا تھا۔ انہی دنوں شاہ عالم کے والد کا انتقال ہو گیا۔ ہارٹ اٹیک کا عارضہ تھا انھیں۔ تب شاہ عالم لندن چلا گیا۔ وہاں بزنس دیکھنا تھا۔ شادی کو چوتھا سال تھا۔

شادی کے دن نزدیک ہونے کی وجہ سے مصروفیات بڑھ گئی تھیں۔ شام کو اسے خبر ملی کی اپیا ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہیں۔ دونوں ماں بیٹیاں پاپا کے ہمراہ روتی دھوتی پہنچ گئیں۔ پتا چلا کہ وہ لحاف دھلوا کر تیار کر کے اوپر بکس میں رکھنے جا رہی تھیں کہ وہ دوسری منزل کے زینے سے سلپ ہو گئیں۔ ابارشن الگ ہوا جان پر علیحدہ بنی ہوئی تھی۔ تین چار ماہ بعد ان کے ہاں ایک فرد کا

مزید اضافہ ہونے والا تھا۔اس مرتبہ واقعی اسے بہت کوفت ہوئی تھی۔

”توبہ اپیا! آپ نے تو پڑھ لکھ کر ڈبو دیا۔آپ تو مسلسل ترقی پر ہیں۔“

”میں کیا کروں ماہی! شاہ عالم کو بچوں کا بہت شوق ہے۔وہ کہتے ہیں کہ مجھے گھر میں شور، بچوں کی رونق بہت اچھی لگتی ہے۔“

”آپ کا تو ہو رہا ہے ناستیاناس۔“ وہ بھبک کر بولی۔

”اتنا تو آرام دیا ہوا ہے۔کتنے ملازم رکھ چھوڑے ہیں۔کتنا خیال کرتے ہیں میرا۔“

”بس آ گئیں عورتوں والی روش پر، وہ یوں ہیں، وہ یہ ہیں۔“ وہ منہ بنا کر بولی۔

”تمھیں دیکھیں گے۔“ وہ مسکرائی تھیں۔

وہ اور امی ماہ رخ کی حالت پر ویسے ہی نڈھال تھیں۔اس پر بچوں کا رونا پیٹنا۔

شاہ عالم بھی موجود نہیں تھا۔

امی ہاسپٹل میں رہ گئی تھیں۔وہ بچوں کے ساتھ پاپا کے ہمراہ گھر آ گئی تھی۔

بچے تو ویسے ہی اس سے مانوس تھے۔زیادہ پرابلم نہ ہوئی۔

پاپا کا کمرہ اوپر تھا۔اس لیے فون کی گھنٹی پر اس کی ہی آنکھ فوراً کھلی۔

دوسری طرف امی تھیں مگر وہ کچھ نہ کہہ پا رہی تھیں۔سوائے سسکیوں کے تب شاید نرس نے ان کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا۔

جو کچھ اس نے سُنا اس کے حواس گم کر دینے کو کافی تھا۔

وہ گڑیا اور گڈو کو سینے سے لگا کر روئی تڑپ تڑپ کر۔وہ دونوں اس سے زیادہ چیخ کر رونے لگے۔

گھر کی پرانی ملازمہ جاگ کر پاپا کو جگا آئی۔

وہ پاپا کے سینے سے لگ کر روتے روتے بے ہوش ہو گئی۔

یہ لمحے جس پر گزریں وہی جانے۔جان سے عزیز لوگ یکا یک نظروں سے اوجھل ہو جائیں تو دل سنبھالے نہیں سنبھلتا۔پاپا نے شاہ عالم کو فون کر دیا تو وہ اگلے ہی روز موجود تھا۔بے حس سپاٹ چہرے کے ہمراہ۔

وہ اسی طرح چیخیں مار مار کر روئی تھی جب اپیا مکان ابدی کی طرف روانہ ہوئیں کہ جن کی آنکھیں بھیگی تھیں وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے جو رو رہے تھے، تڑپ تڑپ اٹھے۔

ایسا سانحہ تھا کہ مہینوں دل کو قرار نہ آیا۔لب مسکرانا بھول گئے۔باپ کے بزنس کی وجہ سے شاہ عالم کو مہینے پندرہ دن میں لندن جانا پڑ رہا تھا۔وہ کسی اچھے ناظم کی تلاش میں تھا۔بچے نانی نانا کے پاس تھے۔شاہ عالم کی بہن نے اپنے ساتھ لے جانا چاہا مگر ان لوگوں نے منع کر دیا۔انھوں نے بھی زیادہ اصرار نہ کیا کہ بچے یہاں بہت مانوس تھے۔

جب بھی شاہ عالم آتا بچوں کو ساتھ ”شاہ خانہ“ لے جاتا مگر وہ اس کی جان کو آ جاتے۔گڑیا کی دفعہ میں اس نے ایک ادھیڑ عمر کرسچین آیا کا انتظام کر دیا تھا۔مگر بچے مشرقی گودوں کے عادی اور سر چڑھے تھے۔سوتے وہ خالہ کے پاس ہی تھے۔



وہ خودداری سے سر اٹھا کر چلنے والی لڑکی۔جانے کون سے بڑے بول کا نتیجہ سامنے آیا تھا اس کے کہ احسان علی نے جی بھر کے انسلٹ کی تھی۔

والدہ محترمہ تو جھجک کر جھینپ کر کہہ رہی تھیں کہ اس نے وہاں کی شہریت حاصل کرنے کے لیے شادی کی ہے وگرنہ اس کا کوئی ارادہ نہ تھا۔مجبوراً کی ہے۔ساری زندگی میرے بچے نے محنت مشقت کر کے یہ دن دیکھے۔وہ وہیں رہنا چاہتا ہے۔جب کہ ملازمت عارضی تھی۔

ابھی ایک دھکا دل پر لگا تھا اور یہ تقدیر کا طمانچہ منہ پر۔مگر وہ بھی ایک ہی تھی۔ماں کو سنا ہی گئی۔

”بس امی آپ لوگ امریکا کا نام سن کر اتنے جذباتی ہو جاتے ہیں۔بس نہیں چلتا فوراً پھینک ماریں ان کے در پر۔“

امی جن کا کوئی قصور نہ تھا بہت شرمندہ سی تھیں مگر اس کی روٹین میں کوئی فرق نہ آیا۔

ایک روز وہ ٹیرس پر کھڑی تھی جانے کیوں آنکھیں بھر آئیں۔سامنے کمرے میں شاہ عالم کا دل پانی ہو گیا۔اسے اپنی بددعا یاد آ گئی۔کوئی اس لاأبالی لڑکی کے متعلق قیاس نہ کر سکتا تھا۔

کہاں گئیں اس گھر کی رونقیں۔

سات سال کا سمندر ہے تم کناروں پر میں جزیروں میں۔تقدیر کا اس قدر قائل ہو گیا ہوں کہ وقت کے دھارے پر خود کو چھوڑ بیٹھا ہوں۔کچھ کرنے کو جی نہیں چاہتا۔وہ نیچے چلا آیا۔کچھ بھی تو نہیں رہا۔دل ہے کہ مفلس کا گھر۔

بچوں نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔

''پپا! آج ہم خالہ جانی کے ساتھ کون کھانے جائیں گے۔'' گڈو نے بہانہ بنایا۔

''بیٹا ہم کھلا دیں گے کون۔''

''ہمارا دل نہیں لگتا وہاں، بس آپ جھوٹ بولتے رہتے ہیں، امی لندن سے آنے والی ہیں۔ ابھی تک تو آئی نہیں۔ امی کو ایئر پورٹ سے لے کر یہاں آیئے گا، پھر سب چلیں گے۔''

''بیٹے! پپا کو تنگ نہیں کرتے۔''

''ہم کو چلے جانا ہے۔ پھر آ جایئے گا نانی کے پاس۔''

''پپا! آپ بھی یہیں رہ جائیں نا۔''

''بیٹے! باری باری دونوں گھروں میں رہیں گے۔''

گڑیا اُچک کر اس کی گود میں چڑھ گئی ''ہم نہیں جاتے۔''

ماہی نے انھیں چمکارا مگر وہ نہ مانے۔

''آپ کیوں جاتے ہیں، یہیں رہ جائیں نا۔'' اس نے شاہ عالم سے کہا۔

''میرا گھر ہے، کچھ لمحے وہاں گزارنے کو بہت جی چاہتا ہے۔'' وہ پلٹ گیا۔



تائی اماں اگر لاء کرتیں تو بہت کامیاب بیرسٹر ثابت ہو سکتی تھیں۔ دلائل کی قوت ان کے ہاں وافر تھی۔ کامران پرسوں ہی آیا تھا، جرمنی سے۔ آج تائی اماں ایک نیا شوشہ چھوڑ گئیں۔

وہ ایک دم آؤٹ ہو گئی۔ پاپا نے بھی نامناسب کہا مگر امی جو نواسے نواسی کی محبت میں دیوانی ہو رہی تھیں، رضامندسی تھیں۔ مگر وہ چاہتی تھیں کہ پہل شاہ عالم کی طرف سے ہو یعنی بجو وغیرہ سلسلہ چھیڑیں۔

اس روز وہ سارے بند توڑ کر ماں کے سامنے روئی۔ بس ایک ہی جملہ کہا:

''بس کریں امی! بہت تماشا بن چکی ہوں میں۔''

تب انھوں نے اس کا سر سینے سے لگا کر ماتھا چوم لیا۔

''بیٹے! اس دنیا میں بہت سی ناممکن باتیں بھی ممکن ہو جاتی ہیں۔ ہم نے اس لحاظ سے کہا کہ تمہاری عمروں میں بھی زیادہ فرق نہیں ہے۔ بے حد شریف پرکھا بھالا ہے۔ سوچا تھا بچے بھی محفوظ ہو جائیں گے۔ تم ان پر جان چھڑکتی ہو اور وہ تمھارے دیوانے ہیں۔''

یہ ہوتا ہے بہت سی باتیں ایک ساتھ بہت سے ذہنوں میں آ جاتی ہیں۔ بجو نے فون پر شاہ عالم سے بات کی پھر ایک خط بہت حوصلے سے عثمان صاحب کو ڈال دیا۔

مگر اس بار کسی کی نہ چلی۔ نہ ماں باپ کی۔ نہ کامران کی۔ وہ بری طرح بگڑ اٹھی بلکہ شاہ عالم کو فون پر سخت لہجے میں صاف کہہ دیا۔ ''بند کریں یہ تماشا، میں نے ٹھیکہ نہیں لیا ہے بچے پالنے کا۔ کیا دنیا میں میں ہی رہ گئی ہوں۔ گھر بسانے کا شوق ہے تو لے آیئے کہیں سے بھی۔

تب اس نے رسان سے کہا۔

''میں ماہ رو، یہ اقدام میں نے اپنی ذات کے لیے نہیں کیا بچوں کے لیے کیا ہے۔ عورت تو مجھے کہیں سے بھی مل جائے گی، مگر شاید بچوں کو اچھی ماں نہ مل سکے۔''

''یہ ہوتی ہے مرد کی وفاداری۔ بیوی کے مرتے ہی اسے بھول جاتا ہے۔'' وہ زہریلے لہجے میں گویا تھی۔

''یہ خوابوں کی باتیں ہیں ماہ رو! حقیقت بہت پتھریلی ہے یہاں کسی بھی حق کا سلسلہ کسی نہ کسی ضرورت سے پیوستہ ہوتا ہے۔ تم خیال نہ کرو، تمہاری مرضی کے خلاف کوئی بات نہیں ہوگی۔ او کے۔''

وہ ریسیور تھامے سوچتی رہ گئی۔

میں جتنی اپنی انا کے معاملے میں حساس تھی، تذلیل اتنا ہی میرا مقدر بنی ہے۔ تم میری انسلٹ کرنے والے پہلے مرد تھے اور احسان علی دوسرا۔ اسی لیے میرے دل کا گوشہ تمھارے لیے نرم نہیں۔ مجھے کراہت آتی ہے مردوں سے۔ وہ زمانے بھر کی کڑواہٹ اپنے ذہن میں سمو کر خود سے گویا تھی۔



شاہ عالم بہت دنوں سے بچوں کو لے کر نہیں آیا تھا۔ کالج سے واپسی پر وہ ''شاہ خانہ'' چلی آئی۔

تین بجے سہ پہر کا عالم۔ مالی چارپائی پر لیٹا ریڈیو سن رہا تھا۔ باقی سارے گھر میں ہُو کا عالم تھا۔ وہ ڈرائنگ روم کے سامنے سے گزری تو گورنس این بڑے فراٹے سے خراٹے نشر کر رہی تھی۔ تھل تھل کرتا بدن صوفے پر ظلم توڑتا نظر آ رہا تھا۔ وہ پل بھر کو بکھر کر رہ گئی۔ پھر دبے پاؤں بچوں کے کمرے میں آئی۔ بغیر فراک کے گڑیا کرسی پر سو رہی تھی۔ بایاں رخسار دہک رہا

تھا۔ چہرے پر آنسوؤں کے نشان تھے۔ اس کا دل بھر آیا۔ اس نے گڑیا کو آہستگی سے اٹھا کر بیڈ پر لٹایا۔ اچانک باتھ روم کا نل کھلنے کی آواز آئی۔ وہ فوراً لپکی۔ گڈو میاں آئینے کے سامنے کھڑے شاہ عالم کے ریزر سے اپنا گال کھسوٹ رہے تھے۔ اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔ گڈو سے ریزر چھین کر اسے نہانے کے لیے کہہ کر تیز تیز چلتی آیا کے سر پر پہنچ گئی۔

"میڈم این۔ آر یو سلیپنگ......؟"

گورنس خرخر کرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ "نو......نو......"

"نو......وہاٹ نو......؟ وین واز آئی سلیپنگ؟"

"وہاٹ یو ڈو...... بے بی از ڈرٹی...... بابا...... ویٹ ناٹی بابا واز میکنگ اے شیو۔ اینڈ ہز ڈریس از فیئر میڈم این...... بے بیز آر کیئرلیس بٹ یو؟" مارے طیش کے وہ بری طرح برس پڑی۔

اپیا کے پھول سے بچوں کا اتنا برا حال دیکھ کر وہ تڑپ اٹھی۔ "میڈم این! نائدر یو آر ہونیسٹ ود یور ڈیوٹی نور یو آر ایکٹو۔ سو آئی ڈس مس۔" وہ تھرا کر بولی۔

"سوری مس! آئی ایم ویری سوری، رئیلی۔"

دل میں چور تھا اس لیے جھینپ کر سوری کر رہی تھی۔

"از اٹ لاسٹ سوری؟" وہ برہمی سے پوچھ رہی تھی۔

"لیس مس۔" وہ گڑبڑا کر بولی۔

"آل رائٹ۔"

"تھینک یو مس اوہ گاڈ۔" وہ سینے پر صلیب کا نشان بنانے لگی۔

وہ پلٹی تو ٹھٹھک کر رہ گئی۔ سوئی سوئی آنکھوں کے ساتھ سامنے شاہ عالم کھڑا تھا۔ وہ اس کے چیخنے پر ساتھ کے بیڈ روم سے آ گیا تھا۔

"میرے بچوں کے ساتھ ہمدردی کا بے حد شکریہ اور آپ جو گورنس کو ڈس مس کرنے لگی تھیں۔ دوسری گورنس کے ملنے تک میں ان بچوں کا کیا کرتا؟"

"ہمارے ہاں چھوڑ دیتے۔" وہ رکھائی سے بولی۔

"گویا آپ ساری زندگی اپنا احسان مند رکھنا چاہتی ہیں۔"

"اس میں احسان کیا ہوا؟"

"ویسے ہی انھوں نے مجھے دن رات تنگ کر رکھا ہے۔ آپ کے پاس جانے کی ضد کرتے رہتے ہیں۔ خوب بگاڑ دیا ہے آپ نے۔ ان کے اسکول کے پرابلم۔ پھر مجھے بھی فرصت نہیں ہوتی۔"

آج شاہ عالم کا لہجہ بالکل اجنبی تھا۔

"آپا نے کس بری طرح گڑیا کو مارا ہے پتہ ہے؟" وہ غیض سے بولی۔

"اسے میں نے مارا ہے، آپا نے نہیں۔"

"اوہ میرے خدا اتنی سی بچی پر اتنا بھرپور ہاتھ؟" وہ اس کے ہاتھوں کو دیکھنے لگی۔

"مگر کیوں؟"

"ایک تو ویسے ہی گھر میں آتے ہوئے ذہن شل ہو جاتا ہے اس پر ان کی ضدیں۔"

"کتنے بے درد ہیں آپ؟"

"تھک گیا ہوں۔"

"بچوں کو میں لے جاؤں؟"

"نہیں......"

"کیوں؟"

"میرا بھگتان ہیں بھگت لوں گا۔"

"شام کو چھوڑ جاؤں گی۔"

"شکریہ۔ انھیں میرا عادی بننے دیں۔"

"صرف آج۔"

"جی نہیں، جب تک وہ آپ لوگوں کو ذہن سے بھلا نہیں دیتے، اس وقت تک سوری۔"

وہ باہر نکل گیا تو وہ بچوں کے کمرے میں چلی آئی۔

گورنس نے انھیں نہلا دھلا کر تیار کر دیا تھا۔

"خالہ جانی! آج میں نے بھی پپا کی طرح شیو کی۔ میرے گالوں پر بال آ گئے تھے نا۔" وہ اسے سمجھاتا ہوا بولا۔

"ہاں میرے بیٹے! تم جوان ہو گئے ہو اب۔"

وہ ہنس پڑی مگر بجھی بجھی سی۔

"بیٹا! آپ لوگ پپا کو تنگ نہ کیا کریں۔ ورنہ وہ باقاعدہ مارا کریں گے۔ مجھ سے کہہ رہے تھے ابھی۔"

"ہیں خالہ جانی۔" گڈو خوفزدہ ہو گیا۔

"ہاں بیٹا۔"

"پرسوں انھوں نے مجھے مارا تھا۔ آج گڑیا کو، خالہ جانی! ہمیں پپا سے ڈر لگتا ہے۔"

گڈو کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

اس کا کلیجہ کٹ کر رہ گیا۔

"بیٹے! آپ شرارت نہ کیا کریں نا۔" وہ اسے سینے سے لپٹا کر بولی۔ اس کی خود کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

***

کامران جنم جنم کا دیوانہ شاہ عالم کا۔ آج ماہی کے پاس اسے سمجھانے بیٹھا تھا۔ شادی کی تیاریاں زوروں پر تھیں مگر وہ ماہی کی طرف سے بھی مطمئن ہونا چاہتا تھا۔

"دیکھو ماہی! وہ کوئی ایجڈ تو نہیں ہے، بہت شان دار آدمی ہے۔ تمھیں زمانے کی فکر ہوگی کہ لوگ یوں کہیں گے۔ لوگ تو کہتے رہتے ہیں۔ میں یہ جانتا ہوں کہ اتنے اچھے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ یہ نہ سوچنا کہ وہ میرا دوست ہے تو تم میری بہت پیاری لاڈلی بہن ہو۔ ہم میں سے کوئی تمہارا برا نہیں چاہتا تم بچی نہیں ہو۔ اٹھائیس انتیس برس کی باشعور لڑکی ہو اور پھر گڈو اور گڑیا۔

"شاید تمھیں شاہ کے پہلے رشتے کی جھجک ہو تو گڑیا! ہم لوگ نئی رشتے داری نہیں جوڑ رہے بلکہ ہماری بہت سی مصلحتیں ہیں، دیکھو۔"

"کامی بھائی! میں کب انکار کر رہی ہوں۔ وہ بچے مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہیں۔ ان کے معصوم شکوے، ان کی موہنی باتیں، ان کی تنہائی خدا کی قسم مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔ وہ گورنس سوتیلی ماں سے بھی بری ہے۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

کامران اس کی پشت تھپتھپا کر باہر نکل گیا۔

***

اور آج سات سال پرانے انداز میں شاہ عالم کو دیکھ کر وہ متحیر سی تھی۔ کس قدر

چونچال نظر آ رہا تھا۔

آہ۔ مرد کا دل کتنا ہلکا ہوتا ہے۔ مجھے رتی برابر خوشی نہیں اور شاہ عالم کا وہی انداز جو پہلی مرتبہ مالی کو ڈانٹتے ہوئے دیکھنے میں آیا تھا۔

ہونہہ! تم مردوں نے عورت کو کیا سمجھ رکھا ہے۔ اس نے کروٹ بدل کر کوفت بھرے انداز میں سوچا۔

***

وہ صبح دیر تک پڑی سوتی رہی۔ شاہ نے میڈم این کو غالباً اسے جگانے بھیجا تھا۔ "آر یو اواکنگ مسز شاہ؟"

"یس......!" وہ غنودگی میں بولی۔

"دین۔ گیٹ اپ مسز شاہ۔" وہ کھڑکیوں کے پردے سرکا کر بولی۔

"اوکے۔" وہ بالوں کو سنوارتی اٹھ بیٹھی۔

"مسٹر شاہ......؟" اس نے جاتی این کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ہی از ان دی لائبریری، مسز شاہ!" (وہ لائبریری میں ہیں)

"میڈم این! ڈو یو نوٹ نو اردو؟"

"نو مسز شاہ۔ ریئلی۔"

"میرا تو بالکل منہ ٹیڑھا ہو جائے گا بڑی بی کے ساتھ۔" وہ سلیپر پاؤں میں اڑس کر باتھ روم کا رخ کرتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ برش کرتے ہوئے اس کی نظر آئینے کے کارنر پر پڑی۔ اپیا کی سونے کی نازک سی زنجیر پڑی تھی۔ اسنے ہاتھ بڑھا کر اٹھالی پھر کچھ سوچ کر اپنے گلے میں ڈال لی۔ ایک اکلوتا آنسو اس کے دائیں رخسار پر ٹھہر گیا۔

وہ میرون ساڑھی میں کچن میں چلی آئی۔ خانساماں تو ویسے بھی اس کا عادی تھا۔ سلام کر کے بولا۔

"ناشتا لگاؤں؟"

"ارے نہیں، کیا ناشتا۔ ایک انڈا فرائی کر دو اور دو سلائس رکھ دو اس میز پر۔ یہیں کر لوں گی ناشتا۔"

"وہ جی صاحب نے بھی ناشتا نہیں کیا۔ وہ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

اس کا جی چاہا کہ ناشتا ہی نہ کرے مگر خانساماں سے بولی۔

"اچھا پھر وہاں ٹیبل پر لگا دو اور صاحب کو بلا لاؤ۔"

وہ ناشتے کی میز پر پہنچی تو شاہ عالم نے اپنی جیتی جاگتی آرزو کو مجسم دیکھا اور سیر سا ہو گیا۔

گیلے کھلے بالوں میں فل آستین کے بلاؤز اور میرون ساڑھی میں وہ محض ایک طالبہ سی کالج و یونیورسٹی کی نظر آ رہی تھی۔

"کیوں بھئی، اچھی طرح تو سوئیں نا؟"

"بہت اچھی طرح۔"

"دیکھو بھئی یہاں کی ہر چیز پر تمہارا مکمل اختیار ہے۔ خوش رہو کیونکہ کسی کو خوشی دینا تو تمھیں آج تک آیا نہیں۔ کم از کم خوش ہی رہ لو۔

اور سنو، اب یہ ڈرامے بازی نہیں چلے گی۔ آج سے تم اور میں ایک بیڈ روم میں ہوں گے۔ بہت تنگ کیا ہے تم نے رات۔"

وہ مارے طیش کے کانپ کر رہ گئی۔

پچھلے رشتے بھلانا اس قدر آسان ہے جیسے اس سے میرا سابقہ کوئی تعلق نہ تھا۔ تھوڑا سا لحاظ، کچھ حجاب۔

"میں نے محض بچوں کی خاطر یہ سب کچھ کیا۔ وگرنہ آپ سے تو کیا مجھے ساری دنیا کے مردوں سے نفرت ہے۔"

"بہت لڑکیاں بولتی ہیں یہ ڈائیلاگ۔" وہ مسکرایا۔

"شاہ صاحب! میں بہت فراخ دل ہوں مگر اپنی انسلٹ کبھی نہیں بھول سکتی۔"

ارے بھئی، کیا انسلٹ کر دی میں نے تمہاری، اغوا کر کے تو نہیں لایا۔ باقاعدہ نکاح ہوا ہے۔ تمھارے دستخط میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں بھئی۔"

"شاہ صاحب! یہ مذاق نہیں ہے۔ آپ مجھ سے بطور شوہر کبھی بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کیجیے گا، ورنہ۔" اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

کامران اور دونوں بچے ہنستے ہوئے وہیں آ گئے۔

"خالہ جانی!"

"ارے گڈو! امی کہا کرو۔" آج اسے کامران نے ٹوکا۔ اس نے بھائی کی سمت اتنی

گہری نظروں سے دیکھا کہ کامران گڑبڑا سا گیا۔ پھر سنبھل کر بولا۔

"ہاں بھئی امی کہلوانا ورنہ بعد میں بڑی پرابلم ہو جائے گی کیوں شاہ......؟"

"مرضی ہے ان کی۔" اس نے قصہ ختم کر دیا۔



شادی کے چوتھے روز وہ شاہ کے ہمراہ اس کے دوست کے ہاں ڈنر پر جا رہی تھی۔

ڈارک براؤن کامدانی کی ساڑھی باندھے، بالوں کا سادہ سا جوڑا بنائے، اپنا کامنہ دکھائی والا سیٹ جان بوجھ کر پہن کر وہ اس کے سامنے آئی تھی۔ جانے وہ اسے کیا یاد دلانا چاہ رہی تھی۔

مگر شاہ نے سات سال پہلے والے انداز میں اسے دیکھا۔

کہاں وہ ماہی کہاں یہ سوبرسی گریس فل ماہی۔ وہ اس کے برابر بیٹھی تھی۔ شاہ نے بہک کر گاڑی کو روانی سے چھوڑ دیا۔ آج اس کے پاس رولس رائس بھی تھی مگر وہ ماہی جانے کہاں کھو گئی تھی۔ رولس رائس کی دیوانی۔

"اب اتنا تو نہ ترساؤ ماہی بیگم!" وہ ایک نگاہ وارفتہ پھینک کر بولا۔ "بس ختم کرو یہ سزا ورنہ اپنا راستہ الگ ہی رکھو تو، مگر نہیں۔"

وہ جیسے تڑپ کر رک گیا۔ "ماہی! مجھے کچھ کہنے کا حوصلہ دو۔ ماہی! میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"شاہ صاحب!" وہ اپنی انگوٹھیوں سے کھیلتی ہوئی بولی۔ وہ چپ رہا۔

"شاہ صاحب!" وہ دوبارہ گویا ہوئی۔

"جب تم شاہ صاحب کہتی ہو تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی مرشد باتکریم سے مخاطب ہو، مگر اس کے بعد کا طرز تخاطب، گویا مرشدوں کے حقے لوٹے دھونے والوں سے بھی گیا گزرا ہوں۔"

وہ تیزی سے موڑ کاٹ کر بولا تو اسے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ اتنے دن کی رفاقت میں پہلی مرتبہ۔ اس نے کھڑکی کی سمت رخ موڑ لیا مگر شاہ دیکھ چکا تھا۔

"ہاں! کیا کہہ رہی تھیں؟"

"کچھ نہیں۔" وہ بدستور باہر دیکھ رہی تھی۔

"اور ایک بات تم سے کہنا ہے ماہ رو۔"

وہ سر جھکائے ہمہ تن گوش تھی۔

"تم این پر زیادہ سختی نہ کیا کرو۔ ابا جی اسے لندن سے لائے تھے جب گڑیا سال بھر کی تھی۔ یہ تو تمھیں پتا ہی ہے بیوہ عورت ہے، بے حد ایمان دار۔ ابا جی کے پاس چھ برس سے تھی بطور منتظمہ۔ ہمارا وطن، ہم لوگ اس کے لیے اجنبی ہیں۔ ہمیں اس کی غلطیاں معاف کر دینی چاہئیں۔ اس کے ساتھ گھر کے فرد کا سا سلوک کرو۔ بہت وفادار ثابت ہوگی وہ تمہاری۔ وہ سختی کو اپنی انسلٹ تصور کرتی ہے۔ ہم اسے میڈم بلاتے ہیں۔"

"نوکروں کو دیکھنا تو پڑتا ہی ہے۔ وہ تو ملازمہ ہے، یہاں تو مالکوں کو روز ہی انسلٹ برداشت کرنا پڑتی ہے۔"

اس کے لہجے میں زمانے بھر کی سرد مہری سما گئی تھی۔ ایسا جگر کاٹتا لہجہ کہ شاہ نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

"میں سمجھا نہیں۔"

"میں سمجھا نہیں سکتی۔"

شاہ چپ ہوگیا۔

ڈنر بہت شان دار تھا اور بھی جوڑے مدعو تھے۔ ماہ رو نے کئی سرگوشیاں سنیں جو عورتوں نے کی تھیں۔

"یہ تو کنواری تھی، اس کی بڑی بہن تھی پہلے شاہ کے ہاں۔ بے چاری جوانی میں ہی دنیا چھوڑ گئی۔ آہ۔"

"شاہ کے تو مزے آ گئے بھئی۔ قسمت اچھی ہے۔ سالی ابھی تک بیٹھی تھی۔"

"اے شاہ کون سا کم ہے۔ تم ہی کہو لگتا ہے دو بچوں کا باپ؟" کسی خاتون نے رائے لی۔

"سچی زمانے کے سرد و گرم تو شاہ کو چھو کر بھی نہیں گزرے۔"

"مگر وہ کچھ خوش نہیں لگتی۔ او بھلا کیا کمی ہے شاہ میں۔ خوبصورت، اسمارٹ، محفلوں کی جان، دولت مند، کیا ہوا جو دو بچے ہیں۔ بچے بھی اسی کی بہن کے ہیں۔"

وہ سر تھام کے بیٹھ گئی۔ بس ان خواتین کو موضوع ملنا چاہیے۔ واپسی میں شاہ نے محسوس کیا کہ وہ بہت گم صم ہے۔ وہ اسے چھیڑنے کا ارادہ ترک کر کے خاموشی سے ڈرائیونگ کرنے لگا۔

کالج تو اس نے چھوڑ دیا تھا خود بخود۔ بس گھر اور بچوں میں مصروف ہو کر رہ گئی۔ پانچوں وقت کی نماز باقاعدہ پڑھنے لگی تھی۔ گھر آئینہ تمثال بن گیا تھا۔ بچے ہمہ وقت پھولوں کی طرح نکھرے نکھرے نظر آنے لگے تھے۔

شاہ کی وارڈ روب میں کپڑے فل میچنگ سے تیار رہتے۔ شو ریک میں جوتے تیار سجے ہوتے۔ شاہ بہت قدر دان تھا۔ امی، پاپا، کامران مطمئن۔

مگر وہ اس قدر خاموش، اتنی اداس رہتی گویا اب رو پڑے گی۔

اس کے اس رُوپ کا تو وہ تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔

"رات کو میرے لیے کافی لانا، مجھے تم سے ضروری بات کرنا ہے۔" شاہ بچوں کے کمرے میں آ کر اسے کہہ گیا تھا۔

وہ اب کافی کا سامان سجائے اس کے کمرے میں موجود تھی۔ بلیو پلین ساڑھی میں بالکل سادہ، بائیں رخسار پر سجا تل اس کا قدرتی سنگھار تھا۔ بال کھلے ہوئے پشت پر لہرا رہے تھے۔ اس کے بال زیادہ تر کھلے رہتے تھے۔

اس نے کافی بنائی اور پیالی تپائی پر رکھ دی۔

"تم نہیں لوگی؟"

"نہیں۔"

وہ ضروری بات کے انتظار میں تیار بیٹھی تھی۔ شاہ کافی ختم کر کے باتھ روم چلا گیا۔ یہ کہہ کر برش کر کے ابھی آیا۔

واپس آیا تو نائٹ سوٹ میں تھا۔

اسے الجھن ہونے لگی۔

شاہ دروازے کی سمت بڑھا اور دروازہ لاک کر دیا۔

وہ چونک کر کھڑی ہوگئی۔

"ارے اس طرح تو نہ گھبراؤ، میں کوئی ولن نہیں تمہارا شوہر ہوں۔"

"یہ آپ نے دروازہ کیوں لاک کر دیا؟" وہ برہمی سے گویا ہوئی۔

"بچوں کے ڈر سے کہیں تمھیں پوچھتے ہوئے یہاں نہ آ جائیں۔"

"وہ سو رہے ہیں۔"

"یہ تو اور اچھا ہے۔" وہ مسکرایا "پھر......؟"

وہ بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''موڈ ٹھیک کروانا۔''

''وہ کیا ضروری بات تھی؟'' وہ بہت ضبط سے پوچھنے لگی۔

''کہ اب مجھے تنگ نہ کرو۔''

''جی......؟''

''دیکھو تم کوئی بچی نہیں ہو، بس اب زیادہ نہ ستاؤ۔''

''میں آپ پر تمام امور واضح کر چکی ہوں کہ......''

''بکواس کرتی ہو تم۔'' وہ اتنی زور سے گرجا کہ وہ سہم سی گئی۔ پھر سخت حیران ہوئی۔

شاہ جنونی انداز میں اٹھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا بیڈ تک لایا اور زور سے اسے دھکیلا۔

''تم اتنی زور آور ہو کہ میری تقدیر کے رخ موڑ دو؟ مگر میں تمھیں اب خود سے کھیلنے کی اجازت نہیں دوں گا۔''

وہ دوسری سمت کھسک گئی۔

''ہوش تو ٹھکانے ہیں آپ کے یا آپ نے مجھے ذلیل کرنے کا ٹھیکہ لے لیا ہے۔ مجھے جانے دیں۔ مجھے آپ کی ذہنی حالت پر شبہ ہو رہا ہے۔'' وہ نفرت سے اسے دیکھ کر بولی۔ مجھے آپ جیسے مردوں سے نفرت ہے۔ کبھی یہی ڈرامہ آپ نے میری بہن کے ساتھ کیا تھا۔ آج مجھے بے وقوف بنا رہے ہیں۔''

''ہر بات کی ذمہ دار تم ہو۔ میں اوّلین روز سے تمہارا طلب گار تھا۔ یہ تقدیر کا مذاق تھا کہ ماہ رخ میری ہوگئی۔'' وہ سنبھل کر بولا۔

''جب میں نے سنا کہ ماہ رخ کا رشتہ طے ہو رہا ہے تب میں نے بجو کو تمھارے لیے بھیجا۔ ہاں میں نے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں تمھارے عشق میں مبتلا ہوں۔ مجھے ڈر تھا کہ تم ضد میں الٹ کام کرنے کی عادی ہو۔ کہیں انکار نہ کر دو۔ یہ میری عورت کے ہاتھوں بہت بڑی توہین ہوتی ماہ رو بیگم کہ تم سے زیادہ آن ہے میرے مزاج میں۔ میں چاہتا تھا بجو اپنے طور پر بات کریں۔ بس یہ میری غلطی تھی۔ مجھے واقعی اپنی بہن کو شریک راز کر لینا چاہیے تھا۔ بس میری نیت تھی کہ سب کو یہ کام یہ رشتہ اتفاقیہ لگے اور میں عاشقی کا اعتراف تمھیں بیوی بنانے کے بعد کروں۔ جانے کیوں مجھے بھرم بہت عزیز ہے۔ آج میں نے تمھارے سامنے حرف حرف حقیقت بتایا ہے۔ اب تو میری سزا میں تخفیف کر ڈالو۔''

وہ بیڈ سے نیچے لٹکتا اس کی ساڑھی کا آنچل اٹھا کر اس پر ڈالتا ہوا بولا اور اس کا ادھر سانس اٹک کر رہ گیا تھا۔ گویا وہ صحیح سمجھی تھی۔ درست سمجھی تھی۔

وہ رخ موڑتے ہوئے بولی۔

''آپ کیا سمجھتے ہیں۔ میں آپ کے جذبوں سے بے خبر تھی؟ آپ کے رشتہ مانگنے پر میں نے زمین میں زندہ دفن ہونا چاہا تھا۔ میں نے اسے آپ کا کوئی انتقام، کوئی مذاق جان لیا تھا۔ اتنی بڑی توہین ماہ رو کی کسی نے پہلی بار کی تھی۔ کس طرح جھیلی ہوں، خبر نہیں۔ مگر شاہ صاحب میرے دل میں آپ کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ آپ نے میری بچی، ایمان دار آپا کو بھی بے وقوف بنایا۔ انھیں اندھیرے میں رکھا۔'' اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ''ان کے ساتھ بے ایمانی کی۔''

''یا پھر؟'' وہ رک گئی۔

''یا پھر......؟'' شاہ بے قرار ہو گیا۔

''یا پھر اب دھوکا کر رہے ہیں اپنا آپ منوانے کے لیے۔''

''میں تمھیں مزید یقین نہیں دلا سکتا۔'' وہ بہت شکستہ تھا۔

''ماہ رو! میں نے ماہ رخ سے دھوکا نہیں کیا۔ وہ اتنی اچھی، اتنی شاندار تھی کہ میں نے تمھیں فراموش کر دیا کہ ماہ رو! جب ہم بے بس ہو جاتے ہیں تو یا نیکیاں کرنے لگ جاتے ہیں یا گناہ، مگر ماہ رو! اب احساس ہوتا ہے سات سال سے میں ماہ رخ کے محبتوں کے قرض چکا تا رہا ہوں۔ میرا اس پر محبتوں کا کوئی احسان نہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں تمھیں فراموش کر رہا ہوں۔ درحقیقت میں خود کو فراموش کر رہا تھا۔ میں حقوق و فرائض کے گورکھ دھندے میں خود کو پھنسا رہا تھا مگر میں نے ماہ رخ سے شادی کے بعد ایک بار بھی تم پر نگاہ غلط نہیں ڈالی کہ میں نے سمجھوتہ کر لیا تھا۔

میں ماہ رخ سے وفا کرتا رہا ہوں۔ تمھیں میں اب اس کا حساب آج تک نہیں چکا پایا کہ تم جذبوں کی راکھ تلے چنگاری بنی پڑی سوتی تھیں۔

میں امتحانوں سے گزرتا رہا ہوں۔ میں چاہتا تو ماہ رخ کو نظراندازی کے تیر مار دیتا۔ شاید پھر چھ برس پہلے وہ مجھے چھوڑ جاتی۔ مگر ماہی! میں شاید بدنظر ضرور ہوں۔ بدباطن نہیں۔ میں جانتا تھا کہ قصور انا پرستوں کا ہے۔ ماہ رخ کا نہیں۔

اب میرے پاؤں کے آبلوں پر محبتوں کے مرہم رکھو یا مجھے تنہا چھوڑ دو۔ اب میں

تھک گیا ہوں۔

بہت تھک گیا ہوں۔ بہت زیادہ۔ بہت کہ اب میں سپر ڈالنا چاہتا ہوں، ہر ماحول میں جی سکتا ہوں۔ احسان تھکن تم نے اور بڑھا دیا ہے۔

اب فیصلہ کن بات کرنا ماہ رو!"

اس نے نڈھال لہجے میں کہا۔

"اور ماہ رو تم مجھ سے خدا کے واسطے نیکیاں نہ کرنے لگ جانا یا تو کھلی دشمن بنو یا کھلی دوست۔ سن رہی ہو؟"

وہ ایک ٹک، ساکت و جامد تھی۔

"تم کچھ بولتی کیوں نہیں ماہ رو؟"

"غلطی آپ نے کی تھی شاہ صاحب! ہمارا گھرانہ اس قدر ایڈوانس نہیں تھا۔ احسان علی سے میری منگنی میری رضا کے بغیر ہوگئی تھی۔ کتنے فیصد لڑکیاں ہیں جو اپنی شادی پہلے لڑکے سے مل کر طے کرتی ہیں؟"

وہ کس قدر گہری بات کہہ گئی تھی۔

"وہ وقت اور اس وقت کے تقاضے کیا تھے؟ میں سمجھا نہیں سکتا نہ تم سمجھنا چاہو گی۔" وہ بہت شکست خوردہ تھا۔

وہ ساڑھی سمیٹ کر اُٹھ بیٹھی۔

"اب کیا کہتی ہو؟"

"وہی جو آپ کے نکاح میں آنے کے بعد کہا تھا۔ آپ نے میری توہین کی، مسلسل کی۔ مجھے آپ قطعی درگزر کے قابل نہیں لگتے۔" وہ اترنے کے لیے جھکی تو اس نے ماہی کو شانوں سے تھام کر بیڈ کی پشت پر ٹکا دیا۔

"نہ مجھے تمہاری معافی کی ضرورت ہے نہ درگزر کی۔ میاں بیوی میں معافیاں خود بخود ہو جاتی ہیں۔"

"چلو، آرام سے سو جاؤ۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

"ہونہہ مطلبی۔" وہ دل ہی دل میں پھنکاری۔

"شکریہ۔" وہ نخوت سے ناک چڑھا کر بولی۔

"دلوں میں میل رکھ کر محبتیں نہیں ہوتیں۔" وہ جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ شاہ نے

اسے جھٹکا دیا جس کی اسے توقع نہیں تھی۔

"دل کا میل کب صاف ہوگا؟" وہ جھکا۔

"کبھی نہیں، آپ کے نزدیک ہوتی ہوں گی یہ سب باتیں، میں بہت سنجیدہ ہوں۔ آئی ڈس لائک یو۔ انڈر اسٹینڈ؟"

چہرے سے چہرہ قریب تھا۔ دل اس سے بھی قریب۔ جذبے بے فاصلہ تھے۔ شاہ اتنی نفرت نہ سہ سکا۔ ایک دم اسے چھوڑ دیا۔

"پھر تم اس گھر میں کیوں ہو۔ میں نے تمہاری کبھی انسلٹ نہیں کی مگر آج پوچھ رہا ہوں کیوں ہو اس گھر میں، کیا حق ہے تمہارا......؟"

"میں آپ کو بتا چکی ہوں پہلی ہی شب کو۔"

"بچے یتیم خانے میں نہیں ہیں۔ باپ کے گھر میں ہیں اپنے سمجھیں......؟"

اس نے جھٹکے سے الماری کھولی۔ لاکر سے نوٹوں کی کئی گڈیاں نکال کر اس کے سامنے ڈال دیں۔ "اٹھا لو یہ مہر معجّل۔ اب تو قریب آنے دو۔" وہ کٹیلے پن سے مسکرا دیا۔

"اوہ!" وہ سرخ ہوگئی۔ قدم لڑکھڑا گئے۔

شاہ نے تھام لیا۔ "اسے کہتے ہیں توہین۔ سمجھیں ماہ رو بیگم!" شاہ جنونی ہو رہا تھا۔

"اگر ڈائی وورس (طلاق) چاہتی ہو تو مجھے میرا حق تو دو۔ تب ہی تو تمھیں خود پر حرام کروں گا۔"

"شاہ!" وہ چیخ پڑی۔ بھاگ کر دروازے تک گئی۔ دروازہ لاک دیکھ کر وہیں ٹک کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"لاک کھولیں، خدا کے لیے لاک کھولیں۔"

شاہ نے لاک کھول دیا۔

"ماہی! جتنی آزمائش تم نے میری کی ہے۔ خدا کرے تم بھی ایسی آزمائش میں ڈال دی جاؤ۔ تب ہی تمھیں میری سمجھ آئے گی۔" اس نے اس کے سرخ چہرے پر تپتی نظر ڈال کر کہا۔

وہ روتی ہوئی باہر نکل آئی، اپنی ذات کی طاقت کے احساس نے وقت گریہ بھی سرشار کر دیا۔ شاہ کو آج بھی پچھاڑ دیا تھا۔ کیا کر لیا آخر اس نے۔

رونے کی وجہ سے نیند بھی گہری آئی۔

اٹھتے کے ساتھ ہی وہ اپنے رات کے فیصلے پر عمل پیرا ہوئی۔ بچے اسکول جا چکے

تھے۔شاہ کا پتا نہیں تھا۔

اس نے ڈرائیور کو دیکھا۔ شاہ اپنی ڈاٹسن لے کر گیا تھا۔ پہلے ڈاٹسن اباجی کے استعمال میں تھی۔اب شاہ کی رولس رائس پورچ میں تھی۔

اس نے خان کو گاڑی نکالنے کو کہا۔

اپنا بیگ لے کر جب وہ گاڑی میں بیٹھ رہی تھی شاہ کی گاڑی نظر آئی۔ گویا وہ آج ہاسپٹل نہیں گیا تھا۔

ایک لمحے کو دونوں کی نظریں چار ہوگئیں۔

شاہ کی نظر اس کے اعصاب پر نوبت بجا گئی۔

"چلو خان۔" اس نے میکے کا راستہ بتایا۔

گلشن سے ڈیفنس تک کا راستہ۔اس نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

وہ چمکتی آنکھیں تصور میں آ گئیں۔

کیا واقعی آج شاہ میری زندگی سے نکل گیا؟

نکال تو میں نے چھ برس پہلے دیا تھا۔ وہی شاہ جس کو پانے کے احساس نے مجھے پہروں جگایا تھا۔ یہ وہ شاہ نہیں۔تو یہ ڈرامہ باز ہے۔ بے ایمان ہے۔اپنا کو مطمئن کرنے والا، مجھے بنانے والا، ضمیر کی چیخوں پر نیکیاں کرنے والا۔

اس نے سر ہاتھوں سے تھام لیا۔

تو بھی تو آج تک خود فراموشی کے ثواب کما رہی تھی ماہی۔

تیری فطرت تڑپانے والی ہے مگر تو تڑپتی رہ ساری زندگی اب۔تو نے چاہا شاہ جیسا شان دار آدمی تیرے سامنے ٹوٹ جائے۔ وہ ٹوٹتا رہا۔اب منہ دھو رکھو۔اب وہ تجھے لینے نہیں آئے گا۔وہ عورتوں پر پی ایچ ڈی کی ڈگری نہیں لیے ہوئے۔ تیری انا کے تقاضے اس کے پلے نہیں پڑتے۔وہ واقعی اب تھک گیا ہے۔

سارے باب بند کر آئی ہے آج تو۔ وہ تیرے پیچھے نہیں آئے گا۔ بچے اس کے ہیں۔فکر تجھے؟ اپنا پاپی من ٹٹول ماہی! تو بہن کی خاطر فراموش کر رہی تھی خود کو؟ تو بھی قربانیوں کا چارا ضمیر کے آگے ڈال کر تنی تنی پھر رہی تھی کہ نہیں۔

اتنا بھی کسی کو نہیں ستاتے۔ دل توڑنا تو تجھ سے سیکھے کوئی۔ اپنا خدا آپ بن بیٹھی ہے۔اپنے جس عمل کو چاہے نیکی بنا دے۔ثواب بھی خود ہی لے لے۔

تباہ کر لیا تو نے اپنا آپ۔اس اکڑ کے پیچھے۔ذہن میزان تھا۔منصف تھا۔ضمیر کے گلے لگ کر اس کے عیب چھانٹ رہا تھا۔

وہ نہیں آئے گا۔

نہیں آئے گا۔

تو مر بھی جائے تو نہیں آئے گا۔ بچے پوچھیں گے تو کہے گا۔تمہاری دوسری ماں بھی مرگئی۔تمہاری پہلی ماں خدا کی مرضی سے مرگئی۔دوسری ماں اپنی مرضی سے۔

آج بچے ماہی تیری جان کو روئیں گے۔

کئی دن روئیں گے تو تو ان کے ساتھ بھی کھیل کھیل گئی۔ ماہی کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔دونوں بچوں کے تصور سے کھیلنا ہی سیکھا ہے کچھ جھیلنا بھی سیکھ۔

ساری غلطیوں کے بھگتان، سارے غلط فیصلوں کے عذاب شاہ کی جان کو جاتے تھے۔

وہ تھکا تھکا سا۔

الجھا الجھا سا۔

وہ سونے کی شوقین گورنس۔

پھول سے معصوم بچے۔

وہ ہاتھ دھو بیٹھا ہے تو منہ دھو رکھ۔اب یہ انا یوں ہی تڑپتی کلستی پھرے گی۔ جا چلی جا۔ اس کی تھکن دونوں ہاتھوں سے سمیٹ لے۔ چل اب یہ خول اتار دے۔ اپنی اصلیت آشکار کر دے۔محرم راز بنا لے۔مشکلیں آسان ہوں گی۔مشکلیں آسان ہو جائیں گی تو وقت سہل!

"خان! ایک منٹ۔"

وہ آنکھوں پر گلاسز چڑھا کر آہستگی سے گویا ہوئی۔

"شاہ خانہ واپس چلو۔"

"کچھ بھول آیا آپ بیگم صاحبہ......؟"

"ہاں، سب ہی کچھ......"



خط جو پوسٹ نہ ہو سکے

مکرمی روحیل صاحب!

آداب۔

آپ کا خط مسعود بھائی کے ذریعے ملا...... ابھی تک جان سوکھے پتے کی طرح کانپ رہی ہے۔ یہ آپ نے کیا کیا مسعود بھائی کو رازدار بنالیا؟ اب تو مجھے ان کا سامنا دوبھر ہے۔ اُف کیا سوچتے ہوں گے مسعود بھائی، آپ کو میرا ذرا خیال نہ آیا؟

رات سب گھر کے نوجوان تاش کھیل رہے تھے۔ کچھ دوسرے کزنز بھی آئے ہوئے تھے۔ یہ سب شیطان کی خالائیں چھت پر بیٹھی گپیں مار رہی تھیں۔ مجھے کئی بار چائے بنا کر اندر پہنچانا پڑی۔ ہر بار مسعود بھائی کی شریر مسکراہٹ نے میرے اوسان خطا کیے۔ سچ آپ نے میرے ساتھ بہت زیادتی کی ہے...... آپ کو مجھ پر ذرا ترس نہیں آتا؟

فقط:۔ زیبا پاکستان

مکرمی روحیل صاحب!

تسلیمات۔

آج پورے دس دن بعد آپ کا خط ملا۔ آپ نے جواب نہ لکھنے کی شکایت کی ہے۔ آپ نے لکھا ہے۔ مسترد کرنے کا مجھے پورا حق ہے، مگر واضح خط تنسیخ پھیرنا ازبس ضروری ہے، وگرنہ آپ اس کی ڈوری سے لٹکے رہیں گے۔

ہائے اللہ...... آپ کے علاوہ تو دوسری سوچ ہی میرے پاس نہیں۔ مسعود بھائی کئی بار معنی خیز انداز میں میرے پاس آئے تھے...... میں اگرچہ خط تو لکھ چکی تھی مگر میری ہمت نہیں پڑی...... حالانکہ یہ میری بخت آوری ہے کہ دیارِ غیر میں آپ مجھے اور صرف مجھے یاد کرتے ہیں۔ مگر میں کیا کروں، مجھے ڈر لگتا ہے تماشا بننے سے۔ آپ مسعود بھائی کو کہہ دیجیے گا، وہ اپنی مسکراہٹ سے مجھے چھیڑا نہ کریں...... ورنہ میں مر جاؤں گی...... دل چاہ رہا ہے بہت طویل خط

لکھوں، اس لیے کہ رات دو بجے آپ سے اس طرح باتیں کرنا بہت اچھا لگ رہا ہے مگر...... چلیں پھر سہی؟

؎ کتنی سنسان ہے چمن کی فضا
دل دھڑکتا ہے آشیانے میں

فقط، زیبا

جناب عالی!

آداب عرض۔

؎ آج بچھڑے ہیں تو کل ہم پھر کہیں مل جائیں گے
کچھ بھی ہو موجیں کہاں جائیں گی ساحل کے سوا

پھر وہی گلہ جواب نہ لکھنے کا۔ کل میں کچن میں تھی تو مسعود بھائی آ گئے۔ انھوں نے دبے لفظوں میں مجھ سے یہی پوچھا تھا۔ آیا میں نے جواب لکھ لیا ہے یا نہیں؟ اسی دم زری آپا اندر آ گئیں مجھ سے تو پہلے ہی جواب دینا دوبھر تھا۔ آپا کے آتے ہی دل دھک سے رہ گیا۔

مصلحت نے بزدل سا بنا رکھا ہے اور پھر میں لکھے ہوئے خط سے کچھ مطمئن بھی نہیں تھی۔ سوچا تھا اور ذرا ٹھیک سا لکھوں گی۔ ہر بار خط لکھ کر یہی خیال آتا ہے، کہیں اس بات کا مطلب آپ یہ نہ سمجھ لیں...... کہیں وہ نہ سمجھ لیں، کیا کروں، ہمت سی نہیں پڑتی۔ مگر حال یہ ہے۔

؎ میں جہاں پر تھا، وہاں سے لوٹنا ممکن نہ تھا
اور تم بھی آ گئے تھے کچھ پاس دل کے سوا

فقط:۔ زیبا

سرکار!

تسلیمات۔

آج مسعود بھائی نے جو آپ کا خط دیا ہے، اس میں آپ کی ناراضگی عروج پر ہے اور میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے ہیں۔ آپ کے خط میں لکھے اس شعر کو اتنی بار پڑھا ہے کہ وظیفہ سا بنتا لگ رہا ہے۔ آپ نے لکھا ہے:

؎ کم سے کم حرفِ تمنا کی سزا اتنی تو دے
جرأت جرم سخن بھی مجھے آئندہ نہ ہو

کاش! میں آپ کو اپنے جذبوں کی ایک ایک لہر منتقل کر سکتی۔ مسعود بھائی ایک ہفتے کے لیے پشاور گئے ہوئے ہیں۔ میں اور کسی کو خط پوسٹ کرنے کے لیے ہرگز نہیں دے سکتی۔ دیکھیے ناں روحیل صاحب بنتی مدت میں ہے بگڑتی گھڑی میں ہے۔ میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ اس بار آپ کو ہر صورت جواب بھجواؤں گی۔ اگر آپ ناراض ہوں گے تو میرا کیا ہوگا؟ سچ آپ میری مجبوری کو بھی مدنظر رکھیں اور یہ آپ کو کیا ہوا تھا کہ مجھ جیسی دقیانوسی، بزدل اور بے مایہ سی لڑکی کو پسند کر بیٹھے؟ جہاں آپ ہیں، وہاں تو رنگ و بو کا سیلاب ہے۔ جذبات کے اظہار کی آزادیاں ہیں۔ آپ کو بھلا کیا نظر آیا ہے مجھ میں؟ مسعود بھائی آئیں گے تو فوراً انھیں یہ خط دے دوں گی، پھر آپ کو کوئی شکایت نہ ہوگی۔

فقط:۔زیبا

روحیل......!

السلام علیکم!

سچ مسعود بھائی کی واپسی میں بہت ہی دیر ہو گئی تھی...... خط تو میں نے لکھ لیا تھا، لیکن آج جب آپ کا تازہ خط ملا تو محسوس ہوا تو پچھلا خط ناقص و نامکمل تھا، سوچا پھر لکھ لیتی ہوں، ہرج ہی کیا ہے۔ آپ کا خط میرے سامنے کھلا رکھا ہے، شکایت، گلہ، ناراضگی اور...... آپ بالکل حق بجانب ہیں......مگر دیکھیے ناں۔ مسعود بھائی جو گئے ہوئے تھے......کل آئے تو ان کی ڈاک اچھی خاصی جمع ہو چکی تھی۔ انھوں نے آتے ہی آپ کا خط دیا۔

میں باتھ روم کا فرش دھو رہی تھی۔ عجیب سا حلیہ ہو رہا تھا۔ مسعود بھائی نے کھلا ہوا دروازہ ناک کر کے مجھے متوجہ کیا۔ میری حالت غیر ہو گئی۔ جب وہ آپ کا خط دیتے ہیں تو میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ کام دراصل ہے بھی تو رِسکی...... بڑی احتیاط سے اپنا فرض ادا کر رہے ہیں۔ مگر مجھے اب ان سے بہت شرم آتی ہے۔ کس جنجال میں جان ڈال دی ہے میری؟

آپ نے میرے حالات دریافت کیے ہیں کیا بتاؤں؟

ے تجھے خبر ہے تیرا انتظار گھر میں رہا
یہ حادثہ ہے تو عمر بھر سفر میں رہا

زیبا

روحیل......!

السلام علیکم!

تازہ ترین خط ملا......اب تو یہ حالت ہے۔

ے نام بھی پہچان لیتے ہیں قیافہ دیکھ کر!!
خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر

آپ کی ناراضگی بجا سہی مگر یہ مسعود بھائی...... سچ پتا نہیں ان کی زندگی اتنی بے ترتیب کیوں ہے۔ رات ان کے کمرے کی لائٹ جلی دیکھ کر میں نے کچھ ہمت باندھی اور ایک عزم صمیم کے ساتھ ان کے کمرے کی طرف چلی۔ آپ کو پتا ہی ہے، میرا اور پارو کا کمرا تو بالکل ہی آخر میں ہے اور مسعود بھائی کا کمرا شروع ہی میں پڑتا ہے۔ ایک تو پارو کے ٹیسٹ ہو رہے ہیں، دیر تک پڑھتی رہتی ہے۔ میں لفافہ تیار کر چکی تھی۔ پارو کے سونے کا انتظار کر رہی تھی، یہ بھی دھڑکا تھا۔ مسعود بھائی سو نہ جائیں۔ پارو کے سوتے ہی میں ان کے کمرے کی طرف بڑھی اور سر پیٹ کر رہ گئی، وہ رمیز، عمر اور صبیح کے ساتھ بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ میں کتنی بے چارگی کے عالم میں اُلٹے پاؤں واپس آئی تھی۔ اس قدر جذباتی اور ہلکان ہو رہی تھی کہ مارے غصے کے لفافہ پرزے پرزے کرنے کو جی چاہا۔ بڑی مشکل سے خود پر کنٹرول کیا۔

کیا زندگی ہے میری بھی؟ بڑا ترس آیا خود پر......! پھر آج پانچواں دن ہے جو مسعود بھائی نظر آئے مگر ان کے ہاتھ میں آپ کا تازہ خط پھر مجھے امتحان میں ڈال چکا تھا۔ آپ کے ہر نئے خط کے بعد اپنا جواب ادھورا محسوس ہوتا ہے اور خط از سرِ نو لکھنا پڑتا ہے۔ ویسے آپ کتنے مستقل مزاج بلکہ کٹر ہیں۔ داد دینا پڑتی ہے اور اپنی دلی کیفیت کیا لکھوں؟

ے جب تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

بہت ہی شرمندہ......زیبا

میرے روحیل!

ے لب پہ آئے جو قتیل اسم گرامی ان کا
چاندنی سی میری آنکھوں میں بکھر جاتی ہے

خط کے سارے تکلفات اب بوجھ لگنے لگے ہیں۔ بس دل چاہ رہا ہے۔ لکھتی جاؤں،

لکھتی جاؤں...... الفاظ کا ایک ہجوم ہے، مگر اس کی ترتیب محال ہے۔

آپ نے لکھا ہے کہ آپ نے میرے بارے میں غلط اندازہ لگایا اور یہ کہ میں نے آپ کے جذبات اور احساسات سے کھیلنے کی کوشش کی ہے...... بہت نفرت ہوئی اپنے آپ سے، یہ سب پڑھ کر...... ظاہر ہے، آپ بھی انسان ہیں۔ مجھے آپ کی مجبوریوں کا اندازہ ہے...... آپ کو اس خاندان نے کیا مقام دیا ہوا ہے۔ یہ بھی میرے علم میں ہے...... میرا بس چلے تو آپ کو اپنے نصیب کے سکھ بھی دے ڈالوں۔

مگر...... آپ کے بنا میری زندگی میں کوئی سکھ ہی کہاں؟ آپ کے علاوہ میرا ذہن کچھ اور تو سوچتا ہی نہیں...... کل آپ کا فون آیا تھا...... مسعود بھائی بلانے آئے تھے، مگر بڑی ممانی مجھ سے عبیر بھائی کے جوڑے ٹنکوا رہی تھیں۔ مسعود بھائی نے غالباً مجھے سنانے ہی کو راہداری میں کہا تھا...... روحیل کا فون آیا ہے، مخاطب جانے کس سے تھے۔

وہ تو کہہ کر واپس چلے گئے۔ بڑی اماں جو قریب ہی تھیں اور جنھیں شاید مسعود بھائی نے دیکھا نہیں تھا۔ وہ ان کے پیچھے ہی چل پڑی تھیں، پھر ان سے ریسیور کون لے سکتا تھا؟ مجھے مسعود بھائی کی نادانی پر سخت غصہ آیا...... اشارے سے بھی تو کہہ سکتے تھے۔ آج جب میں انھیں یہ خط دینے جاؤں گی تو جتاؤں گی ضرور، سچ مارے تاسف کے رات بھر نیند بھی نہیں آئی...... دل تو چاہ رہا تھا، ٹھاٹ سے سوئے مسعود بھائی کو اٹھا کر خوب لتاڑوں مگر......؟ روحیل! میں ان کے سامنے بہت گھبراہٹ محسوس کرتی ہوں۔ آپ ان سے میرے متعلق تو ضرور کچھ نہ کچھ کہتے ہوں گے۔ اُف! سوچ کر بڑی شرم سی آتی ہے۔ کیا سوچتے ہوں گے......

مسعود بھائی؟

فقط:۔ زیبا

روحیل......!

تسلیمات!

آج پورے ڈیڑھ ماہ بعد گاؤں سے واپس آئی ہوں۔ امی نانا جان کے چہلم سے پہلے گھر واپسی پر راضی نہ تھیں۔ پارو کے پاس تو ایگزام کی ڈھال تھی۔ اس کا تو ویسے بھی کبھی گاؤں میں دل نہیں لگا، وہ تو ''دسواں'' نمٹا کر بابا جان کے ساتھ گھر واپس آ گئی تھی۔ مگر امی نے مجھے آنے نہیں دیا کہ میرے ساتھ ہی چلنا......!

غالباً مسعود بھائی نے آپ کو میرے گاؤں جانے کی اطلاع دے دی تھی، اسی لیے ڈیڑھ ماہ میں آپ نے صرف ایک خط لکھا ہے۔ میں اپنے کمرے میں آ رہی تھی کہ مسعود بھائی نے مجھ سے کہا کہ تمہارا خط میرے ٹیبل کور کے نیچے رکھا ہوا ہے۔

ان کی موجودگی میں تو میں ان کے کمرے میں نہیں گئی مگر جب وہ آفس چلے گئے تو میں فوراً خط نکال لائی تھی۔ اس خط میں زیادہ گھن گرج نہیں ہے۔ غالباً آپ کو نانا جان کے انتقال کی اطلاع مل گئی تھی۔ آپ نے جو میرے تاثرات نوٹ کیے۔ وہ قطعی فریب نہیں، آپ یقین کر لیں۔ بس میں ذرا دقیانوسی اور کم ہمت ہی ہوں، جو پیام آپ کے احساسات کے مظہر تھے، مجھ تک پہنچے، میں نے فوراً جواب دیے، مگر یہ جواب میری حدود سے پار ہو کر آپ تک نہ پہنچ سکے۔

یاد ہے، رومی آپی جب امریکہ سے آئی ہوئی تھیں، گھر میں کس قدر ہنگامے اتر آئے تھے۔ خاندان بھر میں دعوتیں ہو رہی تھیں۔ انہی بہانوں میں ایک بار میں نے بڑے دل سے اپنی آرائش کی تھی۔ سفید ٹشو کے سوٹ کے ساتھ پھولوں کا زیور پہنا تھا مگر اس دن آپ بہت دیر سے گھر آئے تھے۔ جس قدر میرا سنگھار پرانا ہو رہا تھا۔ اس درجہ ہی دل بھر بھر آ رہا تھا۔ اس روز مجھے سب نے تعریفی کلمات سے نوازا تھا۔

مگر آپ کے آنے کے بعد جب میں راہداری میں تالا ڈال رہی تھی تو آپ نے میرے پھولوں کے زیور کو بڑے سادہ سے انداز میں سراہا تھا۔ آپ کو پتا ہے، میں جو آپ کے دیر سے آنے پر شاکی تھی، اس رات ایک نظم کہہ بیٹھی تھی، وہ یہ تھی۔

رات گئے گھر آ کر
میری آرائش سراہنے والے
یہ گجرے......
میں نے شام کو پہنے تھے۔

نظم اوٹ پٹانگ سہی، میرے شاعرہ بننے کا کریڈٹ تو مگر آپ ہی کو گیا ناں؟ اگر میں باقاعدہ شاعرہ بن جاؤں تو میرا تخلص آپ تجویز کیجیے گا۔ اس لیے کہ آپ مجھے مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ آپ ہی تو کہتے ہیں اور جو آپ کہتے ہیں، ہم اس پر اعتبار کرتے ہیں۔

ناچیز...... زیبا

روحیل جی......!

میری خوبصورت دعا آپ کے نام۔

ہم جور پرستوں پہ گمان ترکِ وفا کا
یہ وہم کہیں تم کو گناہ گار نہ کر دے

پورے پندرہ دن مینا باجی کی شادی کا ہنگامہ رہا۔ مسعود بھائی نے یہ خط مجھے کچن میں دیا تھا۔ آپ کا خط مجھے پہنچانے میں وہ بے حد احتیاط کرتے ہیں۔

منجھلے چچا نے کبھی آپ کو اپنے دوست کا بیٹا نہیں سمجھا، اپنی اولاد سمجھا، حقیقی اولاد اگر دیگر لوگوں کے نفرت آمیز جذبات آشکارنہ ہوتے تو شاید کسی کو قیامت تک علم نہ ہو پاتا کہ آپ منجھلے چچا کی حقیقی اولاد نہیں ہیں اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ انہی افراد کے سوہانِ روح انداز و اطوار نے آپ کو یہاں سے دوری پر مجبور کیا۔

اس خط سے پہلے میں نے آپ کے ہر خط کا جواب لکھا مگر افسوس...... خیر مجھے یہ دھڑکا تو ہرگز نہیں کہ آپ مجھ سے بدل جائیں گے۔ آپ اچھی طرح سے جانتے ہیں، میں کتنی محتاط اور مصلحت کوش ہوں اور موقع محل کی نزاکت کو ملحوظ رکھتی ہوں۔ آپ کبھی بھولے سے بھی میرے متعلق کوئی اُلٹا سیدھا گمان نہ کریں۔ آخر مسعود بھائی میرے تاثرات تو آپ کو بتاتے ہی ہوں گے۔ آپ کے بچپن کے ساتھی بڑے ابا کے ہونہار سپوت، مجھے یقین ہے، وہ میرے چہرے سے بہت کچھ کھوج لیتے ہوں گے اور آپ سے ضرور ذکر کرتے ہوں گے۔ مجھے یقین ہے آپ جب واپس آئیں گے تو سب کچھ...... ٹھیک ہو جائے گا...... آپ ایک اچھے مستقبل کی تلاش میں یہاں سے گئے ہیں، جس سے جاری آئندہ کی خوشیاں وابستہ ہیں۔ حالانکہ جب آپ جا رہے تھے تو مجھے ڈھیروں اُلٹے سیدھے وہم آئے تھے اور میں نے ایک نظم رات کے آخری پہر میں جیسے آنسوؤں سے لکھی تھی۔

میرے ہاتھوں کو سنہرے کنگن سے سجانے کی خاطر پرائے دیس جانے والے
تو اگر سونے کی تلاش میں نکلا
تو......
میں تیری تلاش میں نکل کھڑی ہوں گی
طوفان گزرنے کے بعد آنے والے

بہت سے چٹانی پتھر
ڈھیروں خالی سیپیاں
چند ٹوٹی کشتیاں ساحل پر کھڑی ہوں گی
اور بس...... اس سے آگے اپنے احساسات کو کیا معنی پہناؤں؟
خدا کرے یہ خط اپنی منزل تک پہنچ جائے۔

سرتاپا خلوص...... زیبا

میرے......!

میرا وجود ٹکڑے ٹکڑے ہو اور آپ کے قدموں میں بکھر جائے۔ میں کون سا رنگ بنوں جو آپ کی ذات میں پورا پورا جذب ہو جائے...... خوشبو بن کے فضا میں بکھروں جو آپ کے ایک ایک تارِ نفس میں حلول ہو کے معرکہ عشق ہو جائے...... جہاں دوئی کے احساس کا احتمال تک نہ ہو۔

''آپ کے خط کا ایک ایک لفظ جس اذیت، جس کرب کا غماز ہے...... میرا کلیجہ شق ہو چلا ہے۔ مسعود بھائی کو آج کل سخت فلو ہے۔ کئی بار مختلف بہانوں سے ان کے پاس گئی ہوں۔ میں کزن ہوں، خاندان کی لڑکی ہوں۔ اسی لیے وہ اتنی احتیاط کرتے ہیں۔ آپ کی وجہ سے شاید میرا احترام بھی بہت کرتے ہیں۔ یہ تو طے ہے کہ سارے خاندان میں وہ آپ کے سچے خیر خواہ اور بے لوث دوست ہیں...... آپ یقین کیجئے آپ، کے موضوع پر آج تک میرا ان کا کوئی مکالمہ نہیں ہوا۔

اور یوں بھی آپ کے ذکر پر بھید افشا ہوتا لگتا ہے، جتنا ضبط کرو...... مگر لگتا یہی ہے، چوری پکڑی جائے گی...... خدا کی پناہ...... اپنے آپ سے بھی خوف آنے لگا ہے......

عشق ہے کیا؟ خود اپنی ذات سے دشمنی کے سِوا...... ایک خلش، ایک کسک...... آٹھوں پہر انگاروں پر لوٹنا۔

اور خیر آپ میرے احساسات سے بے خبر تو نہیں ہیں۔ مجھے آپ کے پہلے خط میں لکھا شعر بہت خوب یاد ہے۔ آپ نے خط کے شروع میں لکھا تھا:

وہ سرد مہر سہی پُر نگاہِ لطف کے بعد
فراز دیکھ سماں برف کے پگھلنے کا!

آپ نے مجھے سرد مہر لکھا تھا...... گویا مجھے یونہی تنگ کیا تھا، ورنہ آپ کیا جانتے نہیں؟

بہت پریشان...... زیبا

روحیل......!

سمجھا رہے تھے مجھ کو سبھی ناصحانِ شہر
پھر رفتہ رفتہ خود اسی کافر کے ہو گئے

آپ کی کامیابیوں کی فہرست جوں جوں یہاں سامنے آ رہی ہے، بعض لوگوں کے خیالات میں تیزی سے تبدیلی آ رہی ہے۔

روحی آپی جو پتا نہیں آپ کو کسی قابل نہیں سمجھتی تھیں۔ آج کل آپ کی تعریفیں کرتی نہیں تھکتیں۔ اور بڑے ماموں کی ہما کو تو آپ ہمیشہ سے ٹیلنٹڈ نظر آتے تھے۔

چھوٹی چچی جو آپ کا پیٹ نیم (پیار کا نام) ہی گاؤدی رکھ بیٹھی تھیں۔ آج کل ماہر علم نجوم ہو چکی ہیں...... اور آپ کی مزید اقبال مندی کی پیش گوئی کرتی رہتی ہیں۔

منجھلی چچی کو خوف ستانے لگا ہے کہیں آپ ہمیشہ کے لیے وہیں نہ رہ پڑیں (خدا نہ کرے) مسعود بھائی آفس کے کام سے اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔ آج تیسرا دن ہے۔ قوی امکان ہے، آج رات نائٹ کوچ سے واپس آ جائیں گے...... میں نے سوچا ہے، یہ تینوں تازہ ترین جواب اکٹھے آپ کو بھجوا دوں گی۔ آپ کا ہر گلہ مٹ جائے گا اور پھر آپ کے خطوط کا انداز بھی بدل جائے گا...... پھر شاید آپ میرے جذبوں کی شدت سے گھبرا جائیں یا اُکتا جائیں اور یہ کہنے لگیں۔

دنیا میں ہیں کام بہت
مجھ کو اتنا یاد نہ کر

صرف آپ کی...... زیبا

روحیل......!

آداب!

پچھلے تین ہفتے عجیب کرب میں گزرے۔ امی آئے دن آنے والے رشتوں میں سے کسی نہ کسی کی پُرزور وکالت کرتی نظر آنے لگی ہیں۔ شاید اب وہ اتنی تیزی اس لیے دکھا رہی ہیں کہ گھر میں ہم چار فیملیز ہیں۔ بڑے ابا...... منجھلے چچا، چھوٹے چچا اور ہم، گھر میں میری جتنی

ہم عمر کزنز تھیں، سب ہی تقریباً اپنے ''ان'' کو پیاری ہو چکی ہیں۔

حالانکہ میں سب سے پہلے ''کسی'' کو پیاری ہوئی تھی (روحانی طور پر) مگر......!

میں نے گزشتہ تین خطوط کا جواب ایک ہی لفافے میں ڈال رکھا ہے، مگر یہ مسعود بھائی ہاتھ ہی نہیں لگ رہے...... آج سوچا تھا کہ جب وہ صبح کے غسل کے لیے باتھ روم جائیں گے تو میں دبے پاؤں جا کر ان کی رائٹنگ ٹیبل پر لفافہ رکھ آؤں گی۔ وہ جب بھی خط دیتے ہیں تو یہی کہتے ہیں۔

''میں کل روحیل کو خط پوسٹ کروں گا اگر جواب لکھنے کا پروگرام ہو تو لکھ کر میری ٹیبل پر رکھ دینا......!''

ان کے جانے کے بعد میں دیر تک حیا سے ٹوٹتی رہتی ہوں۔ کیسا تماشا بنا ہے میرا مسعود بھائی کے سامنے...... سچ جب سے آپ گئے ہیں، میں نے آج تک ان سے نظر ملا کر بات نہیں کی۔ ایک تو ہمارے ہاں اکیسویں صدی کی آمد آمد کے باوجود لڑکیوں کو تنہا باہر نکلنے کی اجازت نہیں...... اسکول جاتے تھے تو یہ حال جیسے جلسے کے شرکار سوئے منزل روانہ ہیں۔

کالج گئے تو جماعت سے پہلے ہی گھر سے ''باجماعت''

ورنہ خطوط پوسٹ کرنا مسئلہ نہ ہوتا۔

دوسرے آپ نے جاتے ہی جو پہلا خط لکھا تھا، اس میں جواب مسعود بھائی کے حوالے کرنے کی تاکید کی تھی۔

آپ نے لکھا تھا مسعود بہت ذمہ دار اور سلجھا ہوا ہے۔ اعلا انسانی اخلاقی قدروں کا علمبردار اور یہ کہ مجھے کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہیے۔ آپ پردیس میں ہیں اور دیس میں آپ کا کوئی حامی، حمایتی نہیں۔ اگر کسی کو بھنک بھی پڑ گئی تو کہیں ضد میں یہاں وہ فیصلے نہ ہو جائیں جو ہماری زندگیاں بھاری بنا دیں۔

آپ نے جتنی تاکید کی، میں اس سے کہیں زیادہ محتاط ہوں۔ مسعود بھائی بھی تو آپ کو بہت کچھ بتاتے ہوں گے۔

میرا وجدان کہتا ہے۔ آپ کو مجھ پر اٹوٹ بھروسا ہے۔ میں کس طرح زندگی کے شب و روز گزارتی ہوں۔ کیا بتاؤں؟

تیرے ساتھ گئی وہ رونق
اب اس شہر میں کیا رکھا ہے
دیے کی طرح جلتی ہوئی......زیبا

روحیل......!

ڈھیروں سلام شوق!

اے میرے منتظر! سکوتِ ازل بھی پہلی صبح کے لیے اتنی توجہ سے منتظر ہوگا...... جیسے کہ میں......!

آتی جاتی تارِ نفس میں آپ کا نام پروتی ہوں۔ ایسی روشن مالا...... ذرا میری چشم تصور سے دیکھیں......!

میں نے پچھلے چاروں خط لفافے سے نکال کر یہ پانچواں بھی ان میں شامل کر کے پوسٹ کرنے کا ارادہ کیا ہے اور یہ انشاء اللہ ضرور پورا ہوگا...... کیونکہ اب مسعود بھائی بھی اپنے دوروں سے فارغ ہو کر قدرے پُرسکون ہو بیٹھے ہیں اور ان کا اب کہیں جانے کا پروگرام نہیں...... گھر میں آئندہ دو تین ماہ تک کسی تقریب کا بھی امکان نہیں...... لڑکیاں بھی میکے رہ کر جا چکی ہیں۔

ایک منٹ...... کمرے میں پارو آ گئی ہے۔ کھانے کے لیے کہہ رہی ہے...... اب تو رات کو اس کے سونے کے بعد ہی خط مکمل کروں گی...... ویسے یہ پہلا خط ہے جو دو نشستوں میں لکھا جائے گا۔

روحیل! اب خط لکھنے کے سارے جواز ختم ہو چکے ہیں۔ رات کے بارہ بج رہے ہیں۔ آنسوؤں سے میری آنکھیں دھندلا رہی ہیں۔ اب تو سارے خطوط جلانا ہی ہیں۔ بس عادتاً مکمل کر رہی ہوں...... کہ جب آپ کو خط لکھتی تو محسوس ہوتا جیسے آپ مجھے اپنے روم روم سے سن بھی رہے ہیں اور دیکھ بھی رہے ہیں۔ میری دھڑکن کسی لے کی طرح ہم آہنگ ہونے لگتی...... جیسے آپ کے مزاج کی ترتیب میری دھڑکنوں میں موسیقیت بن کر اترتی رہی ہو......

توبہ...... توبہ...... یہ میں کیا کر رہی ہوں؟...... اب آپ سے یہ باتیں مجھے زیب نہیں دیتیں سارے سر ٹوٹ گئے ہیں...... کس قدر بے ہنگم شور اُبھر رہا ہے......؟

کھانے کے فوراً بعد امی نے اطلاع دی کہ ''امی نے بڑی اماں کو ''ہاں'' کہہ دی

ہے، مسعود گھر کا لڑکا ہے......!''

ابھی زمین میرے پاؤں کے نیچے ٹھہری بھی نہ تھی کہ مسعود بھائی میرے پیچھے پینٹری...... میں چلے آئے۔ وہ کہہ رہے تھے۔

''تم بہت مضبوط ہو...... میرے دل میں تمہاری بہت قدر ہے۔ روحیل جیسے لائق انسان نے کتنی بار تمھارے دل کے دروازے پر دستک دی، مگر تم نے بہت مضبوطی دکھائی۔ بس اسی وجہ سے میں، اماں کو انکار نہ کر سکا...... شاید روحیل کو مجھ سے شکایت ہو...... مگر...... وقت ثابت کر دے گا۔ کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ......؟''

سن رہے ہیں ناں آپ روحیل؟ دل کی دیوار کے اس پار......!

میرے سامنے خطوط کا ڈھیر ہے...... جب یہ جلے گا تو بہت بڑا الاؤ ہوگا۔

مجھے اندازہ نہیں کہ کتنی دیر جلے گا...... مگر میرے دل سے تو پھر بھی کم......!

خط تو عادتاً ہی مکمل کر رہی ہوں...... ذات ادھوری سہی...... کام تو مکمل کرنا چاہئیں۔

دیکھنا فانی کہیں تدبیر کی میت نہ ہو
اک جنازہ جا رہا ہے دوش پر تقدیر کے
زیبا



صدف

اس دن جینیفر سیمنری سے نکلی تو تابندہ کو بس اسٹاپ پر بس کا منتظر پایا۔ تابندہ نے جینیفر کو دوستانہ انداز میں مسکرا کر دیکھا تو وہ اس کے پاس چلی آئی۔

''گھر جا رہی ہو؟'' اس نے تابندہ سے پوچھا۔

''ہاں، آپ کہاں جا رہی ہیں؟'' تابندہ نے اپنی اجرک درست کرتے ہوئے سوال کیا۔

''مدر ٹریسا کے ہاں، انھیں دوائیاں پہنچانا ہیں۔''

''میں بھی کل ان کے ہاں گئی تھی، اب ان کی طبیعت پہلے سے بہتر ہے۔'' تابندہ نے بتایا۔

''یسوع مسیح ان کی مدد کرے۔'' جینیفر نے گلے میں جھولتی ننھی سی صلیب کو چھو کر سینے پر کراس بنایا۔

''مجھے آپ سے شکایت ہے سسٹر!'' تابندہ نے کہا۔ ''آپ روزانہ مدر ٹریسا کے ہاں جاتی ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں نہیں آتیں۔''

''اوہ!'' جینیفر مسکراتی۔ ''ان کی تیمارداری کرنے میں اتنی دیر ہو جاتی ہے کہ سیمنری آتے آتے رات ہو جاتی ہے۔'' جینیفر نے وضاحت کی۔

''امی مجھ سے پوچھ رہی تھیں کہ وہ اچھی اچھی باتیں کرنے والی لڑکی اتنے دنوں سے کیوں نہیں آئی۔''

''امی کو بولنا کسی دن ضرور آؤں گی۔ بس آ رہی ہے۔'' اس نے بات کرتے کرتے دائیں جانب دیکھ کر بتایا۔

بس رُکی تو دونوں سوار ہو گئیں، لیکن رش کے باعث صرف جینیفر کو سیٹ مل سکی تھی۔ اس نے تابندہ کو اس پر بٹھا دیا۔

جینیفر سے تابندہ کی دوستی اچانک ہی ہو گئی تھی۔ جس اپارٹمنٹ میں تابندہ رہتی تھی، اس سے نچلے فلیٹ میں مدر ٹریسا قیام پذیر تھیں۔ وہ ریٹائرڈ پرنسپل تھیں اور پاکستان میں ان کا کوئی نہیں تھا۔ وہ نہایت بے کسی و بے بسی کے دن گزار رہی تھیں، سسٹر جینیفر ان کی تیمارداری کے لیے آیا کرتی تھی۔ تابندہ اور اس کی ممی بھی ہمسائے کی حیثیت سے مدر ٹریسا کی خیر خبر لینے آ جاتی تھیں۔ یوں ان کی سسٹر جینیفر سے ملاقات ہوئی تو وہ دونوں کو بھا گئی تھی۔ وہ کبھی اپنے حقوق کی بات نہیں کرتی تھی۔ اسے تو بس انسانیت کی خدمت کا جنون تھا اور اس ''جنون'' کا بھی ایک خاص پس منظر تھا۔

سسٹر جینیفر چرچ کی جس اطفال گاہ میں پروان چڑھی تھی، اب اس سیمنری میں بچوں کی نگہداشت کرنے کے ساتھ ساتھ انھیں پڑھا بھی رہی تھی۔ جینیفر کو سیمنری میں خود اس کی ماں نے داخل کیا تھا۔ اس کی وجہ جینیفر جانتی ہو یا نہیں۔ مگر فادر پال بہ خوبی جانتے تھے۔ جس طرح جناب مریمؑ بنت عمران کو ان کی والدہ نے ہیکل کی ''نذر'' کیا تھا۔ اس طرح جینیفر کی ماں نے بھی جینیفر کو کلیسا کی نذر کر دیا تھا۔ وہ کٹر رومن کیتھولک تھی اور اس کی پرورش بھی ایک نن نے کی تھی، جو اسے غذا تو ناپ تول کر دیا کرتی تھی، مگر انسانیت کی خدمت کا درس بہت زیادہ، یہی وجہ تھی کہ زعم پارسائی اس کے لہو میں رچ گیا تھا۔

اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ گناہوں کے کیچڑ سے لت پت لوگوں کی اس بھیڑ میں وہ اور اس کی ...... قبیل کے دوسرے افراد آسمانی تحفے ہیں لیکن ایک روز پروٹسٹنٹ عقیدے کے ایک نوجوان نے اس کے عقائد پر محبتوں کے گلاب ڈال دیے اور وہ اپنا تن من ہار بیٹھی۔

اس کی ''مدر'' نے اس سے منہ موڑ لیا۔ اس کے قبیلے نے اسے اچھوت گردانا اور جہنم واصل ہونے کی نوید سنائی، لیکن اس نے تو ایک نئی دنیا پائی تھی، جس کا اپنا ایک نشہ تھا۔ پھر گزرتے وقت کے ساتھ جب یہ نشہ کم ہوا تو اسے ''احساسِ جرم'' ستانے لگا۔ اور ایک روز اس نے حضرت عیسیٰؑ کی تصویر کے سامنے جناب مریمؑ کی قسم کھا کر عہد کیا کہ وہ اپنے وجود میں پرورش پانے والے بچے کو انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کر دے گی۔ اگر لڑکا ہوا تو وہ اسے چرچ کا حصہ بنا دے گی۔ اور اگر لڑکی ہوئی تو وہ اسے کسی سیمنری کی نذر کر دے گی، جہاں ایک دن وہ سب سے معزز ہستی بن جائے گی۔

پھر یوں ہوا کہ خدا نے اس کی گود میں نیلی آنکھوں اور سنہرے بالوں والی جینیفر ڈال

دی۔ تب اس نے جینیفر کے پروٹسٹنٹ باپ کو اپنی ''منت'' کا حال بتا دیا اور یہ بھی کہا کہ وہ ''احساسِ جرم'' سے اندر ہی اندر بہت ٹوٹ پھوٹ چکی ہے، اب اگر یہ منت پوری نہ کی گئی تو وہ ختم ہو جائے گی، مر جائے گی، جینیفر کا باپ محبت کے ہاتھوں مجبور ہو گیا اور اس نے بیوی کی بات مان لی۔ یوں جینیفر کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔

اب جینیفر کا باپ مر چکا تھا اور اس کی ماں متحدہ امارات کی کسی ریاست میں ملازمت کر کے جینیفر کے دو بھائیوں اور ایک بہن کی پرورش کر رہی تھی۔



جینیفر مدر ٹریسا کے اپارٹمنٹ کی سمت بڑھی تو فاروق بالکنی کی ریلنگ پر کہنیاں جمائے اپنے مخصوص لاابالی انداز میں جھکا سگریٹ کا دھواں اسٹیم انجن کی طرح چھوڑ رہا تھا۔ جینیفر کو تابندہ نے بتایا تھا کہ فاروق بھائی امی سے چھپ کر سگریٹ پیتے ہیں۔ فاروق کی تیز نظروں نے اسکا پھر پیچھا کیا تھا۔ نہ جانے وہ کیا کھوجنا چاہتا تھا۔ اسے فاروق کی نظروں سے اُلجھن اور کوفت محسوس ہوتی تھی۔ حالانکہ اس کے ساتھ تو یوں ہوتا تھا کہ اس کے سفید لباس پر نظر پڑتے ہی ہر مذہب اور عقیدے کا انسان احترام سے نظروں کا رخ موڑ لیتا تھا۔ کم از کم اس نے خود تو یہی محسوس کیا تھا۔ اب یا تو یہ شخص گمراہ تھا یا اس کے اخلاق کی ابھی مکمل نشوونما نہیں ہو پائی تھی۔

وہ دل ہی دل میں رب عزوجل سے پناہ مانگتی ہوئی کال بیل کا بٹن دبانے لگی۔ اتنے میں غالباً فاروق نے تابندہ کو اطلاع کر دی تھی۔ اس سے قبل کہ مدر ٹریسا دروازہ کھولتیں تابندہ بالکنی سے جھانکی۔ ''ہیلو سسٹر!''

''گاڈ بلیس یو تابندہ!'' وہ جواباً دعا دے کر مسکرا دی۔

''اوپر آیئے گا نا؟'' تابندہ نے پوچھا۔

اس نے بالکنی پر نظر ڈالی۔ وہ گمراہ انسان اب وہاں نہیں تھا۔ ''تم ہی نیچے آ جاؤ۔ مدر ٹریسا کا دل بھی بہل جائے گا اور خدا تمھیں اجر بھی دے گا۔''

''کلیسا سے باہر آ کر سودے بازی سکھاتی ہو مس جینیفر!'' فاروق کی آواز آئی۔ وہ غالباً تابندہ کے پیچھے کھڑا تھا۔

اسی دم مدر ٹریسا نے دروازہ کھول دیا۔ جینیفر اس ''گنہگار'' انسان کی بات نظر انداز کر کے اندر چلی آئی۔ تھوڑی دیر بعد تابندہ بھی وہیں آ گئی۔ اس نے جینیفر کے بے حد حسین ہاتھ

تھام کر معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''سسٹر! فاروق بھائی کی عادت ہے مذاق کی، آپ مائنڈ نہ کیجیے گا۔''

''ارے نہیں تابندہ! تم بالکل ایکسکیوز نہ کرو۔ میں ایسا نہیں سوچتی۔'' وہ اپنی مخصوص سادگی سے بولی۔

''بس اسی لیے نہیں بنتی میری فاروق بھائی سے۔ مذاق کرتے وقت کبھی دوسروں کے جذبات و احساسات کا پاس نہیں کرتے۔''

''ناٹی بوائے۔'' مدر ٹریسا کو بھی فاروق کا کوئی مذاق یاد آ گیا تو ہنس کر بولیں۔

''بوڑھے ہو رہے ہیں وہ اور آپ بوائے کہہ رہی ہیں۔'' تابندہ جل کر بولی۔

دراصل وہ جینیفر کا دل رکھنے کی خاطر فاروق کو زور و شور سے برا بھلا کہہ رہی تھی۔

جب سے اس نے جینیفر کے حالاتِ زندگی جانے تھے، اسے غیر شعوری طور پر ایک عجیب سی کیفیت اپنے وجود کے اندر محسوس ہوتی تھی، جسے وہ ہمدردی کا نام دے سکتی تھی۔ ''معلوم ہے میں آپ کو اوپر کیوں بلا رہی تھی؟ امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' تابندہ نے جینیفر کو بتایا۔

''اوہ گاڈ! کیا ٹربل ہے؟'' اس کا معصوم دل دکھ کر رہ گیا، پھر وہ مدر ٹریسا سے مخاطب ہوئی۔

''مدر! میں تابندہ کی ممی کو دیکھ کر آتی ہوں۔''

وہ سب کچھ بھول بھال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''آؤ تابندہ۔'' یہ کہہ کر وہ تابندہ سے بھی پہلے باہر نکل گئی تھی۔

اوپر پہنچی تو فاروق راستے ہی میں مل گیا۔

''ممی! کہاں ہیں؟'' وہ اس کی تیز چبھتی ہوئی نظروں سے بوکھلا کر پوچھ بیٹھی حالانکہ احساسِ پارسائی اور نیکی کے خیالات اس کے مضبوط سہارے تھے۔ وہ بلا کی خود اعتماد تھی کہ اس کا ضمیر ہر قسم کی آلائش سے پاک تھا۔ نیکی کی راہ سے بھٹکانے والے گمراہ انسان نیکوکاروں کا امتحان ہوتے ہیں۔ لیکن نیکوکار بھی اٹل ہوتے ہیں۔ جینیفر نے سوچا۔

وہ راستے سے ہٹ گیا اور بولا۔ ''ہماری خالہ جان یعنی تابندہ کی امی بھی وہیں ہیں جہاں اکثر خواتین پائی جاتی ہیں۔ یعنی اپنے بیڈ روم میں۔''

اس شخص کو بولنے کا کس قدر شوق ہے ذرا سی بات کو یہاں سے وہاں تک پھیلا دیتا

ہے۔ اس نے سوچا۔ اسی دوران میں تابندہ بھی اوپر آ گئی۔ اور وہ دونوں فاروق کو وہیں کھڑا چھوڑ کر اندر چلی گئیں۔

❁

فاروق دو سال کا تھا جب وہ تابندہ کی ماں کی آغوش میں آیا تھا۔ اس کی ماں تو اسے جنم دیتے ہی مر گئی تھی۔ دو سال اس کی دادی نے اسے سنبھالا، لیکن جب وہ بھی سوئے منزل چلی گئیں اور فاروق کے باپ نے دوسری شادی کر لی تو وہ بھانجے کو اس کے باپ اور اپنے شوہر کی رضامندی سے اپنے پاس لے آئیں۔ اس وقت تک تابندہ پیدا نہیں ہوئی تھی۔

تابندہ کے ابو نے شروع دن ہی کہہ دیا تھا کہ بچے کو لے تو آئی ہو مگر اس کی پرورش کا آغاز جھوٹ سے نہ کرنا، اس لیے کہ جب کسی کی زندگی کو سنوارنا ہی ہے تو سچ اور حقیقت کے ساتھ سنوارنا چاہیے۔ اس طرح نفسیاتی اور سماجی مسائل پیدا ہونے کا خدشہ کم ہوتا ہے۔ اور یوں بھی حقیقت پسندی مشکلات کا بوجھ ہلکا کرتی ہے، بڑھاتی نہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا تھا۔ ''یہ شروع دن سے تمھیں خالہ کہہ کر ماں سے محرومی کی حقیقت تسلیم کر لے تو اس کے حق میں بہتر ہے بجائے اس کے کہ باشعور ہونے کے بعد یہ دھماکا مستقبل کے ایک کار آمد انسان کو بے کار بنا دے اور اس کی باقی زندگی انھی شکوک میں گزر جائے کہ کہیں یہ بھی جھوٹ نہ ہو۔ کہیں وہ بھی جھوٹ نہ ہو۔''

انھوں نے اپنے شوہر کی بات پر عمل کیا تھا۔ یوں ابتدا ہی سے وہ سب ایک دوسرے کے ساتھ تو تھے مگر حقیقتوں اور سچائیوں کے ساتھ تھے۔ ان کے درمیان ایک دوسرے سے متعلق کوئی شکوک نہیں تھے۔

حال ہی میں تابندہ یتیم ہوئی تھی۔ مگر فاروق کی موجودگی نے اس گھر کو بہت ڈھارس دی تھی۔ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو چکا تھا۔ اور ایک فرم میں اسسٹنٹ منیجر تھا۔ ایک بیٹے کی طرح وہ اپنی خالہ کا سہارا بنا ہوا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں وہ اپنا تمام بار اس پر ڈالتے ہوئے شرمندہ تھیں۔ مبادا کہیں وہ یہ سوچے کہ ہم اس سے اپنے احسانات کی قیمت وصول کر رہے ہیں۔ یہی سوچ کر انھوں نے تابندہ سے کہا کہ وہ گریجویشن کر چکی ہے اب کہیں ملازمت کرے تو زیادہ بہتر ہے۔

تابندہ کو ماں سے اتفاق تھا مگر فاروق نے تابندہ کے ملازمت کرنے پر سخت برا مانا

تھا کہ اس کی موجودگی میں ان لوگوں کو تکلیف اٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن تابندہ نے اس سے کہہ دیا تھا کہ وہ کچھ کرنا چاہتی ہے۔ معذوروں کی طرح زندگی کیوں گزارے؟ بلکہ آج کل تو معذور لوگ بھی ذوق وشوق سے میدانِ عمل میں مصروف ہیں اور یوں ویسے بھی آج کل عورت کا ملازمت کرنا معیوب بات نہیں رہی۔ اس طرح یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا، زندگی کے دوسرے مرحلوں کی طرح۔

❁

تابندہ کا آفس سیمینری سے نزدیک ہی تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ وہ جینیفر کے بہت قریب آ گئی تھی۔ ان دونوں کے درمیان پرخلوص دوستوں کا سا رکھ رکھاؤ تھا۔ ان کی دوستی تنگ نظری اور تعصب ومنافقت سے پاک تھی۔ بلکہ یہ اچھی بات تو یہ تھی کہ تابندہ کبھی کبھار ضرور سوچتی تھی کہ اگر یہ لڑکی دائرہ اسلام میں داخل ہو جائے تو اس کی ریاضتیں روشنیاں دینے لگیں، لیکن جینیفر نے اپنے کسی قول یا فعل سے شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کے عقائد پر حملہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کا موضوع انسانیت ہوتا تھا۔ عموماً یہ جملہ اس کے منہ سے نکلا کرتا تھا۔ ''تابندہ! کسی کا دکھ دور کر دینا اتنا اچھا عمل ہے کہ وہی تمھیں اس کی اہمیت بتا سکتا ہے جس کا کبھی کسی نے دکھ دور کیا ہو۔''

ایسے میں کبھی فاروق اس کی انسانیت پر تقریر سن لیتا تو مخصوص کاٹ دار لیکن شگفتہ انداز میں کہہ دیتا۔ ''آپ تو دکھ اور خوشی پروف ہیں مس۔''

جینیفر کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر جاتے۔

''ہمارے بہت سارے اعمال وافعال دوسروں سے مختلف ضرور ہوتے ہیں۔ لیکن دوسری لڑکیوں کی طرح بعض کام یکساں بھی ہوتے ہیں۔ جیسے کھانا بنانا۔ سینا پرونا کھانا پکاتے ہوئے ہمارا ہاتھ بھی جل جاتا ہے اور ہمیں پتا چلتا ہے کہ جب آگ کھال کو چھوتی ہے تو اذیت کس نوعیت کی ہوتی ہے۔ سیتے پروتے سوئی کھب جاتی ہے اور بیماری میں انجکشن لگتا ہے۔ پھر ہم ''دکھ پروف'' کیسے کہے جا سکتے ہیں؟ ہم دکھ محسوس کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ دکھ صرف دھوکے اور منافقت ہی کاری ایکشن تو نہیں ہوتے نا۔ دکھ انسان اپنی غلطیوں کی وجہ سے بھی تو اٹھا سکتا ہے۔'' جینیفر بڑی خوداعتمادی سے اسے جواب دیتی۔

''گویا آپ سے بھی غلطیاں ہو جاتی ہیں؟'' فاروق اپنے چہرے کے سامنے سے

اخبار ہٹا کر اس کم عمر، ذہین اور بلا کی خوبصورت لڑکی کو پھر تنگ کرتا تو تابندہ پریشان ہونے لگتی۔

''ہاں! ہم سے بھی بھول چوک ہو جاتی ہے مگر ہم احتیاط ضرور کرتے ہیں۔'' وہ کہتی۔

تب وہ جھلا سا جاتا۔ ''عجیب بخ لڑکی ہو جینیفر! تمھیں غصہ کیوں نہیں آتا، تم چڑتی کیوں نہیں؟ اگر یہ عقیدے کی وجہ سے ہے تو میں اسے غیر فطری سمجھتا ہوں۔''

''آیئے سسٹر! مدر ٹریسا کے پاس چل کر بیٹھتے ہیں۔'' تابندہ کو ایسے میں یہ بحث ختم کرنے کے لیے یہی حل سوجھتا۔

''میں کچھ فیل نہیں کرتی تابندہ! فاروق کو بولنے دو۔'' وہ مسکرا دیتی۔

''جس انسان میں جوش نہ ہو! مسابقت نہ ہو، وہ بھی کوئی انسان ہے۔ اور جو انسان ہی نہ ہو، وہ انسانیت کو کیسے ''بریف'' کر سکتا ہے؟'' فاروق اپنی بات کے اختتام پر خود ہی ہنس دیتا۔ تابندہ کا چہرہ غصے سے تپ جاتا مگر جینیفر اسی طرح بے تاثر رہتی۔

تب فاروق زِچ ہو کر کہتا۔ ''کاش تم میری بات سمجھ سکتیں۔''

جینیفر اس کے دل کی بات خوب سمجھتی تھی لیکن وہ لوگوں کی اس بھیڑ میں سے نہیں تھی جو گناہوں کی کیچڑ سے لت پت ہوتے ہیں۔

❁

وقت تبدیلی سے عبارت ہے۔ تبدیلیاں یہ ہوئیں کہ تابندہ کو ایک نیک خو اور خوش رو انسان بیاہ کر لے گیا۔ پورے اہتمام اور روایتوں کے ساتھ اور اس اکثریت کا اندازہ غلط نکلا جو یہ سوچ رہی تھی کہ تابندہ کی زندگی فاروق ہی سے وابستہ ہوگی۔

پھر اکثریت نے کھوج لگایا تو معلوم ہوا کہ تابندہ کے والد کی تو یہی خواہش تھی کہ تابندہ فاروق سے وابستہ ہو جائے لیکن فاروق نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اس نے ایک مشفق اور بڑے بھائی کا کردار ادا کیا ہے۔ اس میں نہ تو اب نظر بدلنے کی ہمت ہے اور نہ رشتہ بدلنے کی۔

شاید تابندہ کی ماں نے بھی کچھ سوچا ہو لیکن جب بیٹی نے بھی نیا رشتہ قائم کرنے سے انکار کر دیا تو انھوں نے ذہن سے تمام حسرتیں جھٹک کر بیٹی کو غیروں میں بیاہ دیا۔

تابندہ کے اصرار پر جینیفر بھی آئی تھی لیکن لوگوں کو اپنی جانب تعجب و تمسخر سے دیکھتا پا کر وہ جلد ہی چلی گئی تھی۔

تابندہ کی شادی کے بعد وہ اوپر کا راستہ بھول گئی۔ مدر ٹریسا بھی علاج اور تیمارداری

سے اچھی ہو گئی تھیں۔ اس لیے اب وہ یہاں کم کم ہی آتی تھی۔

ایک روز مدر ٹریسا کا فون آیا اور انھوں نے بتایا کہ تابندہ کی ماں کو انجائنا ٹربل ہو گئی ہے اور تابندہ بھی کئی روز سے آئی ہوئی ہے۔ تب جینیفر نے اپنے پروگرام ترتیب دیتے وقت تابندہ کے گھر جانے کا بھی خیال رکھا۔ اور مغرب سے پہلے وہ تابندہ کے ہاں موجود تھی۔

بہت پیار سے اس نے تابندہ کی ماں کو دلاسے دیے اور ان کی مزاج پرسی کی۔ ان کی حالت اب سنبھل رہی تھی۔ انھوں نے بتایا کہ تابندہ امید سے ہے اور اپنے شوہر کے ساتھ ابھی ابھی ڈاکٹر کے ہاں گئی ہے۔ تو جینیفر نے اس خوشخبری پر مسرت کا اظہار کیا۔

فاروق ابھی گھر نہیں لوٹا تھا۔ صفائی کرنے والی عورت اِدھر اُدھر کام کرتی پھر رہی تھی۔ جینیفر نے کہا کہ وہ ویجی ٹیبل سوپ تیار کر کے رکھ جائے گی۔

وہ کچن میں چلی آئی اور بڑی لگن سے سوپ تیار کیا۔ اگرچہ وہ گرمیوں کے ابتدائی دن تھے، پھر بھی وہ پسینے پسینے ہو گئی۔ کچن کافی تنگ تھا۔ کھڑکی تھی لیکن ہوا راستہ بھولی ہوئی تھی۔ وہ باورچی خانے سے نکل آئی۔

کمرے میں آ کر اس نے سر سے رومال اتارا تو جوڑا لٹکتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے پنیں نکالیں تو بال شانوں پر بکھر گئے۔ اس نے شیمپو کر کے نم بالوں ہی کا جوڑا بنا لیا تھا۔ بال بکھرے تو گردن پر بھاپ سی اٹھتی محسوس ہوئی۔ اس نے بال دائیں کاندھے پر ڈال کر کمر اور گردن پر ہوا لی۔ پنکھا بہت ہلکا چل رہا تھا۔ پھر بھی اس کے وجود میں ٹھنڈک سی اتر گئی۔

اسی دم مردانہ بوٹوں کی چاپ ابھری۔ اس نے جلدی سے رومال اٹھایا۔ تبھی فاروق اندر داخل ہوا۔ وہ بے ارادہ پلٹی تھی۔ مگر نظر مل گئی اور بجلیاں سی کوند گئیں۔ فاروق ریشم جیسے سنہری بالوں کے درمیان جینیفر کا معصوم اور تر و تازہ گلابی چہرا دیکھتا رہ گیا۔ بال عورت کے حسن کا اہم جزو ہیں۔ اس نے آج تک صرف اس کا چہرہ ہی دیکھا تھا۔ زلفوں کی سنہری روشنیوں کو وہ قید ہی رکھتی تھی۔

جینیفر نے گھبرا کر رومال باندھنا شروع کر دیا۔

''ہیلو مس!'' وہ ہمیشہ اسے مِس ہی کہہ کر مخاطب کرتا تھا جب کہ وہ سارے زمانے کی سسٹر تھی۔

''ہیلو!'' وہ بولی۔

تابندہ کی امی کروٹ لیے لیٹی تھیں۔ بھانجے کی آواز پر سیدھی ہوگئیں۔ ''آ گئے فاروق! تابندہ اور ریحان نہیں آئے اب تک؟''

''کہاں چلے گئے آپ کو تنہا چھوڑ کر؟'' وہ اپنے حواس میں آ گئے۔

''تابندہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، ریحان ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا ہے۔''

''کیا ہوا اسے؟'' اس نے فکرمند لہجے میں پوچھا۔

''بس ایسے ہی کہہ رہی تھی دل گھبراتا ہے۔'' اب وہ اسے کیا بتاتیں۔ بال بچوں والا بھی نہیں تھا کہ مبہم سا اشارا کر دیتیں۔

''سوپ بن گیا جینیفر؟ بھوک سی لگنے لگی ہے۔'' انھوں نے موضوع بدلنے کے لیے جینیفر سے پوچھا۔

''جی، سوپ تو بن گیا ہے۔ ابھی لاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔

وہ کچن میں آ کر ٹرے سجانے لگی تو اسے اپنے پیچھے ایک اور وجود کا احساس ہوا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو فاروق اپنے بازو لپیٹے اسے کام کرتے دیکھ رہا تھا۔

''مِس انسانیت! ایک بات سچ سچ بتانا تم جو ہر ایک سے خلوص سے ملتی ہو تو یہ بتاؤ، کیا تمھارے ملنے والے جاننے والے انسانیت سے عاری ہیں؟''

''نہیں! میں نے یہ کب کہا؟'' وہ آہستگی سے بولی۔

''پھر تمہارا اپنے آپ کو بچانا کیا معنی؟ یہ زندگی، یہ جذبات، یہ عمر دوبارہ تو نہیں ملے گی! تم چاہت دیتی ہو تو لینا کیوں نہیں چاہتیں؟''

''مجھے بہت سے لوگ چاہتے ہیں۔'' وہ بے تاثر لہجے میں بولی۔

''ایک بات کہوں! برا تو نہیں مانو گی؟'' وہ تھوڑا سا جھجکا۔

''ہوں کہیے، برا ماننے کی پروا کیے بغیر۔''

''کیا تم زندگی بھر اپنے جذبات واحساسات کو قتل کرتی رہو گی؟ کیا تم وہ عقائد ترک نہیں کر سکتیں جنھوں نے تمھیں فطری تقاضوں سے منہ موڑنے پر مجبور کر دیا ہے؟ عقائد کو فطرت سے قریب تر ہونا چاہیے۔ لہٰذا بہتر یہ ہوگا کہ تم''

''آپ ایک بات غور سے سن لیجیے مسٹر فاروق!'' جینیفر نے اس کی بات کاٹی۔ پہلی مرتبہ فاروق نے اس کے لہجے میں تپش محسوس کی۔

''جی!'' فاروق نے بازو پھیلا کر دروازے کی چوکھٹ تھام لی۔

''میں نے کبھی آپ کے سامنے مذہب کو موضوع بحث نہیں بنایا حالانکہ میں مشنری سے بھی منسلک ہوں لیکن میں ہر اس موضوع سے بچتی ہوں جس میں کسی کی دل آزاری کا پہلو نکلتا ہو۔''

''لیکن میں نے مذہب کو نہیں، تمھیں موضوع بنایا ہے۔ جائزہ لینا سیکھو، گہرائی میں اترو!'' اس کا لہجہ گمبھیر ہوگیا۔ ''تم انسانیت کی پرستار بنتی ہو، کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ میں بھی انسان ہوں، ایسا انسان جس کا دل تمھارے لیے۔''

جینیفر کا نازک سا وجود کانپ کر رہ گیا۔

''آپ میرے بارے میں فکر نہ کریں۔'' جینیفر نے دوبارہ قطع کلامی کی۔ ''راستہ چھوڑیے۔'' وہ ٹرے تھامے اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

فاروق دروازے سے ہٹ گیا۔ وہ چلی گئی۔ بات وہیں کی وہیں تھی۔

''کس قدر گمراہ، بے باک اور احمق انسان ہے یہ!'' جینیفر نے اپارٹمنٹ سے باہر نکلتے اور سینے پر کراس بناتے ہوئے سوچا تھا۔ اور خدا سے اس کے لیے نیکی کی توفیق چاہی تھی۔

جب وہ مدر ٹریسا کے دروازے کے سامنے کھڑی کال بیل کا بٹن پش کر رہی تھی تو فاروق اوپر بالکنی میں کھڑا نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔

پھر جینیفر کی مصروفیات اس قدر بڑھ گئیں کہ مہینوں تابندہ اس کی ماں اور مدر ٹریسا سے رابطہ قائم نہ ہوسکا۔ لیکن ایک روز تابندہ کی جانب سے ایک کارڈ موصول ہوا۔ کارڈ پر جلی حروف میں ''شادی مبارک'' لکھا ہوا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ تابندہ کو علم ہے، وہ تقریبات اٹینڈ نہیں کرتی، پھر اس نے یہ کس کی شادی پر بلاوا دیا ہے؟ اس نے بڑے تذبذب میں کارڈ کھولا تو نہ جانے کیا ہوا کہ اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوگئیں۔ حالانکہ ایسا ہونا تو نہیں چاہیے تھا۔

یہ فاروق کی شادی کا کارڈ تھا۔ وہ چھ جون کو مکمل ہو رہا تھا۔ اس کی نصف بہتر کا نام ساجدہ تھا۔

جینیفر نے زندگی میں صرف تابندہ کی شادی میں شرکت کی تھی، وہ بھی ذرا دیر کو کہ اسے اس نازک سی لڑکی کا پاس تھا۔ مگر اس کے اس اقدام کو سیمینری میں اچھی نظر سے نہیں دیکھا

گیا تھا۔ شاید فادر پال کو بھی بھنک پڑ گئی تھی۔ تبھی تو ملاقات پر انھوں نے اسے بہ غور دیکھ کر پوچھا تھا کہ آیا اسے اپنی زندگی کا مشن اچھی طرح یاد ہے یا نہیں! اور پھر انھوں نے بائبل کی چند آیات پڑھ کر اس کا ایمان تازہ کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔ اگرچہ وہ کھلے نہیں تھے مگر وہ نادان نہیں تھی بلکہ اسے شرم محسوس ہوئی تھی کہ اس کے متعلقین کو اس کے ایمان کی مضبوطی پر گمان ہے۔ اس دن کے بعد سے وہ حد درجہ محتاط ہو گئی تھی۔

جانے کتنی شادیاں ہوتی ہیں روز اس شہر میں! ہم دعا کر کے خوش ہونے والوں میں سے ہیں۔ تابندہ! وہ مسکرا دی۔ اس کے خیالوں میں وہ گمراہ انسان اب بھی موجود تھا جو اس کے وجود میں بچھو کے سے ڈنک اتار دیتا تھا۔ ڈھیلے ڈھالے شلوار قمیص میں ملبوس بلا کا بے نیاز اور خود اعتماد، مقابل کے مضبوط جذبوں کی دیوار پر ہتھوڑے برسا کر انھیں زمین بوس کرنے والا، طنز سے مسکرانے والا، کم علم اور گناہ گار، جینیفر نے سینے پر کراس بنا کر کارڈ کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اسے ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔

❀

جینیفر اپنے مشن کے مطابق انسانیت کی خدمت میں مصروف تھی۔ تین سال کا عرصہ تیزی سے گزر گیا تھا۔ اب اس کا اس طرف پاؤں ہی نہیں اٹھتا تھا۔ کبھی مدر ٹریسا کی حالت بگڑتی اور ان کا فون آ جاتا تو وہ اپنی سسٹر ماریہ کو وہاں بھیج دیتی۔ وہ ایسا کیوں کر رہی تھی؟ یہ اس کو بھی خبر نہیں تھی۔ البتہ وہ فون پر تابندہ کی امی کی خیریت معلوم کر لیتی۔ عموماً ایسا ہوتا کہ وہ فون کرتی تو دوسری طرف سے فاروق کی آواز ابھرتی اور وہ فون رکھ دیتی۔ اس کا مشن کمزور نہیں پڑا تھا۔ فاروق کی کوئی بھی دلیل جینیفر پر کارگر نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے کہ جس وجہ سے وہ دلیلیں دیتا تھا۔ وہ وجہ بہت بھیانک تھی۔ ہیرا، دس قیراط کا ہو یا اس کی معمولی سی کنی، انسانی وجود کے اندر عمل دونوں کا ایک جیسا ہوتا ہے اگرچہ اس گناہ گار انسان نے ہیرے ایسی بات کبھی منہ سے نہیں نکالی تھی، مگر کنی، جتنے اشارے نے ہی جینیفر کا جگر پاش پاش کر دیا تھا لہٰذا اس نے وہ راستہ ہی بھلانا مناسب سمجھا تھا جہاں ایک ''گمراہ'' کھڑا تھا۔

آج جب سسٹر ماریہ نے بتایا کہ مدر ٹریسا مرض الموت میں مبتلا لگتی ہیں، کوئی علاج کارگر نہیں ہو رہا اور وہ اسے بہت یاد کر رہی ہیں۔ تو وہ اپنے مشن کے مطابق ایک انسان کو محبت کے بول سنانے چلی آئی۔

مدر ٹریسا کی حالت واقعی قابل رحم تھی۔ وہ جینیفر کو دیکھ کر رو دیں اور بتایا کہ وہ پچھلے دو

سال سے انگلستان میں مقیم اپنے بچوں کو بلا رہی ہیں۔ وہ بہلا دیتے ہیں مگر آتے نہیں ہیں۔ مدر ٹریسا کی بوڑھی آنکھوں سے بہتے آنسو سیدھے جینیفر کے دل پر گرے۔ اس نے خود کو لعنت ملامت کی۔ کیا میں اتنی کمزور ہوں کہ گھبرا کر ادھر آنا چھوڑ دیا۔ یہ بوڑھی عورت بھی تو میرے مشن میں شامل تھی۔ میں نے اتنے برس اس سے محبتوں کی باتیں بھی نہیں کیں۔ اس کے زخم زخم دل پر ذرا سا مرہم بھی نہیں رکھا۔

مدر ٹریسا نے اسے تلقین کی۔ ''اوپر جا کر تابندہ کی ماں سے ضرور ملو۔ وہ بھی کئی دائمی روگ لگائے بیٹھی ہے۔ اس کی بہو بھی دوسری زچگی کے دوران میں چل بسی ہے۔''

''اوہ!'' جینیفر نے گھبرا کر سینے پر کراس بنایا اور گلے میں پڑی چمکتی ہوئی صلیب کو انگلیوں سے تھام کر چوما۔

بڑی خود اعتمادی، جذبہ، ہمدردی و انسانیت سے سرشار وہ اوپر آئی تو اندر سے بچوں کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ بے دھڑک اندر چلی گئی۔ گھر کی عجیب بے ترتیب حالت ہو رہی تھی۔

مغرب کا وقت تھا۔ پورے اپارٹمنٹ کی لائٹس آن تھیں۔ ایک چھوٹا سا بچہ کچن کے دروازے کے سامنے دھرنا مارے بیٹھا تھا اور خوب چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ ایک بچہ سامنے واکر میں بیٹھا بھائی کو روتا دیکھ کر وقفے وقفے سے خود بھی سُر سے سُر ملا دیتا تھا۔ ماں کتنی ضروری ہے۔ بچوں کی حالت اس حقیقت کی گواہ تھی۔

تابندہ کی امی کی آنکھوں میں اسے دیکھ کر حیرت اور خوشی کے تاثرات نمودار ہوئے۔

''گڈ ایوننگ!'' جینیفر سنبھل کر مسکرائی۔

''خوش رہو، کہاں رہیں اتنے دن؟'' وہ تھکے تھکے انداز میں خود کو گھسیٹ کر سامنے بچھے تخت تک لے گئیں۔

''آؤ بیٹھو۔ جینیفر!''

''آپ کو پوچھنے آئی تھی۔ زیادہ دیر ہو جائے گی۔ فاروق کی بیوی کا سن کر بہت دکھ ہوا۔''

''اللہ کی مرضی۔ تم تھیں کہاں؟ تابندہ نہیں ہے یہاں تو تم بھی ہمیں بھول گئیں!''

''تابندہ کہاں ہے آج کل؟'' اسے وہ پرخلوص لڑکی ایک دم شدت سے یاد آئی۔

''شارجہ میں ہے۔ ترس گئی ہوں اس کی صورت کو۔'' وہ آزردگی سے بولیں۔

''بیماری چین نہیں لینے دیتی۔ فاروق کا بسا گھر اُجڑا ہے۔ اس کا دکھ علیحدہ کھا رہا ہے۔ وہ تو اس

شادی پر ہی مشکل سے راضی ہوا تھا۔ دوسری کرنے کو کیسے کہوں؟ ہمت نہیں پڑتی۔ اپنے حواس میں نہیں رہتا۔ غصہ کرنے لگا ہے۔ ذرا ان بچوں کو دیکھو، کتنے معصوم ہیں، مگر وہ روئی کی طرح دُھنک کر رکھ دیتا ہے انھیں۔ اب تم آ گئی ہو تو سمجھانا اسے!''

''آپ تو اپنا ایمان خراب نہ کریں ایسی باتیں کر کے خالہ جان!'' فاروق نہ جانے کہاں سے آوارد ہوا۔ وہی جلتی سلگتی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے۔ ''آج برسوں بعد آپ آ کیسے گئیں؟ اور خالہ جانیہ مجھے کیا سمجھائیں گی جن کی نزدیک کی نظر ختم ہو چکی ہے۔ ان کی نظر پر تو ''منتوں'' اور ''نذروں'' کے محدّب عدسے لگے ہوئے ہیں۔ سونپے اور بخشے ہوئے یہ بے چارے لوگ تو اپنے بھی نہیں ہیں اور کسی کے کیا۔'' اتنا کہہ کر وہ یوں رکا جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو، پھر بولا۔ ''حالانکہ میں نے کبھی مذہب کو درمیان میں لا کر تمھیں نشانہ نہیں بنایا جینیفر! لیکن اتنی تو میری معلومات ہیں کہ سیمینری میں آپ کے ہاں بالغ و باشعور لوگ اپنی خواہش اور مرضی سے داخل ہوتے ہیں، کسی منت یا نذر کے ذریعے نہیں! یہی بات میں آپ کو بتانے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔'' اس نے بڑے تکلف سے اسے ''آپ'' کہا۔

''اوں ہوں۔'' تابندہ کی امی حیران پریشان نظر آنے لگیں۔

اُجڑا اُجڑا اور بکھرا بکھرا فاروق جینیفر کے سامنے ڈٹا کھڑا تھا اور پہلے سے زیادہ بے باک ہو رہا تھا۔

جینیفر کو پھر آنچ آنے لگی۔ وہ لڑکی تھی کوئی پتھر تو نہیں تھی۔

''یہ کیا اول فول بکنے لگے ہو فاروق! اسے بیٹھنے تو دو۔'' تابندہ کی امی ایک سیدھی سادھی عورت تھیں انھیں ''نن'' کے مقام کا ادراک نہیں تھا۔ وہ اسے محض تابندہ کی دوست سمجھتی تھیں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ''یہ کیسی منت، نذر کی بات کر رہا ہے فاروق؟'' انھوں نے جینیفر سے پوچھا۔

''پتا نہیں!'' جینیفر کی لرزیدہ آواز ابھری تھی۔

❀

واپسی پر رات کو وہ کافی دیر تک جاگتی اور سوچتی رہی۔ بلکہ اپنے آپ سے جنگ کرتی رہی۔ اس کے اندر کی لڑکی کہہ رہی تھی۔ ''سارے جہان کے انسانوں کے خداوند! ہم پیٹ کے بچے کی تقدیر کا فیصلہ کرنے والے کون ہوتے ہیں؟''

جینیفر کے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا کہ تقدیروں کے فیصلے تو خداوند خود کرنے

والا ہوتا ہے۔

وہ ایک رسالہ اٹھا کر دیکھنے لگی جس میں نو آموز قلم کاروں کے افسانے چھپے ہوئے تھے۔ اسے ایک کہانی دلچسپ لگی تو پڑھنے لگی۔

''لوگوں کی نظریں تو موتی کی آب و تاب سے خیرہ ہو جاتی ہیں۔ لیکن صدف میں بند پانی کے قطرے پر کیا حادثے گزرتے ہیں۔ کس طرح موتی بنتا ہے، یہ کوئی نہیں جان سکتا۔ موتی کتنی دل موہ لینے والی چمک رکھتا ہے۔ اس کی چمک بھی کسی پر یہ بھید نہیں کھولتی کہ صدف کے قید خانے میں کیسے الاؤ دہکتے ہیں جو پانی جیسی چیز کو پتھر بنا دیتے ہیں۔ یہ آب و تاب تو موتی کی شرم ہے۔ جس میں اندر گزرنے والی قیامتوں کے بھید پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اس کی مثال بھی موتی جیسی تھی۔''

وہ یہیں تک پڑھ پائی تھی کہ رُک گئی۔ اس نے رسالہ ایک طرف ڈال دیا اور پھر سے سوچوں میں ڈوب گئی۔ رات گہری ہو چکی تھی۔ جب اس نے فون کا ریسیور اٹھایا اور کوئی نمبر ڈائل کرنے لگی تو مطلوبہ نمبر انگیجڈ تھا۔ وہ وقفے وقفے سے نمبر ڈائل کرتی رہی اور بالآخر اس نمبر سے رابطہ قائم ہو گیا۔

''ہیلو!'' دوسری طرف سے فاروق کی بھاری آواز سنائی دی۔

''میں ہوں جینیفر!''

''اس وقت رنگ کرنے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی، انسانیت پرست مس جینیفر کو؟'' فاروق نے حسب معمول طنزیہ انداز میں پوچھا۔

''نو ڈاؤٹ، میں انسانیت پرست ہوں اور یہ بتانے کے لیے تمھیں فون کیا ہے کہ چونکہ انسانیت ہر قید ہر محیط میں آزاد ہوتی ہے۔ اس لیے میں تنہا ہوں یا کسی نذر اور منت کے طعنے دینے والے کے ساتھ، مجھ پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ البتہ تمھارے بچوں کی زندگی پر ضرور پڑے گا۔ جنھیں ماں کی ضرورت ہے۔''

''جینیفر! جینیفر! تم سچ کہہ رہی ہو؟'' فاروق نے بے چینی سے کہا۔

''ہاں، اور سنو! میں نے اپنا نام بھی سوچ لیا ہے۔''

''کیا؟'' فاروق نے مسرت سے لرزتی آواز میں پوچھا۔

''صدف!'' یہ کہہ کر اس نے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔



یہ صراحی میں پھول نرگس کا

مکرمی فاروق بھائی!

السلام علیکم!

فاروق بھائی میں آپ کو اس سے پیشتر تین خطوط لکھ چکی ہوں۔ فاروق بھائی اس قدر کڑا وقت کہ تصور میں بھی نہیں تھا۔ فاروق بھائی ابو کے انتقال کے بعد میں جانکنی کے عالم میں ہوں۔ آپ کو حالات کی سنگینی کا احساس نہیں دروازے کی چٹخنی چڑھائے کانپتی رہتی ہوں...... کراچی میں کون ہے میرا......؟ پاس پڑوس سے پہلے بھی روابط نہیں تھے اب محتاط ہو کر مزید گوشہ نشین ہو گئی ہوں......

اگر آپ نے دس دن کے اندر اندر جواب نہ دیا فاروق بھائی تو میں خودکشی کرلوں گی یا کسی ویلفیئر آرگنائزر کے پاس چلی جاؤں گی آپ لوگوں کو اس حال میں بھی ترس نہیں آتا؟ بخدا میں آپ سے مالی مدد کی خواستگار نہیں...... مجھے انسانوں کے اس جنگل میں کسی اپنے کا تحفظ چاہیے۔ میرے خدا میں کہاں چلی جاؤں؟...... ماموں جان اگر پاکستان آئے ہوئے ہیں تو سلام کہیے گا۔

آپ کی منتظر

اسماء حیدر

............❁............

مکرمی فاروق بھائی!

السلام وعلیکم!

چوتھا خط ارسال کیے ہوئے تین دن ہوئے ہیں کیا کروں کہاں جاؤں؟ خدا کسی غریب کے اتنے دولت مند رشتے دار بنائے جو سب کے سب اس قدر امیر ہوں! معاف کیجئے گا آپ اور ماموں جان دونوں بے حس ہیں...... میں خود لاہور چلی آتی ہمت کر کے مگر جب

میرے خطوط کے ساتھ یہ سرد مہری، میری بے بسی پر سکوت کا یہ عالم تو خدا معلوم میرے ساتھ کیا رویہ ہو۔

رات صحن میں کوئی کودا تھا۔ ساری رات جاگتے...... آیۃ الکرسی پڑھتے گزاری ہمارے اردگرد فلیٹوں میں آپ سے بھی زیادہ بے حس لوگ رہتے ہیں۔ خدا کا آسرا نہ ہوتا تو رات خودکشی کر لیتی۔ سارے رشتے داروں میں آپ ہی کچھ ہمیں...... درخور اعتناء سمجھتے تھے مگر اب آپ بھی...... خدا قیامت کے روز آپ سے اور ماموں جان سے ضرور باز پرس کرے گا۔

مجھ جیسی کم ہمت لڑکی تو بازار جانے کی بھی ہمت نہیں رکھتی۔ امی ابو کے بجائے میں ہی مر گئی ہوتی۔

فقط:۔ اسماء حیدر

............❁............

بجلی بہت زور سے کڑک رہی تھی...... وہ جائے نماز پر سربسجود تھی۔ ہچکیوں سے پورا وجود ہل رہا تھا...... اسی دم باہر دستک ہوئی...... وہ اسے اپنا وہم سمجھی...... دستک دوبارہ ہوئی کوئی بہت شائستگی سے دستک دے رہا تھا...... وہ سر پر چادر جماتی ہوئی دروازے کے نزدیک آئی......

''کک......کون ہے......؟'' خوف سے آواز کانپ رہی تھی۔

''دروازہ کھولو...... اسماء......!'' ایک مانوس آواز ابھری ساتھ ہی بجلی کا کڑاکا ہوا......

اس نے جنونی انداز میں چٹخنی گرادی۔

سامنے بھیگے کپڑوں میں فاروق کھڑے ہوئے تھے...... وہ چیخ کر رو پڑی...... اس کا پورا وجود گویا طوفانوں کی زد میں تھا......

فاروق...... اس کے لیے تیار نہیں تھے...... اس کے شانے تھپتھپاتے ہوئے کہنے لگے۔

''اسماء...... پلیز...... پلیز اسماء...... مجھے اندر تو آنے دو......''

''آہ...... آپ لوگ کتنے بے حس ہیں...... میں سرد ہی ہوں فاروق بھائی۔'' وہ تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔

وہ اسے تھامے ہوئے اندر چلے آئے۔ خوبصورت چہرے پر بلا کی...... سنجیدگی تھی۔

''اسماء...... میں بابا جان کے پاس بیروت میں تھا۔ کل ہی رات کو آیا تو تمہارے تین چار خطوط ملے...... اسماء...... مجھے بے حد دکھ ہوا۔ پھوپھا جان کو کیا ہو گیا تھا......؟''

انھوں نے اسے سمجھاتے ہوئے آہستگی سے اس کی بدگمانی دور کی۔

''کچھ بھی نہیں ہوا تھا فاروق بھائی...... اچھے بھلے سوئے تھے رات کو اور صبح کو......''

وہ پھر رو پڑی......

''اچھا...... ذرا میں کپڑے بدل لوں...... ابھی جہاز سے آیا ہوں......'' ایئر پورٹ پر ہی بارش شروع ہوگئی...... پلیز...... اپنے آپ کو سنبھالو......'' انھوں نے اس کا رخسار محبت سے تھپتھپایا...... اور بیگ سے کپڑے نکالنے لگے۔

وہ کرسی پر بیٹھ کر خود پر قابو پانے لگی۔

''فاروق بھائی...... آپ کو بھوک لگی ہوگی...... مگر گھر میں کچھ بھی نہیں ہے سوائے آٹے کے......''

''میں نے تو خیر جہاز پر کھانا کھا لیا تھا...... مگر تم تو واقعی بھوکی ہوگی......'' وہ تشویش سے بولے...... وہ خاموش رہی......

''اسماء...... تمھارے ساتھ واقعی بہت برا ہوا...... بس اب تیاری کرو ہم صبح ہی پنڈی چلے جائیں گے...... وہ کپڑے بازوؤں پر لٹکا کر بولے۔

............❀............

انھوں نے اس کی سمت سرسری انداز میں دیکھ کر اسے بیلٹ باندھنے کو کہا...... وہ میکانکی انداز میں ان کی ہدایت پر عمل کرنے لگی۔

''فاروق بھائی...... گھر پر تو آپ اکیلے رہتے ہوں گے......؟'' اس نے آہستگی سے پوچھا۔

''جب تیرہ سال کا تھا تب سے اکیلا ہوں...... مگر باہمت ہوں......'' انھوں نے اس کی کم ہمتی جتائی۔

''آپ مرد جو ہیں......'' اس نے تھوڑا سا برا مان کر کہا......

''ویسے تم فکر نہ کرو...... گھر میں جو ملازم عورتیں ہیں بہت اچھی و مشفق ہیں......''

''آپ کی شادی بھی تو ہونے والی تھی......؟'' اس نے سرسری انداز میں سوال کیا۔

''بہت وقت پڑا ہے ان کاموں کے لیے......'' انھوں نے ایئر ہوسٹس کو اشارے سے بلا کر کوئی مخصوص میگزین منگایا...... تب وہ خاموش ہو کر بیٹھ گئی۔

گھر آ کر وہ خدا معلوم کہاں غائب ہو گئے...... رات گئے تک ان کا کچھ پتا نہ تھا...... وہ ٹیرس پر خاموش بیٹھی تھی...... تب ہی وہ نمودار ہوئے......

''شکر ہے تم جاگ رہی ہو...... آؤ بابا جان سے بات کراؤں......''

وہ ایک دم تیزی سے اٹھ کر ان کے پیچھے ہولی۔ ریسیور تپائی پر پڑا تھا انھوں نے اٹھا کر چند لمحے کچھ باتیں کیں پھر اس کی جانب بڑھا دیا......

''السلام وعلیکم ماموں جان......'' اس کی آواز بھرا گئی......

ادھر سے ماموں جان کی تسلی و شفقت پا کر وہ باقاعدہ رونے لگی۔

''بیٹی...... میں اگلے ماہ تک آؤں گا...... تم فکر نہ کرنا...... جس چیز کی ضرورت ہو فاروق سے بلا جھجک کہہ دینا...... گھبرانا مت...... بیٹی مجھے بہت دکھ ہوا...... شاید تمھارے پاس میرا بیروت کا ایڈریس نہیں تھا...... بہر حال جو مرضیٔ معبود خط وغیرہ لکھ دیا کرنا...... کیوں بیٹی......؟''

''جی ماموں جان......''

''خدا پر بھروسہ رکھو...... خوش رہنے کی کوشش کرو......''

''ذرا ریسیور فاروق کو دو......'' تب اس نے ان کی سمت ریسیور بڑھا دیا اور باہر چلی آئی۔ شروع شروع میں تو ماحول اسے اجنبی لگا مگر جلد ہی ایڈجسٹ ہوگئی۔

ایک شام جب وہ ڈرائنگ روم میں کسی غرض سے گئی تو فاروق بہت خوشگوار موڈ میں فون پر مصروف گفتگو تھے...... اسے دیکھتے ہی انھوں نے آواز دھیمی کر لی اسے ایسے لگا گویا انھوں نے بات بدل دی ہو...... وہ عجیب سی خفت محسوس کرتے ہوئے واپس لوٹ آئی......

اس کی اور فاروق کی ملاقات سرسری ہوتی تھی۔ عجیب مصروف سے آدمی تھے...... مگر بہت مسرور مسرور سے۔ اس سے صرف اس کی...... ضروریات کے متعلق باتیں کرتے تھے...... گھر میں بہت کم ٹکتے تھے......

وہ رات گئے تک بیٹھی رہتی ان کے آنے پر ہی بیڈ روم میں جاتی۔ اس کی قضاء کا لمحہ جس دن آیا وہ صوفے پر میگزین پڑھتے پڑھتے سو گئی تھی......

فاروق صرف اس لیے ڈرائنگ روم میں آئے تھے کہ انھیں پتا تھا وہ جاگ رہی ہوگی...... مگر وہ عجیب بے ترتیب انداز میں محوِ خواب تھی...... اس کا بازو اس کے پہلو میں دیا ہوا تھا...... وہ ازراہِ ہمدردی آگے بڑھے اور اسے جگانے لگے...... آف وائٹ شلوار سوٹ میں

ملبوس وہ...... عجب نظارہ پیش کر رہی تھی...... نظارہ تو عام سا تھا دیکھنے والی نظر بدل گئی تھی...... اس کے یاقوتی ہونٹ نیم وا تھے۔ وہ خیام کی رباعی کی طرح مرصع لگ رہی تھی۔ چہرے پر دکھ کے سائے تھے...... امیر خسرو کی ''برہن'' کا سا افسردہ تاثر اس کے پورے وجود سے مل رہا تھا...... اس کا دوپٹہ ان کے پاؤں تلے آ رہا تھا انھوں نے اٹھا کر صوفے کے ہتھے پر ڈال دیا......

وہ نیک باپ کی نیک اولاد تھے...... سو دوپٹہ کو ہتھے پر نہیں اس کے سر پر پھیلا دینا چاہیے تھا۔ نیکی ورثہ نہیں ہوتی...... نیکی صدقہ نہیں ہوتی...... ہاتھ...... پاؤں...... ناک...... کان...... کی طرح انسانی وجود کا ایک عنصر...... کبھی کبھی ہاتھ پاؤں ٹوٹ بھی جاتے ہیں۔ بینائی بھی زائل ہو جاتی ہے...... انسان اپاہج بھی ہو جاتا ہے۔ وہ عمر بھر کو اپاہج ہونے جا رہے تھے...... مگر اس کی چھٹی حس جاگ اٹھی...... وہ چونک کر جاگ اٹھی تھی......

فاروق کی آدھی اپاہج نظر اس نے دیکھ لی تھی...... چھن چھن...... اندر کتنے ہی آئینے ٹوٹ گئے...... وہ تو اپنوں کے تحفظ میں آئی تھی...... جو خدا یہاں اس کی حفاظت کر سکتا ہے وہ اس کے گھر پر بھی کر سکتا تھا۔ وہ وہاں باہمت کیوں نہ بن کر رہ سکتی تھی......؟ اس کا ایمان کمزور ہو گیا تھا۔ وہ خدا کو پہچان نہیں پائی تھی...... فاروق نے اسے چھوا تک نہیں تھا...... ان کو ساری زندگی معذور بنا دینے والی ''بلا'' ابھی آس پاس ہی منڈلا رہی تھی...... جانے کون سی انجانے میں کی گئی نیکی طلسم بن کر ماحول پہ چھا گئی......

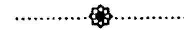
ایک شیشہ بچ گیا تھا......

ایک شیشہ ٹوٹ گیا تھا......

اس نے بچے ہوئے شیشے پر دوپٹے کا پردہ ڈالا...... ٹوٹے ہوئے شیشے کی کرچیاں فاروق کی راہوں میں بچھا کر باہر نکل گئی...... اعتماد...... بالکل نابینا اعتماد کی باریک باریک کرچیاں......

کھال میں چبھ کر لہو میں اتر جانے والی کرچیاں......

اس کی آنکھوں سے نکلے ہوئے حیرت کے تیر...... ملامت کے تیر...... صدمے کے تیر...... ان کے دل و اعصاب میں ترازو ہو گئے...... وہ گویا پتھر کے ہو گئے تھے۔



وہ ان کی نظروں سے بچتی تھی اور وہ اس کی نظروں سے......

مگر اس روز ان کے ملنے والے آ گئے...... ان کے دوست اور ان کی بیگم...... انھیں

شاید اس کا پتا تھا تب ہی ملازمہ کے ہاتھ بلوا بھیجا۔ ناچار اسے اٹھنا پڑا...... گلابی دوپٹہ سنبھالتی وہ اندر چلی آئی...... فاروق اسی طرح رخ موڑے دوست سے محو گفتگو رہے...... جب کہ دوست کی بیگم اسے دیکھ کر کھڑی ہو گئیں...... گلابی کپڑوں میں وہ خود بھی گلابی گلابی لگ رہی تھی...... دو سیاہ چوٹیاں آگے سینے پر پڑی ہوئی تھیں گھنیری سیاہ پلکوں کو جھپکاتی ہوئی وہ بے حد دلکش لگ رہی تھی۔

آپس میں تعارف کے مراحل طے ہوئے......

''ارے ہاں بھئی...... فاروق نے پچھلے دنوں آپ کا تذکرہ کیا تھا کہ ان کی کزن آئی ہوئی ہیں بہت تعریف کرتے ہیں...... سلیقہ مند ہے...... مؤدب ہے اس کے آنے سے گھر کی طرف سے بے فکر ہو گیا ہوں......'' بھابی ہنسیں...... پھر گویا ہوئیں......

''فاروق بھائی! اتنی تعریفوں کے باوجود آپ کی تعریفیں نامکمل ہیں یہ بھی تو کہنا چاہیے تھا کہ میری کزن اتنی خوبصورت ہیں کہ پورے پنڈی میں جوڑ نہیں...... اور ہاں اتنی تعریفوں کے ہوتے ہوئے تھوڑا سا نخرہ بھی چل جاتا ہے...... اتنی دیر سے آپ کو بلا رہے تھے ہم۔'' انھوں نے شکوہ کر ہی ڈالا۔

''دراصل میں سو رہی تھی......'' وہ بے طرح خجل ہو گئی......

''بی بی تو دن میں بھی کنڈیاں لگا کر سوتی ہیں......'' ٹرالی دھکیلتی خادمہ نے بھی لب کشائی کی......

''بھئی اپنے گھر میں بھی دن میں کنڈیاں چڑھاتی ہیں......'' خوش مزاج بھابی کھلکھلائیں......

''بعض اوقات چور دن میں بھی آ جاتے ہیں...... خدانخواستہ...... فاروق کے دوست نعیم نے مذاق کیا......

تب اس کی نظریں فاروق کی سمت اُٹھ گئیں...... وہ منہ میں سگریٹ دبائے کش پر کش لے رہے تھے...... ان کے اردگرد دھوئیں کا غبار تھا......

''ویسے فاروق بھائی رخشی کے سلسلے میں آپ نے جلدی کی......'' جب وہ باہر آ رہی تھی تب اس نے بھابی کی آواز سنی تھی......

اسے معلوم تھا رخشی فاروق کی پسند تھی کرنل عبدالرحمٰن کی اکلوتی بیٹی...... ابو کے انتقال سے پہلے فاروق نے باتوں باتوں میں تذکرہ کیا تھا۔ اس نے رخشی کو دیکھا تھا اسے پسند بھی آئی

تھی...... زمانہ دنوں میں بدل گیا تھا...... وہ بات اور تھی...... اب بات اور تھی......



ماموں جان آ گئے تھے...... اس کی ڈھارس سی بندھ گئی تھی...... گھر بھی اپنا اپنا سا لگنے لگا تھا...... اب اسے کھانے...... ناشتے کے لیے باقاعدہ...... ڈرائینگ روم میں جانا پڑتا تھا۔ جب بھی ناشتے کے لیے کمرے میں داخل ہوتی فاروق کے چہرے کے آگے اخبار ہوتا تھا......

بعض اوقات اسے ترس آنے لگتا اس کا جی چاہتا...... اس لمحاتی لغزش کے ناگ سے ڈسے جانے والے انسان کو احساسِ جرم...... ناکردہ جرم...... کے زہر سے نجات دلا دے...... زہر کا منتر پھونک کر اسے بچالے...... ''ظرف کا منکا'' لے کر اس شرمندہ انسان سے پوچھے...... بتا...... اے مجروح...... تجھے وقت نے کہاں پر ڈسا...... لا میں ظرف ومعافی کے منکے سے وہاں سے زہر نکال دوں۔ تیری روح شانت کر دوں......

مگر نہیں...... وہ ڈسے جانے سے بال بال بچ گیا تھا...... اور وہ معاف کرنے سے......

آدھا علم خطرناک ہوتا ہے......

آدھا جرم......

آدھی سزا......

اور...... یوں...... فاروق ادھورپن میں رہے اور وہ ایدھیڑبن میں......

ایک روز اس نے سنا فاروق نے رخشی سے شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

اور...... پھر ایک روز اس نے سنا......

وہ ہمیشہ کے لیے بیروت جا رہے ہیں...... ماموں جان کی جگہ......

اور آخر ایک روز وہ چلے گئے......

جانے سے ایک رات پہلے وہ بے خبر پڑی سو رہی تھی اسے پتا ہی نہ چلا کہ ایک شرمندہ انسان رات کو کتنی بار اس کے دروازے پر آیا اور لوٹ گیا......



از بیروت

اسماء السلام علیکم!

تمھارے لیے خلوص دل سے دعا گو ہوں...... اسماء...... مجھے تمہاری نظروں کی

حیرت نہیں بھولتی...... اسماء...... میں کمزور نہیں تھا...... مگر وقت کی گرفت میں آ گیا تھا...... میں کراچی گیا...... تمھیں لے کر آیا...... تم گھر پر آئیں مجھے کوئی کمزور لمحہ یاد نہیں پڑتا...... تم بھی گواہ ہو...... خدا بھی گواہ ہے...... مگر اس روز...... میں سوچتا ہوں کاش عذاب کا وہ لمحہ تمہاری آنکھ کھلنے سے پہلے ٹل جاتا...... پھر خود احتسابی کی گنگا میں نہا کر میں پاک ہو جاتا۔ کراماً کاتبین ایک طرف...... تمہاری نگاہ کا دکھ ایک طرف...... دو گواہ کاندھوں پر ایک میرے تمام وجود پر...... وہ گواہ تم ہو اسماء......

اسماء...... کچھ بھی تو نہیں ہوا...... کچھ بھی تو نہیں...... تو پھر تم مجھے رہائی کیوں نہیں دیتیں......؟ احساسِ جرم اس لیے شدید ہے کہ تم یہ نہ سوچتی ہو کہ تمہاری بے بسی...... بے سروسامانی سے فائدہ...... اسماء کچھ بھی تو نہیں ہوا تو پھر میں سولی پر کیوں ٹنگا ہوں......؟

رہائی کا منتظر...... فاروق احمد!

یہ محبت نامہ نہیں تھا یہ خجالت نامہ تھا...... عاجزی نامہ تھا...... مگر وہ ایک دم خوش ہو اٹھی...... ایک شخص خود احتسابی کے جہنم میں جھلس رہا تھا۔

وہ اکیلی پلی تھی...... اکیلی ہنستی تھی...... اکیلی روتی تھی...... کم از کم عذاب میں تو کوئی اس کے ہمراہ تھا......

اس نے خط آنکھوں سے لگایا...... آنکھوں سے کئی قطرے رخساروں پر ڈھلک آئے...... فاروق بھائی...... کراچی میں آپ سے کتنی بار ملی...... کچھ احساس نہیں ہوا...... مگر آہستہ آہستہ عجب احساس جاگا کہ جب آپ اپنے کام کے لیے مجھ سے بے تکلفی اور اپنائیت سے کہتے تھے...... میرا جی چاہنے لگا آپ سدا مجھے یونہی کہتے رہیں میں آپ کے چھوٹے چھوٹے کام...... کر کے خوشی پاؤں...... مگر رخشی میری آرزوؤں کے سیلاب کا بند بن گئی...... میں نے بہت آسانی سے آپ کو ہار دیا کہ بہت حقیقت پسند ہوں...... لیکن اس رات کے بعد میں اپنے ظرف سے نیچے اتر گئی......

میں نے کمینگی سے سوچا...... یہ نہ ہونے والی لغزش میری تقدیر کا...... موڑ بن جائے کہ اب آپ بے بس تھے...... اور میں...... پھر مگر سوچا...... اتنی آسانی سے کمزور لمحوں میں بے بس ہو جانے والا مرد...... میرے لیے کیا کر پائے گا...... مگر میں اتنی کمینی نہیں ہوں...... مجھے کچھ

نہیں چاہیے...... مجھے اعتماد کے وہی لمحے چاہئیں جن کی بنا پر میں بارش کی سیاہ رات میں احساسِ تحفظ لینے آپ کے وجود میں چھپ گئی تھی...... کچھ نہیں ہوا...... مگر ہونے کے کتنا قریب تھا...... وہ بری طرح دوری......

از بیروت!

اسماء......!

تمھیں خط لکھا تھا...... اس امید پر کہ جواب میں رہائی کا پروانہ آئے گا...... مگر......؟ اسماء...... اعتماد کی...... کرچیاں...... پندار کی کرچیاں...... مجھے لہولہان کر رہی ہیں۔ اسماء میں نے کچھ نہیں کیا...... تم بھی لکھ دو...... کہ میں نے کچھ نہیں کیا...... کبھی کبھاریوں بھی ہو جاتا ہے۔

کیا تمھیں میرا پہلا خط ملا......؟

گنہگار...... فاروق احمد

اس نے خط پڑھا...... اور بند کر دیا...... اپنے جرم پر پردہ ڈال کر آپ نے غلطی پر غلطی کی ہے فاروق بھائی...... کسی زمانے میں...... زبان کی نکلی تحریر سے زیادہ ہوتی تھی...... آپ بھلا اعتماد کی قیمت کیا جانیں۔"

ماموں جان کو دوا پلا کر وہ اپنے کمرے میں چلی آئی...... دو سال میں آئے ہوئے فاروق کے خط...... اس نے دراز سے نکالے...... دو سال میں آئے۔ چوبیس پچیس خط......

اس نے باری باری سب پڑھے...... پھر قطعیت سے کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئی......

جناب فاروق احمد صاحب!

السلام علیکم!

آپ کے عرضی نما خطوط میرے سامنے ہیں۔ چوبیس کے چوبیس خطوں میں وہ چیز نہیں جو میں نے چاہی...... فاروق صاحب! غلطی فاش تھی...... چلیں غلطی نہ کہیں...... ارادہ کہیں...... ارادہ فاش تھا...... کھلا تھا...... تو پھر آپ کی...... شرمندگی میں اتنی انانیت کیوں ہے......؟ کسی خط میں یہ نہیں ہے کہ مجھے معاف کر دو...... رہائی دے دو...... رہائی...... میں کیا رہائی دوں...... آپ پندار کے شیشے کے گھر میں بیٹھے ہیں باہر آیئے...... آپ کی یہ گردان کہ کچھ نہیں

ہوا...... اعتماد پارہ پارہ ہوا...... کچھ نہیں ہوا...... احساسِ تحفظ چھنا...... کچھ نہیں ہوا......؟ اگر کچھ نہیں ہوا تو آپ اتنی دور کیوں...... بیٹھے ہیں......؟ فاروق صاحب...... وقت کا ہر لمحہ آپ ہی کا تو نہیں...... گرفت میں لینے والے عفریت لمحے آپ کے تھے شکست دینے والے لمحے میرے......

لان میں نرگس کے پھول کھلے ہیں...... میری حسرتوں کے ترجمان...... انتظار کے گواہ...... انگور کی بیلیں انگوروں سے پُر ہیں میرے محبت بھرے دل کی طرح...... بلکہ سارا باغ سرسبز و شاداب ہے...... میرے ظرف کی طرح...... آپ آ جایئے یہ آپ کا گھر ہے در بدر نہ پھریے...... مگر خدارا یہ بھی نہ کہیے کہ کچھ نہیں ہوا...... کیسے کچھ نہیں ہوا......؟ ڈرائنگ روم میں دو سال سے نرگس کے پھول سجتے ہیں صرف نرگس کے...... چپہ چپہ منتظر ہے...... ہر شے...... میرے ظرف کی...... آئینہ دار...... کاش ماموں جان نے کبھی آپ کو لکھ دیا ہوتا کہ اسماء نے سارے گھر میں نرگس پھیلا رکھی ہے...... نرگس حسرت کی علامت...... انتظار کی علامت...... میں آپ کو یہ لکھ سکتی ہوں...... کہ نرگس سارے گھر میں پھیلا رکھی ہے...... آپ اپنے پندار کو ایک لمحے کے لیے ایک طرف رکھ کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ مجھے معاف کر دو...... کھلی غلطی...... کر سکتے ہیں...... کھلی معافی نہیں مانگ سکتے......؟

اسماء......



شناختی علامت

"اری مہارانی اب اٹھ جا...... چھوڑ دے یہ تختِ طاؤس۔"

اماں کی چنگھاڑ پر وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور لرزتے قدموں سے باورچی خانے کی سمت چلی آئی۔

دروازے پر آ کر وہ چپ چاپ کھڑی ہوگئی...... اماں برتنوں کی اٹھا پٹخ میں مصروف تھیں۔ اس کی موجودگی کا احساس کر کے انھوں نے گردن موڑ کر اس کی سمت خونخوار نظروں سے دیکھا۔

"جی اماں......؟ کوئی کام ہے؟"

"کوئی کام......! نوابزادی کام ہی کام ہے...... اب کام بھی تیری خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ دیدے پھوٹ چکے ہیں تیرے؟ نظر نہیں آتا......؟"

وہ بے حساب برسیں......

"چل یہ صاف کر کے لا......" انھوں نے کنکر بھرے چاول اس کی طرف کھسکائے۔

وہ پرات اٹھا کر باہر واپس آگئی......

"منحوس ہے...... جس دن سے پیدا ہوئی ہے میرے نصیب پر تو سیاہی پھر گئی...... ارے اس سے اچھا تھا پیدا ہوتے ہی مر جاتی۔"

اس نے اپنا ہاتھ بے ساختہ اپنے بائیں رخسار پر پھیرا۔ آنکھیں لبالب بھر آئیں۔

"اماں...... اس میں میرا کیا قصور ہے...... اللہ مجھے موت کیوں نہیں آجاتی......؟"

"ارے...... چاول صاف کر کے یہ برتن دھو لیجیو۔ ذرا ہاتھ تیز چلا...... چھٹی کا دن ہے۔ بھائی گھر پر ہیں۔" اماں کی آواز پھر اس کے کانوں سے ٹکرائی...... وہ جلدی جلدی چاولوں میں ہاتھ چلانے لگی۔

بچپن سے آج تک اس نے یہ جملے ہزاروں بار سنے تھے کہ وہ منحوس ہے اور اس کے

بائیں گال پر جو کالا تل ہے وہی اس منحوسیت کا سبب ہے۔ اس نے بارہا سنا تھا کہ جب وہ پیٹ میں تھی تو اس کی نانی مر گئی تھی۔ جب وہ پیدا ہوئی تو پانچ سال کا ہنستا کھیلتا بھائی چل بسا۔ وہ یہ ہے...... وہ یوں ہے...... اور

وہ یہ سب سن کر کونوں کھدروں میں پھوٹ پھوٹ کر رویا کرتی۔

کیا اس تل کو کھرچ کر پھینک دوں، تل بھی تو کوئی باریک سا نہیں تھا خوب سیاہ اور نمایاں تھا۔

اس تل کی منحوسیت کے قصے سن سن کر اس کے کان پک چکے تھے۔ اب تو اسے یہ محسوس ہونے لگا تھا گویا یہ تل نہیں کوئی بہت بڑا آسیب ہے جو اس کی جان سے چمٹ گیا ہے۔

اسکول میں لڑکیاں رشک کرتی تھیں کہ اس کے رخسار پر کس قدر حسین تل ہے، کاش ان کے رخسار پر بھی اللہ تعالیٰ ایسا تل نقش کر دیتا۔ اسے ان کی باتیں سن کر رونا آجاتا تھا۔ وہ آنسو پی کر انھیں سمجھاتی کہ کیا بدفالیں وہ منہ سے نکال رہی ہیں...... وہ تو خوش نصیب ہیں کہ ان کے رخسار پر اللہ نے تل نہیں بنایا۔

وہ اس کی بات پر کھلکھلا کر ہنس دیتیں۔

"یوں کیوں نہیں کہتی اگر ہمارے رخساروں پر بھی ایسا تل ہو جاتا تو تیرے تل کو کون پوچھتا......؟"

عمارہ، تجھے اللہ نے کتنی پیاری چیز دی ہے......"

ان کی تعریفوں کے دوران اماں کے قہر بھرے الفاظ اس کے اعصاب پر ہتھوڑے برسانے لگتے، وہ ان کے بیچ سے اٹھ جاتی۔

خاندان بھر کی لڑکیاں علیحدہ اس کے رخسار پر سجے تل کو بڑی حسرت سے دیکھا کرتیں۔ "مارے احساسِ محرومی" کے جب کوئی کزن مصنوعی تل بنا کر اس کے سامنے آتی تو وہ تعجب سے سوچا کرتی۔ یا اللہ لڑکیوں کو منحوس بننے کا کتنا شوق ہے۔ ابھی پرسوں ہی کی بات تو ہے جب خالہ ثریا کہہ رہی تھیں......

"آپا...... عمارہ کا رنگ ضرور بھائیوں سے کم رہ گیا ہے لیکن اس تل نے کسر پوری کر دی ہے، بہت سجتا ہے۔"

"ارے چھوڑو۔ ثریا...... آگ لگے ایسی سجاوٹ کو جس نے لاکھ کو خاک بنا دیا۔"

وہ بڑبڑاتی ہوئی اندر چلی گئی تھیں۔ ”سیاہ چیز تو نحوست کی نشانی ہوتی ہے۔ اب نحوست بھی خوبصورت ہونے لگی۔ ہونہہ......“ اسی دن شام کو اس نے جاوید بھائی سے کہا تھا۔

”بھائی میاں...... میں نے پرائیویٹ انٹر تو کرلیا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ بی۔ اے کرلوں۔ میرا شناختی کارڈ بنوادیں۔“

”ارے تمہارا شناختی کارڈ نہیں بنا......؟“ انھیں گویا اچنبھا سا ہوا۔

”تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا......“

”ارے بہت پڑھ لیا......“ اماں نے حسب عادت پھر ٹکڑا لگایا۔

”بھائی میاں میں کونسا کالج جارہی ہوں...... جو اماں پر کام کا بوجھ پڑے گا......“

”ارے ہاں...... تو نے تو سارا گھر سنبھال رکھا ہے میرا پاؤں زمین پر لگنے نہیں دیتی...... ایسی ہی کام والی تو ہے۔ اے میں کام کی وجہ سے کہہ رہی ہوں، میں تو اس لیے کہہ رہی ہوں کہ زیادہ پڑھنے سے لڑکیوں کے دماغ خراب ہوجاتے ہیں۔ رشتے میں الگ مشکل ہوجاتی ہے۔“

”کچھ نہیں ہوتا اماں...... خوامخواہ کی باتیں ہیں۔ آخر گھر بیٹھ کر پڑھ لینے میں حرج ہی کیا ہے۔“

بھائی میاں نے حسب ابق اس کی حمایت کی۔ اب اماں بڑبڑ کرتی پھر کہیں گھس گئیں۔ اسے اپنے مہربان بھائی پر ٹوٹ کر پیار آ گیا۔

اور پھر وہ پہلے شناختی کارڈ کا فارم لے کر آئے۔

شام کو جب وہ ”بی“ فارم سامنے رکھے اس کا فارم فِل کررہے تھے تو سر اٹھا کر بڑے مصروف سے انداز میں پوچھنے لگے۔ ”شناختی علامت کیا لکھوں......؟“

”منحوس لکھ دو بھائی میاں......“ اس نے جل کر سوچا۔

”ارے کیا لکھے گا...... یہ اتنی بری نحوست اس کے ”گلے“ پر نہیں چمک رہی......؟“

”ارے...... ارے...... ہاں......“ اماں کے جلے پھپھولے بھائی میاں کے کام آگئے۔ ”یہ ٹھیک ہے۔ لو یہ تو بالکل واضح علامت ہے...... شناختی علامت کے خانے میں یہ نشان لکھ دیتا ہوں...... ٹھیک......؟ ہاں...... یہ بائیں طرف ہے یا دائیں طرف؟“

”بائیں طرف بھائی میاں......!“

”اچھا یہ بتاؤ۔ تصویر لگواؤ گی یا دستخط سے کام چلاؤ گی......“

”کوئی ضرورت نہیں تصویر لگانے کی۔ ارے کہیں راستے میں گر گیا تو خوامخواہ کی مصیبتیں گلے پڑیں۔ میں کہہ رہی ہوں، سن رہا ہے جاوید۔ تصویر لگانے کی ضرورت نہیں۔“

”اچھا...... اچھا...... اماں سن لیا......“ بھائی میاں نے عاجز ہوکر کہا۔

انھوں نے فارم فل کرکے جمع بھی کرادیا اور چند دنوں بعد ایک پلاسٹک کوٹڈ کارڈ اس کے سامنے ڈال کر مژدہ سنایا کہ یہ رہا تمہارا شناختی کارڈ......

اس نے کئی مرتبہ الٹ پلٹ کر کارڈ ملاحظہ کیا۔

”بھئی اب تو تم ”پرووڈ“ پاکستانی ہوگئی ہو۔“ انھوں نے اس کے کھلے ہوئے چہرے کو محبت سے دیکھا۔

”ارے اب اٹھ جاؤ...... شناختی کارڈ سے پیٹ نہیں بھرتا...... وہ چھیلنے کو مٹر پڑے ہوئے ہیں۔“ اماں کو اس کا خوش بیٹھنا ذرا پسند نہیں آیا۔

تھرڈ ائیر کا پہلا پیپر دے کر جب وہ گھر میں داخل ہوئی تو بے حد پریشان تھی۔ بھائی میاں کے آنے تک وہ اسی طرح بے چین رہی۔ جب بھائی میاں رات کو سونے کے لیے لیٹے تو اس نے ڈرتے ڈرتے بتایا......

”بھائی میاں......“

”ہوں......؟“

”بھائی میاں...... میرا شناختی کارڈ گم ہوگیا ہے۔“

............❁............

دوسری دستک پر عمارہ نے دروازہ کھولا تھا۔

سامنے ذکی کو دیکھ کر وہ ٹپٹا سی گئی۔

”راستہ کیوں روک کے کھڑی ہو۔ یہاں باہر سورج عتاب بن کر ٹوٹ رہا ہے۔“ وہ ایک دم ہٹ گئی۔

”گھر میں اماں جان نہیں ہیں۔ اس لیے......“

”ارے اماں جان نہیں ہیں تو کیا تم نہیں ہو......؟ کھانا تم بھی کھلا سکتی ہو...... پانی تم بھی پلا سکتی ہو۔“ اس نے کرسی پر بیٹھ کر جوتے جرابیں اتارنا شروع کردیں۔

"کھانا کھائیں گے آپ......؟"

"صرف کھانا کھانے شارٹ کٹ کے طور پر اس گھر میں آیا ہوں......"

وہ اوپر کے دو تین بٹن کھول کر پنکھے کے نیچے کھڑا ہو گیا۔

"ہم نے تو دال چاول پکائے ہیں۔ کھالیں گے؟"

"کچے بھی ہوئے تو کھالوں گا...... یہ عالم ہے۔" اس نے پلٹ کر عمارہ کو دیکھا وہ لپک جھپک باورچی خانے میں گھس گئی۔

جلدی سے کھانا ٹرے میں سجایا۔ پودینے اور املی کی چٹنی چھوٹی سی کٹوری میں ڈالی۔ جلدی جلدی پیاز کاٹ کر سلاد بنایا۔

اور پانچ منٹ بعد کھانا اس کے سامنے رکھ چکی تھی۔

"واہ بھئی بہت چست ہو۔ جس کے پلے پڑو گی، کبھی بھوکا نہیں مرے گا۔" اس کی آواز میں شوخی تھی۔

عمارہ کی کانوں کی لوؤں پر خوف جھلکنے لگا تھا۔

وہ اس کے دل کا مہمان بنا۔ اکثر ہی آ جاتا تھا۔ اس کی کوئی چوری تو عمارہ نے نہیں پکڑی تھی جس کو دل میں محسوس کر کے پہروں یاد کرتی اور خوش ہوتی، آ تو وہ بچپن ہی سے رہا تھا کہ اس کی اکلوتی خالہ کا اکلوتا فرزند تھا...... فرزند بھی لاکھوں میں ایک...... خوبصورت، اسمارٹ اور تعلیم یافتہ...... اس کی ہم عمر ڈھیروں کزنز کی شادیاں ہو چکی تھیں یا طے ہو گئی تھیں ایک سے ایک دولہا نصیب ہوا تھا اور اس کے لیے ابھی تک اوسط درجے کے دو تین رشتے آئے تھے۔ جو رشتے نہیں اس کے خوابوں کے شیش محل پر بھاری پتھر تھے۔ اس کی ہنرمندی سے جلنے والی کزنز اب بڑی شان سے اس کے سامنے بیٹھ کر اپنے دولہاؤں کی تعریفیں کرتے نہ تھکتی تھیں۔ اسے ایسا محسوس ہوتا گویا اسے نیچا دکھایا جا رہا ہو۔ ایسے میں جب ذکی کا دھیان آتا تو ڈھارس سی بندھنے لگتی۔

عمارہ کی ماں کو بھی شاید ذکی کا دھیان تھا جب ہی وہ اکثر بہن سے گفتگو کرتے پائی جاتیں۔

"ہاں بھئی۔ یہی ایک ماں کی آرزو ہوتی ہے کہ اس کے بچے فخر سے اس کا سر بلند کریں، یہ تو تھا ہی شروع سے ذہین۔"

"اب اتنا بڑا افسر لگ گیا ہے تو اور مصیبت جسے دیکھو رشتہ لیے چلا آ رہا ہے۔ ارے صادقہ اُلٹا زمانہ آ رہا ہے۔ پہلے لڑکے والے لڑکی کے در کی مٹی لے لیتے تھے۔ جوتیاں گھس جاتی تھیں اور اب یہ حال کہ جہاں کوئی اچھا لڑکا دیکھا۔ شہد سمجھ کر مکھیوں کی طرح ٹوٹ پڑے۔ ارے ہر ایک سے کہہ چکی ہوں کہ ابھی تو روزگار سے لگا ہے۔ ذرا بچہ سانس تو لے لے۔ نہیں ہمیں کوئی جلدی......"

"اے، اور کیا۔ اور پھر خاندان میں کیا لڑکیاں نہیں ہیں جو باہر جائیں......"

انھوں نے چھالیہ کترتے ہوئے بہن کا چہرہ دیکھا۔

"خیر...... یہ تو میں نے ابھی سوچا نہیں...... خاندان اور غیر خاندان کے جھگڑے تو بعد کی باتیں ہیں۔ جب ابھی میں نے سوچا ہی نہیں......

ارے جب سہرے کے پھول کھلنے کا وقت آئے گا تو پتا بھی نہیں لگے گا...... اور صادقہ جو جوڑ اس کے نصیب میں ہوگا وہی ملے گا۔ میں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ کوئی حور پری یا امیر زادی بیٹے کے لیے ڈھونڈوں گی۔ بڑے بول کا سر نیچا......"

اور صادقہ بیگم جو بہن کی باتیں سن سن کر دہلی جا رہی تھیں ان کے آخری نیک خیالات سن کر قدرے پُرسکون سی ہو گئیں۔

اور عمارہ نے تمام تر گفتگو سے یہ نتیجہ نکالا کہ "دیر ضرور ہے اندھیر نہیں......" اس کے دل کو بھی ایک گونہ قرار سا آ گیا۔

............❁............

آخر کار وہ لمحہ بھی آ گیا جو اس کائنات میں بہت سے بلکہ اکثر انسانوں کا نصیب ہے...... کہ زندگی میں سُکھ اور خوشی محض ایک چلتی ہوا کے جھونکے کا نام ہے۔ دُکھ وہ بھاری طوق جو گلے میں لٹک کر رہ جاتا ہے۔ دُکھ سچ ہیں اور خوشی جھوٹ...... خوشی پکڑے سے پکڑ میں نہیں آتی اور دُکھ خود بخود جھولی میں آ گرتے ہیں۔ یہ زبردستی کے مہمان ہوتے ہیں...... انھیں دھکا نہیں دیا جا سکتا...... نباہنا پڑتا ہے۔

"ذکی کی منگنی ہو رہی ہے۔" اس نے کس طرح یہ خبر سنی وہ بیان نہیں کر سکتی تھی۔ اور اماں وہ تو مارے صدمے کے گنگ سی رہ گئیں۔

"ارے یہ آپا تو بڑی دھوکے باز نکلیں......" وہ بمشکل اتنا ہی کہہ سکیں۔

"انھوں نے تم سے کیا پیمان باندھا تھا......؟" اباجی نے بیوی سے پوچھا۔

"اے،لو......کیا پیمان ہی سب کچھ ہوتے ہیں۔اپنوں کے سر پر دھرے بوجھ اپنوں ہی کو نظر نہیں آتے......کیا قیامت ہے...... سگے رشتے اور یہ اندھیر۔"

انھوں نے دُکھ سے کہا۔

"کیوں جی کو روگ لگاتی ہو...... جو نصیب میں ہوتا ہے ہو کر رہتا ہے...... کیا تم نے نہیں سنا......؟ ایک بار حضرت انس رضی اللہ تعالی عنہ سے کوئی نقصان ہوگیا تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انس کو سرزنش کیوں نہیں کرتے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔"اسے کچھ مت کہو جو بات ہونی ہوتی ہے ہو کر رہتی ہے۔"

صدمہ تو شاید اباجی کو بھی ہوا ہوگا۔مگر ایسے میں اٹوٹ ایمان انسان کے کام آتا ہے۔انھوں نے یہ صدمہ شاید سہہ لیا تھا...... حالانکہ ذکی کو وہ شروع سے ہی اس حیثیت سے پسند کرتے رہتے تھے۔

مگر اماں تو مارے صدمے کے بستر ہی سے لگ گئیں۔عمارہ نے کئی مرتبہ ان کی بھیگی ہوئی آنکھیں دیکھیں۔اس پر تو خود دُہرے عذاب اترے تھے اور جب بے خبر بلکہ "بے خبرنما" ذکی،خالہ کی خیریت معلوم کرنے آیا تو عائشہ نے خود پر قابو پا کر مبارکباد دی۔

"اچھا......بھئی یہ کون سا طریقہ ہے مبارکباد کا......؟ گھر پر کیوں نہیں آئیں......؟ میں تمھیں ان کی تصویر دکھاؤں گا۔بس یار قسمت بہت اچھی ہے۔جو تمنا بھی پوری ہوئی یار عمارہ...... میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ انسان کی آرزو اس طرح بھی پوری ہو جاتی ہے۔میں تمھیں ایک بات بتاؤں مجھے گال پر سجا ہوا تل بہت پسند ہے۔ایک عورت کو کس قدر حسین بنا دیتا ہے۔میں بیان نہیں کرسکتا...... میرا جی چاہتا تھا جو میری بیوی ہو اس کے رخسار پر ایک خوبصورت تل بھی ہو۔بعض اوقات مجھے اپنی اس خواہش پر ہنسی بھی آتی تھی۔میں نے اپنی یہ خواہش کبھی ظاہر نہ کی۔اس ڈر سے کہیں کسی مصنوعی تل کے دھوکے میں نہ آجاؤں وہ حلق پھاڑ کر ہنس دیا۔

"میں نے آفریدی صاحب کی بیٹی کو دیکھا تو پہلے یہی سمجھا کہ اس نے فیشن میں مصنوعی تل ٹکا رکھا ہے۔پھر باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا کہ تل حقیقی ہے۔پھر تو میں نے رشتہ بھجوانے میں ذرا دیر نہیں لگائی......اور اللہ نے کرم کیا۔

چلو ناں،کبھی اپنی بھابی سے ملنے......"

"چلوں گی......اماں کی طبیعت ٹھیک ہو جائے......آپ بیٹھیں میں چائے بنا کر لاتی ہوں......" وہ آنسو پیتی ہوئی کچن میں آگئی...... کتنی دیر تک وہ پلو سے آنکھیں رگڑتی رہی تھی۔

............❁............

"منحوس نہ ہوتی تو کب کی اپنے گھر کی ہوگئی ہوتی۔ارے اللہ کا عذاب ہے میرے سر پر۔"

"یہ لو...... یہ بھی میرا قصور ہے۔" اس نے جھلا کر کتاب ایک طرف رکھ دی۔

باہر تو حضرت نوح کے وقتوں کا پھاٹک جھول رہا ہے اور مکینوں کی مالی حالت آشکارا کر رہا ہے۔آج کل رشتے پیسے سے طے ہوتے ہیں۔اماں...... بھائی میاں کی تنخواہ تو اپنے قبضے میں کرلیتی ہیں کہ وہی کچھ کرلیں پھر وہ دونوں بھائیوں کے اخراجات علیحدہ۔

اور اب ان کو نئی سوجھ گئی ہے۔شادی...... ہونہہ۔اب پڑھائی سے فارغ ہولوں، نوکری وغیرہ کروں گی تو کچھ ہوسکے گا۔اماں کی دن رات کی پھٹکاروں سے اس کے خیالات میں کافی پختگی آگئی تھی۔

جب وہ آنگن کا فرش دھونے کے خیال سے جھاڑو اور پائپ اسٹور سے نکال کر لائی تو ناتواں پھاٹک بڑی اذیت سے کراہ اٹھا۔

وہ اسی طرح پھاٹک تک چلی آئی...... سامنے دو پیاری سی لڑکیاں کھڑی تھیں۔

انھوں نے اباجی کا نام لے کر تصدیق چاہی کہ یہ انہی کا گھر ہے۔اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور انھیں لے کر اماں کے پاس چلی آئی......ایک نسبتاً کم عمر لڑکی نے تعارف کرایا کہ میرا نام حنا ہے یہ میری بھابی ساجدہ ہیں۔

اماں نے اشارے سے اسے باہر جانے کو کہا...... وہ کچھ نہ سمجھتی ہوئی باہر چلی آئی......مگر بدستور سوچ رہی تھی کہ یہ لوگ کون ہیں......؟

اور معمہ حل ہوگیا...... بلکہ بہت جلد ہی حل ہوگیا......اسے تو یقین ہی نہیں آیا۔

آج نحوست کے بادل چھٹے تھے۔

وہ رخصت ہو رہی تھی۔اس کی ساس کہہ رہی تھیں......

صادقہ بہن اطمینان رکھیے...... یہ میری بیٹی ہے۔آپ ہمیں غیر خاندان سمجھیں گی تو

ہم غیر نظر آئیں گے اپنا سمجھیں گی تو اپنے......"

اماں نے شاید پہلی مرتبہ بیٹی کو سینے سے لگایا اور وہ ماں کے سینے کی گرمی پا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

............❁............

ولیمے کی صبح وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے گیلے بال لیے بیٹھی تھی اور ہارون تازہ اخبار لیے بیٹھے تھے۔

"عمارہ!"

"جی......!" اس نے نظریں آہستگی سے اٹھائیں۔

"شناختی کارڈ تو تمھیں مل گیا ہوگا۔ میں نے لیٹر بکس میں ڈال دیا تھا۔ ایڈریس اتار کر......" انھوں نے اس کی سمت شوخی سے دیکھا۔

"جی مل گیا تھا......" اس نے گیلے بالوں میں کنگھا پھنسا کر جواب دیا۔

"اسی شناختی کارڈ کے سبب یہ نحوست کے بادل چھٹے ہیں شاید......" اس نے دکھ سے سوچا۔

"عمارہ...... یقین کرو جب میں نے یہ پڑھا شناختی علامت۔ بائیں رخسار پر تل ہے۔ بس میں نے حنا اور بھابی کو فوراً بھیجا کہ اتا پتا کریں۔ رخسار پر تل کا عورت کو کتنا سجا دیتا ہے۔ تم نہیں جان سکتیں۔"

